سلسلۂ نصابات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند

کتاب دوم

برائے انٹرمیڈیٹ

مؤلفہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی
رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ
جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۳۹ھ م سنہ ۱۳۳۰ف م سنہ ۱۹۲۱ء

مطبوعہ دارالطبع سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین کتاب دوم تاریخ ہند

-۱۵۶
-۱۶۱

* متن کتاب میں قوت کی بجائے "قیمت" کا لفظ کتابت کی غلطی ہے -

تمت الکتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتابِ دوم تاریخ ہند

بابِ اوّل

مسلمانوں کا تسلّط سندھ پر

ا۔ حکومت عرب کے اثرات

ونسنٹ اسمتھ نے اپنی قدیم تاریخ ہند میں چینی درویش ہیونتسین چونگ کی سیاحتِ سندھ کا خلاصہ بیان کرنیکے بعد لکھا ہے کہ "معلومات کے دوسرے ذرائع سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ اُن دنوں سندھ کی سلطنت جس کے مقبوضات میں بلوچستان بھی داخل تھا، خوش حال و قوی ور موجودہ زمانے کی نسبت کہیں زیادہ آباد و سرسبز تھی"[1]

[1] ارلی ہسٹری ۔ مطبوعہ ۱۹۱۴؁ ۔ صفحہ ۳۵۵

چونکہ مصنّف نے ان "دوسرے ذرائعِ معلومات" کی کوئی وضاحت نہیں کی اس لئے سوائے اس کے اور کوئی قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ان ذرائع معلومات سے اُس کی مراد سندھ کے متعلق وہ عربی یا بعد کی فارسی کتابیں ہیں جو مسلمان جغرافیہ نویسوں یا مؤرخوں نے لکھیں اور جن میں سے بعض کے ترجمے یورپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہی کتابیں فتوحات عرب کے قریبی زمانے میں تاریخ سندھ کا ماخذ ہوسکتی ہیں مگر ان کا مطالعہ کرنے والے کو ونسنٹ اسمتھ کا مذکورۂ بالا قول خلافِ صحت نظر آئے گا۔ ممالک سندھ یا "ثغر الہند" کے متعلق سب سے پہلی مستند اطلاع وہ ہے جو حکیم بن جبلہ نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضہ کو دی تھی اور حکیم بن جبلہ کو خاص طور پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ "ثغر الہند" کے حالات دریافت کریں۔ ثغر الہند یا سرحد ہند سے اس زمانے میں سندھ ہی مراد ہوگا کیونکہ مکران خلیفۂ ثانی کے زمانے میں فتح ہوچکا تھا۔ غرض حکیم نے یہاں آکر دیکھ بھال کی اور والیٔ عراق نے انہی کو دربار خلافت میں بھیج دیا کہ جو کچھ دیکھا ہے وہ جا کے زبانی عرض کردیں۔ چنانچہ سندھ کے متعلق ان کا یہ قول محفوظ ہے کہ "ماءُھا وشَل وثمرُھا دَقَل ولصُّھا بطل۔ اِن قلّ الجیش فیھا ضاعوا و اِن کثروا جاعوا" یعنی وہاں گہرا پانی نہیں ملتا۔ وہاں کے پھل بدمزہ ہیں چور نہایت دلیر ہیں۔

اگر فوج کم ہو تو وہاں ضائع ہو جائے اگر زیادہ ہو تو بھوکی رہ جائے ؏ حضرت عثمان رضؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم حال بیان کرتے ہو یا قافیہ بندی ؟ انھوں نے کہا نہیں اصلی حال عرض کرتا ہوں ۔ پس ہند پر فوج کشی کرنے کا خیال چھوڑ دیا گیا؏

اس روایت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مملکت سندھ کے کم سے کم مغربی اضلاع کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور گو سنہ کا ہمیں پتہ نہیں چلا مگر قرائن سے ظاہر ہے کہ حکیم بن جبلہ خلافت عثمانی کے اوائل یعنی ۲۴ھ یا ۲۵ھ میں ادھر بھیجے گئے تھے ؏

چچ نامہ اور اسکی شہادت

اس کے بعد مسلمانوں کی فتح سے پہلے کے حالات کی کچھ جھلک ہمیں مل سکتی ہے تو چچ نامہ سے جو فتح سندھ کے قریبی زمانے کی سب سے پہلی عربی تاریخ کا فارسی ترجمہ ہے۔گو فارسی مترجم نے اپنی طرف سے بعض روائتیں بڑھا دی اور بعض حصے چھوڑ دئے ہیں لیکن مجموعی طور پر اصلی (عرب) مؤرخ کی تحریر میں زیادہ تحریف نہیں ہوئی ہے اور اُس کے ثقہ اور معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا ۔ یہی سبب تھا کہ اسکی اولاد نے یہ مسودہ اپنے جد امجد کی عزیز یادگار سمجھ کر کئی سو برس تک

ع۱ فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ صفحہ ۴۳۲ ۔ طبری نے یہ واقعہ حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد سے منسوب کیا ہے ؏ ۱۲ صفحہ ۳۱۵

محفوظ رکھا ۔ یہاں تک کہ **علی بن** حامد بن ابی بکر نامی فارسی ادیب جو اپنا وطن عراق چھوڑ کر شمالی سندھ میں آ بسا تھا، قدیم تاریخ کی تلاش میں **بھکر** آیا اور وہاں کے قاضی مولانا **اسمٰعیل بن علی** سے یہ مسودہ اسے ملا۔ ترجمے کا زمانہ جیسا کہ مترجم خود بیان کرتا ہے سنہ ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء ہے اور یہی فارسی ترجمہ ہے جو "تاریخ ہند و سندھ" "منہاج المسالک" اور سب سے زیادہ "چچ نامہ" کے نام سے مشہور ہوا ۔

یہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ جس وقت علافی قبیلے کے عربوں نے سنہ ۸۵ھ میں **سعید بن اسلم** کلابی والئ مکران کو اور پھر اس کے جانشین مجاعہ کو قتل کیا[1] اور حکومت کے خوف سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کی پناہ لی تو **حجاج بن یوسف** نے **محمد ابن ہارون** کو مکران کا والی مقرر کیا کیونکہ مکران اور ممالک ایران اُن دنوں عراقِ عرب کے اسی خونخوار حاکم یا گورنر جنرل کے ماتحت تھے ۔ نئے والی کو تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ جس طرح بن پڑے باغی علافیوں کو گرفتار کر کے سعید بن اسلم کا انتقام لے ۔ چنانچہ محمد نے ایک علافی کو گرفتار کر کے قتل کیا اور حجاج کو لکھا کہ اگر زندگی باقی ہے تو

[1] ایلیٹ ۔ جلد اوّل صفحہ ۴۳۰ بحوالہ چچ نامہ ۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۹ ... مگر ... ملتا ۔ ... میں لکھا ہے کہ مجاعہ اپنی موت سے مرا ۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۳۰ ۔

ایک ایک کر کے ان سب مفرور باغیوں کو گرفتار کرونگا
چنانچہ وہ ان کے تعاقب میں پانچ سال تک "ندیوں اور
جنگلوں کی تسخیر" کرتا پھرا[1]۔

آخری فقرے سے ظاہر ہے کہ مملکت سندھ کے ان مغربی
اضلاع کی کیا حالت تھی۔ اور یہ گویا اُس اطلاع کی تصدیق
ہے جو ساٹھ برس پہلے حکیم بن جبلہ نے دربار خلافت
میں عرض کی تھی۔ پھر اسی زمانے میں یہ مشہور واقعہ
پیش آیا کہ لنکا سے عراق آنے والے مسلمانوں کی چند
کشتیاں سندھ کے قریب بحری قزاقوں نے لوٹ لیں یہ
قزاق دیبل و حوالی دیبل کے رہنے والے تھے۔ اور
اس شہر کے متعلق سر ہنری الیٹ بڑی تحقیقات کے
بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ موجودہ کراچی کے
متصل اس پہاڑی پر آباد تھا جہاں آج کل قلعہ منورا
واقع ہے[2]۔ اکثر جدید اہل تحقیق ان سے متفق ہیں اگرچہ
بعض کا خیال ہے کہ وہ موجودہ ٹھٹھہ یا اس کے جنوب
میں اس جگہ پر تھا جہاں اب موضع کاکر بکیرا آباد ہے۔
بہر صورت وہ ملک سندھ کے ساحل پر واقع تھا اور
اس قزاقی کا یہاں ذکر کرنے سے یہ یاد دلانا منظور ہے
کہ جب حجاج نے سندھ کے راجہ سے مطالبہ کیا کہ ان

---

[1] الیٹ۔ ص ۴۲۹

[2] " " ۳۷۵ نیز ملاحظہ ہو امپیریل گزیٹیر جلد ۲۲ صفحہ ۳۱۵

قزاقوں کو سزا اور ہمیں نقصان کا تاوان دلایا جائے تو راجہ
نے معذرت کی کہ میرا اُن پر کچھ زور نہیں چلتا اور اُنکے
افعال کا میں ذمّہ دار نہیں ہے تمام قرائن تائید کرتے ہیں کہ
راجہ کا یہ عُذر غلط نہ تھا اور سندھ کے سواحل بلکہ سارے
جنوبی علاقے میں ہر چھوٹے بڑے شہر کی ریاست الگ
اور قریب قریب آزاد تھی۔ اِن واقعات سے نہ صرف
حکومت سندھ کی کمزوری ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ نتیجہ بھی
نکلتا ہے کہ ممالک سندھ کی بحری تجارت کے قدرتی
راستے بند تھے۔ کم سے کم مسلمانوں کی فتح کے قریب
یہاں کی قدرتی بندرگاہیں قزّاقوں کے مامن بن گئی تھیں
اور تجارت ایک طرف، بحری آمد و رفت بھی مخدوش
ہوگئی تھی ہے آگے ہم پڑھیں گے کہ دیبل کی تسخیر کے بعد
دُور تک محمدؐ بن قاسم کو کوئی بڑا قلعہ یا شہر نہیں ملا۔ جسکے
معنی یہ ہیں کہ جنوب کی وہ قابلِ زراعت زمینیں بھی،
جنھیں دریائے سندھ سیراب کرتا ہے، بہت کم آباد تھیں۔
یہی وجہ تھی کہ جب حجّاج نے اِن قزّاقوں کی سرکوبی او۔
داہر کو جس نے خلافت کے مفرور باغیوں کو
پناہ دی تھی، سزا دینے کے لئے خلیفہ **ولید**
(۸۶ھ تا ۹۶ھ)، سے فوج کشی کی اجازت مانگی تو
وہاں سے جواب آیا کہ " ملکِ دُور دست، کم حاصل،
خرچ طلب، چند لشکرہا برود و تلف شود۔ باید ازاں شو

تغافل ورزیدہ تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ملک سندھ کی یہ حالت تھی اور لشکر کے ضایع ہونے کا بھی اندیشہ زیادہ تر اسی لئے تھا کہ ان صحرائی اور ویران علاقوں میں شاید رسد میسر نہ آئے!

لیکن اب ہمیں فتوحات اسلامی کے بعد کی حالت پر نظر ڈالنی چاہیئے اور مختلف زمانوں کے متعلق جو شہادتیں ملتی ہیں اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے تاکہ سندھ کے تدریجی تغیر کا صحیح اندازہ ہو جائے! اس ضمن میں پہلے یہ توضیح ضروری ہے کہ گو محمد بن قاسم نے ۹۴ھ ۷۱۲ء میں ریاست سندھ کو فتح کرلیا تھا اور بڑے بڑے شہروں پر مسلمان قابض ہو گئے تھے، بایں ہمہ اِن فتوحات کی تکمیل اور اسلامی قوت کے استحکام میں بہت عرصہ لگا۔ اوّل تو بڑے بڑے زمیندار جو بجائے خود موروثی راجہ اور سندھ کی صدر حکومت کے برائے نام ماتحت تھے، مسلمان فاتحین سے مدتوں لڑتے جھگڑتے رہے اور آخر تک جب موقع ملا خود مختار ہو گئے۔ دوسرے کچھ فاصلۂ دراز اور کچھ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے اور حکومت اُمویہ کے زوال کی وجہ سے عرب خلفا کو

۱؎ تحفۃ الکرام۔ جلد سوم صفحہ ۱۲ الیٹ نے بھی قریب قریب یہی الفاظ چچ نامہ اور ابو الفداء کے حوالے سے نقل کئے ہیں۔ ۲؎ جلد اوّل صفحہ ۱۴۳۔ ۳؎ خود مؤلف تحفۃ الکرام کا خاص ماخذ بھی، جیساکہ وہ بیان کرتا ہے (جلد سوم ص ۵) چچ نامہ ہے؛

اس طرف توجہ کرنے کا پورا موقع نہ ملا اور بعض [۱]
معلوم ہوتا ہے کہ ہشام بن عمر تغلبی کے
سندھ مقرر ہونے (یعنی دوسری صدی ہجری کے
سے پہلے مسلمان ان اقطاع پر جم کر حکومت نہ کر
کم سے کم ان کی حکومت اور شائستگی کا اب تک
نمایاں نہ تھا اور ابن خردادبہ کی کتاب "المسالک
والممالک" سے بھی اس قول کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے۔

یہ شخص جس کا پورا نام "ابوالقاسم عبیداللہ ابن عبداللہ
ابن خردادبہ" ہے پارسی نومسلم تھا خلفائے عباسیہ کے
عہد میں ترقی کرکے وزارت کے درجے تک پہنچا اور
پہلا جغرافیہ نویس ہے جس نے سندھ میں مسلمانوں کی حکومت
قائم ہونے کے بعد ممالک اسلامیہ کے حالات جمع کئے
اور اسی سلسلے میں سندھ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہاں
سے "عود ہندی" بید اور بانس (بطور وساور) آتے ہیں[۲]
اس مختصر اطلاع سے بھی اس بات کا سراغ ملتا ہے
کہ اب (تیسری صدی ہجری میں) ممالک اسلامیہ سے
سندھ کی تجارت شروع ہوگئی تھی۔ آگے چل کر ابن خردادبہ نے

ابن خردادبہ کا جغرافیہ۔

۱۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ صفحہ ۳۶۲۔ مقدسی کی اس روایت کی اور کسی تاریخ سے تائید نہیں ہوتی۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ ابن خردادبہ نہایت معزز عہدوں پر مامور ہوتا رہا ہو

۲۔ کتاب المسالک والممالک ص ۶۲۔

یہودی اور روسی سوداگروں کے راستوں میں سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چین و روس اور یورپ و افریقہ کے قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور برّی اور بحری دونوں قسم کی تجارت کا بازار گرم ہو چلا تھا۔[1]

لیکن ابن خردادبہ نے اوّل تو اپنے مختصر جغرافیہ میں زیادہ تر مختلف شاہ راہوں اور شہروں کی مسافت کا حال لکھا ہے دوسرے اتنے مجمل حالات سے جن میں مسلمانوں کے نئے شہروں کا بھی ذکر نہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ اسوقت تک سندھ کو یا وہاں کے نئے شہروں کو وہ وقعت حاصل نہ ہوی تھی جس کا بعد کے جغرافیوں سے ثبوت ملتا ہے۔ ان میں بھی جو جغرافیہ سب سے بعد کا ہے اُسی میں سب سے زیادہ اور کارآمد معلومات موجود ہے۔ مگر ہم تقدّم زمانی کے لحاظ سے اوّل ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد الاصطخری کے جغرافئے سے شروع کریں گے جو چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کو نکلا تھا اور ابن خردادبہ سے قریب قریب ایک صدی بعد کے حالات بیان کرتا ہے۔ بلاد سندھ کے ذکر میں وہ لکھتا ہے کہ وہ شہر منصورہ جسے سندھی میں برہمن آباد کہتے ہیں، ایک میل[2] کے قریب لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے

---

[1] کتاب المسالک و الممالک ص ۵۳، ۱۵۴

[2] اس جگہ عربی میل و فرسنگ کا حساب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ میل آجکل کے

اور مہران (دریائے سندھ) کی ایک کھاڑی میں ٹاپو پر
آباد ہے۔ یہاں کے رہنے والے مسلمان ہیں اہل عراق
کی مثل لباس پہنتے ہیں۔ ان کی اور اہل مضافات کی زبان
عربی اور سندھی ہے اور یہی حال شہر **ملتان** اور نواح
ملتان کا ہے کہ وہاں کے لوگ عراق عرب کے باشندوں
کا سا لباس یعنی کرتے اور شلواریں یا تہمد استعمال کرتے ہیں۔
ملتان رقبے کے اعتبار سے منصورہ سے نصف اور
شہرال رورد (الور) کے برابر ہے"۔

دیبل کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شہر مہران کے مغرب
میں ساحل بحر پر واقع اور بہت بڑا تجارتی شہر ہے
اور اس کے مضافات میں غلّہ کی کاشت ہوتی ہے[۱]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۔ انگریزی میل سے کوئی چارسو گز زیادہ ہوتا تھا۔
اور ایسے تین میل کا ایک فرسخ ہوتا تھا جو اس زمانہ کے حساب سے
کوئی پونے چار میل کے برابر ہوا۔ (عربی درع اور میل و فرسخ کے لئے دیکھو
تقویم البلدان عن ابی الفدا۔ فصل تحقیق الامرالمساحتہ)، فرسخ کا لفظ آج کل
بھی ایران میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ انگریزی حساب سے ۳½ میل کے
قریب لمبا ہوتا ہے (انسائی کلوپرٹ۔ جلد ۲۸ ص ۲۹۳)۔

۱؎ مسالک والممالک۔ لابی الاسحٰق الاصطخری۔ از صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۸۔ ان صفحات
کا راقم الحروف نے اپنے طور پر خلاصہ اوپر نقل کیا ہے۔ ایلیٹ کے
انگریزی ترجمے میں کئی نقص اور غلطیاں ہیں خاص کر ملتان و منصورہ کے متعلق
اسکا یہ لکھنا کہ وہاں فارسی اور سندھی زبان رائج ہے (جلد اوّل ص ۲۹، اصل عبارت کے

تقریب تقریب یہی حالات، جو اصطخری نے لکھے ہیں، ابو القاسم ابن حوقل کے جغرافیے میں مذکور ہیں اور ان دونوں جغرافیوں کے پڑھنے سے ثابت ہے کہ دو صدی کی عربی حکومت نے سندھ کی حالت بدل دی تھی۔ اسلام اور اسلامی تمدن کا رنگ اس پر چھا گیا تھا۔ بہت سے بارونق شہر و قصبات آباد تھے جہاں کے رہنے والے مرفہ الحال زمیندار یا دولت مند سوداگر تھے۔ اور گو سیاسی طور پر یہی (چوتھی صدی ہجری) وہ زمانہ ہے جس میں خلافت بغداد کو زوال آرہا تھا۔ یمنی اور نزاری قبائل کی خونریز خانہ جنگی اور فرقۂ اسمٰعیلیہ وغیرہ کی شورشیں عربوں کی حکومت کو پارہ پارہ کئے دیتی تھیں۔ سندھ بھی اب دو ریاستوں میں منقسم ہو گیا تھا جہاں کے عربی النسل حاکم برائے نام خلیفۂ بغداد کے ماتحت تھے۔ بایں ہمہ تمدنیت کا قدم برابر آگے بڑھ رہا تھا اور جیسا کہ ایک بعد کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے سندھ میں نہ صرف زراعت و تجارت بلکہ اس کے ساتھ ساتھ صنعت و فنون اور علم و فضل کی بھی گرم بازاری تھی[1]۔

جغرافیہ لیکن اب ہمیں اپنے سب سے آخری ماخذ یعنی ابو عبداللہ محمد ادریسی کی کتاب پر نظر ڈالنی چاہئے جس نے چھٹی صدی ہجری میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰ بالکل خلاف ہے۔ مکران کے بعض شہروں میں البتہ اصطخری نے لکھا ہے کہ فارسی اور مکرانی زبان بولی جاتی تھی (ص ۱۷۷) ۱۲

[1] احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم (مولفہ علامہ شمس الدین المقدسی البشاری) صفحہ ۴۷۷ و ۴۸۴

سب سے زیادہ تحقیق و تفصیل کے ساتھ سندھ کے حالات لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کی پوری کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی اور قلمی نسخہ ہندوستان میں غالباً نایاب ہے لاطینی اور فرانسیسی میں جو ترجمے شائع ہوئے ہیں وہ بھی صحیح اور قابلِ اطمینان نہیں سمجھے جاتے۔ مگر سر ہنری الیٹ نے ان ترجموں کا اصل عربی سے مقابلہ کیا تھا اور انہی کا انگریزی ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے[1] بلادِ سندھ کے ذکر میں ادریسی نے پہلے دیبل کے متعلق بیان کیا ہے کہ "گو اس کی زمین اچھی اور قابل زراعت نہیں مگر یہ شہر خوب آباد اور سندھ کی بحری تجارت کا مرکزی مقام ہے۔ یہاں قسم قسم کی اشیا کی تجارت ہوتی ہے۔ اور بیوپار میں یہاں کے لوگ نہایت ہوشیار ہیں۔ ایک طرف چین و ہندوستان اور دوسری طرف عمان کی اجناس کے لدے ہوئے جہاز دیبل پہنچتے ہیں۔ یہاں کے لوگ جو تمام طور پر مالدار ہیں اُن کو مقدارِ کثیر میں خرید کر بھر لیتے ہیں اور نرخ کے گراں ہونے پر اندرونِ ملک میں لے جاکر فروخت کرتے ہیں۔

دیبل سے تین دن کے راستے پر نیرون معمولی شہر ہے۔ مگر یہاں جنگی قلعہ موجود ہے اور باشندے مالدار ہیں۔

نیرون سے تین دن یا کچھ زیادہ کے راستے پر شہر **منصورہ** واقع ہے۔ عباسی خلیفہ **المنصور** کے عہد میں

---

[1] الیٹ۔ جلد اول صفحہ ۷۷ تا ۹۲

چار نئے شہر اس نام سے موسوم کئے گئے تھے۔ انہی میں سندھ کا یہ منصورہ بہت وسیع، مرفّہ الحال تجارتی اور بارونق شہر ہے[۱]۔ اس کی نواح سرسبز و شاداب ہے۔ کھپریل، اینٹ اور استرکاری کی عمارتیں بنی ہوی ہیں۔ یہ مقام سیر و تفریح کے لائق ہے تجارت کو یہاں ترقی ہے۔ بازار آدمیوں سے اور گودام اسباب تجارت سے بھرے رہتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے لوگ ایرانی لباس اور ڈوسا ململ کے کرتے پہنتے اور بڑے بڑے بال رکھتے ہیں۔ چاندی اور تانبے کا سکہ رائج ہے........ مچھلی بہ افراط اور گوشت ارزان ملتا ہے[۲]۔ دیسی اور غیر ولایت کے پھلوں کی کمی نہیں۔

دیبل سے دو دن اور منصورہ سے تین دن کے راستے پر ایک اور شہر **بانیہ** ہے جہاں مخلوط نسل کے باشندے آباد ہیں۔ بسر اوقات کے لئے یہاں بہت آسائشیں اور اجناس ارزاں ہیں.....

منصورہ سے ایک دن میں **کالری** پہنچ جاتے ہیں

---

[۱] یہ ادریسی کی غلطی ہے۔ اس شہر کی بنیاد کچھ عرصے پہلے پڑی تھی (دیکھو اس باب کی آخری فصل)

[۲] یہ لطیفہ لکھنے کے قابل ہے، کہ آج کل سندھ کے ان علاقوں میں گوشت کا قحط رہتا ہے۔ یوں بھی لوگ مفلس ہیں اور بہت ادنیٰ درجے کی خوراک پر ان کا گزارا ہے۔ (ملاحظہ ہو گزیٹیر جلد ۲۳ ص ۴۰۹)

مگر منزل ذرا کڑی یعنی چالیس میل (عربی) کی مسافت ہے۔
یہ مہران (یعنی دریائے سندھ) کے مغربی کنارے پر ایک
خوبصورت قلعہ بند شہر ہے جہاں تجارت کی بڑی گرم بازاری
ہے اور اسی وجہ سے شارع عام سے دور ہونے کے
باوجود یہاں لوگوں کی خوب آمدورفت رہتی ہے۔
انوڑ[1] یہ دلکش مقام دریا کے دونوں طرف آباد ہے۔
اور رقبے میں ملتان کا مقابلہ کرتا ہے۔
شروسان کا کڑی سے تین دن کے راستے پر واقع
ہے۔ یہ شہر نہ صرف وسعت کے اعتبار سے قابل ذکر ہے
بلکہ اس کی وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ بہت سی نہریں
اور فوارے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہاں نہایت عمدہ
پیداوار اور بہت نفع رساں تجارت ہوتی ہے۔ چنانچہ
یہاں بہت آمد رفت رہتی ہے۔ اسی طرح **منجابری**
نہایت خوش سواد شہر ہے جس کے گرد بہت سے باغ
لگے ہوئے ہیں اور ان میں نہریں جاری ہیں۔
ملتان وسیع شہر ہے اور یہاں ہر قسم کی اجناس
بکثرت ملتی ہیں۔ سرکاری محصولات بہت کم ہیں اسلئے
باشندے عام طور پر خوش حال ہیں۔ مضافات شہر میں
ایک ندی سے آب پاشی کی جاتی ہے[2] جو مہران میں جاملی ہے۔

[1] انوڑ کو ادریسی یا اس کے کاتب نے "دور" لکھا ہے۔

[2] اس جگہ یہ لکھنا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ نہریں بنانے کے علاوہ غالباً

ملتان میں جنگی قلعہ بنا ہوا ہے مگر اس سے ایک میل کے فاصلے پر جندور میں نہایت مستحکم قلعوں کا سلسلہ موجود ہے اور ان سب میں آب رسانی کے ذرائع مہیا ہیں۔ ملتان کا حاکم تعطیل کا زمانہ اور بہار کا موسم یہیں گزارتا ہے۔

سندور ملتان سے تین دن کے راستے پر واقع ہے۔ اور اپنی تجارت و دولت اور باشندوں کے تزک و احتشام کی وجہ سے مشہور ہے ...۱۷

اسی طرح ادریسی نے اور بیس پچیس مشہور تجارتی شہروں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض گجرات کے ساحل پر آباد تھے۔ اور بعض مکران کے علاقے میں مسلمانوں کی عملداری میں داخل تھے۔ ان سب شہروں کے محل وقوع اور بعد کی تاریخ کا پتہ چلانا دشوار ہے اور ادریسی کے پورے بیان کو نقل کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں مگر اس جغرافئے کو پڑھکر، جو تاریخوں سے زیادہ کار آمد و معتبر ہے، اسلامی سندھ کا نہایت دلکش مرقع تصوّر کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس بات کے یقین کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے ان ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ سندھ کے شہروں کا مختصر ذکر[بحالہ] ہم نے اوپر پڑھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۔ سب سے پہلے مسلمانوں نے پون چکی سے پانی کھینچنے اور آبپاشی کرنیکا طریقہ نکالا تھا۔ (ملاحظہ ہو الیٹ جلد اول صفحہ ۴۶۷ فٹ نوٹ بحوالہ برائس وغیرہ)

۱۷۔ بلاد سندھ کا حال ہم نے الیٹ کے انگریزی ترجمے سے اپنے الفاظ میں ملخصاً پیش کیا ہے (الیٹ جلد اول ص ۷۷ تا ۸۲)

مکران کے ویران صحرائی اضلاع میں بھی انہوں نے **کیروسی،** **فیربوز، ارمابیل، راسک** اور **دارک** جیسے بیسیوں شہر آباد کروئے تھے، جہاں تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔ ہرقسم کا سامانِ تمدن افراط سے ملتا تھا مناسب مقامات میں اجناس کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ لوگ دولتمند، خوش حال دنیا کے معاملات سے باخبر، خلیق و مہماں نواز تھے اور انہوں نے خاص ممالک اسلامی کا تمدن اور جماعت کثیر نے وہی مذہب اختیار کرلیا تھا۔

۲۔ عربوں کا نظام حکومت اور ملکی آئین۔

عرب والی — سندھ خلافتِ دمشق کا اور بعد میں خلافت بغداد کا ایک صوبہ تھا اور اس کو چار یا پانچ بڑے بڑے ضلعوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ مگر وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ تقسیم اکثر بدلتی رہتی تھی۔ اور گو مکران کو مستقل طور پر ایک علیحدہ صوبہ بنادیا گیا تھا لیکن کبھی کبھی اسے بھی حاکم سندھ کے تحت میں دے دیا جاتا تھا۔ عربی میں صوبے کو ولایت اور وہاں کے حاکم کو **والی** کہتے ہیں مگر اس کی حیثیتیں کسی قدر مختلف ہوتی تھیں چنانچہ والئی سندھ کا بالادست عہدہ دار بھی والی کہلاتا تھا اور سندھ جیسے کئی صوبے اس کے ماتحت تھے۔ بایں ہمہ والی کی نامزدگی خاص خلیفہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ اسی کے دربار سے وہ سات پارچے کا خلعت، دو تلواریں، دو گھوڑے، پرچم، طوق اور تاج ولایت

لے کے روانہ ہوتا تھا۔[1]

سرکاری محاصل بھی غالباً براہ راست دارالخلافت کو بھیجے جاتے تھے اور اسی طرح اہم معاملات میں خلیفۂ وقت کی منظوری لینی ضروری ہوتی تھی۔ اسلامی حکومت کے اصول، فتح سندھ سے بہت پہلے منضبط ہو چکے تھے اور ہر جگہ اُنکی پابندی کیجاتی تھی۔ البتہ اندرونی معاملات اور جزئیات میں ہر والی قریب قریب خود مختار اور صوبے کے امن و انتظام کا ذمہ دار تھا۔ بلکہ سندھ جیسے دُور دست سرحدی صوبوں میں بعض اوقات صلح و جنگ کے اختیارات بھی اُن کے تفویض ہوجاتے تھے۔ فصلوں کی حالت کے لحاظ سے زمین کی مالگزاری میں کمی بیشی کرنا، آب پاشی کے وسائل میں ترقی دینا، راستے بنانا اور ان کی حفاظت کے لئے پولس مقرر کرنا، مناسب مقامات پر عدالتوں کا قیام اور چھاونیوں یا نئے شہروں کی تعمیر وغیرہ اس قبیل کے تمام انتظامات انھی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دئے جاتے تھے۔

فوجی نو آ[...]

اندرونی امن اور بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنا والی کا سب سے مقدم فرض تھا اور اس غرض کے لئے مناسب مقامات پر بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں بنادی جاتی تھیں۔ بعید علاقوں میں عرب فاتحین کا مسکن یہی چھاؤنیاں تھیں اور یہی رفتہ رفتہ شہروں کی صورت اختیار کرلیتی تھیں۔ سندھ میں عرب

[1] صناجتہ الطرب صفحہ ۱۷۴

سپاہی اوّل اوّل اپنی عورتوں کو لیکر نہیں آئے تھے۔ انہوں نے یہیں شادی بیاہ کیا اور اس لئے یہاں انکی فوجی چھاؤنیاں بہت جلد مستقل نوآبادیاں اور ان کی اولاد کا وطن بن گئیں۔ منصورہ، قصدار، قندابیل، بیضا، محفوظہ اور ملتان کے قریب جندورد (یا جندار) اسی قسم کے لشکری مقام تھے جہاں تھوڑے عرصے میں وسیع شہر آباد ہو گئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان شہروں کی اصلی رونق اور آبادی سپاہیوں کی بدولت تھی اور اسی وجہ سے جب عربی حکومت کا شیرازہ بکھرا اور اسی کے ساتھ پُرانا فوجی نظام درہم برہم ہوا تو یہاں کے سپاہی پیشہ باشندے وجہِ معاش سے محروم ہو گئے اور انہیں یا تو نئے حکمرانوں کی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے ترک وطن کرنا پڑا، کیونکہ اِن حکّام کے جنگی مستقر بھی دوسرے تھے اور یا مجبوراً وہ قریب کے دیہاتوں میں منتشر ہو گئے کیونکہ سپاہ گری کے عادی کو زراعت کے سوا بالعموم اور کوئی پیشہ پسند نہیں آتا۔ اِن لوگوں کے وطن چھوڑ دینے سے اہل صنعت وحرفت اور آخر میں سوداگروں نے بھی اِن شہروں کو چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح جلد یہ چھاؤنیاں آباد ہوئی تھیں اسی طرح تھوڑے عرصے میں اُجڑ گئیں اور وہاں بڑی بڑی عمارات کے کھنڈر یا صرف چھوٹے چھوٹے گاؤں

باقی رہ گئے۔

مگر یہ زوالِ حکومت کے بعد کی باتیں ہیں، یہاں ہمیں سرسری طور پر عربوں کے فوجی نظام پر ایک نظر ڈال جانی چاہیئے کہ ان چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے مکانات کے علاوہ بعض سرکاری دفاتر، شفاخانہ، عدالت قضاء، رسد خانہ اور اصطبل بھی ضرور ہوتا تھا۔ چھاؤنیاں عمدہ آب و ہوا کے خوش منظر مقامات پر بنائی جاتی تھیں اور سپاہیوں کے مکانات میں بھی حفظانِ صحت کے اصول مدِنظر رکھے جاتے تھے۔ قریب ہی چراگاہوں کے واسطے وسیع میدان چھوڑ دئے جاتے اور گھوڑوں کی افزائشِ نسل اور پرورش کا خاص اہتمام تھا۔ کیونکہ گھوڑا عرب سپاہی کی ہمیشہ سے نہایت محبوب سواری ہے اور ان کی فوجوں میں زیادہ تر سوار ہی ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ پیادہ اور شتر سوار فوج کی معقول جمعیت رہتی تھی اور اُس زمانے کے آلات قلعہ شکن یعنی منجنیق و دبابہ کے استعمال کے واسطے بھی غالباً سپاہیوں کی ایک جماعت مخصوص کردی جاتی تھی۔ جنگ کے اسلحہ اور لباس میں عربوں نے بعض مفید ایجادیں کی تھیں لیکن لڑائی کا انحصار ابھی تک تیر و شمشیر پر تھا اور انہی اسلحہ سے کام لینے کی مہارت سپاہی کا کمال سمجھی جاتی تھی۔ اِس قسم کی فوجی مشق یا مصنوعی لڑائیاں جن سے آج کل فوجوں کو سدھاتے ہیں

اُس زمانے میں رائج نہ تھیں اور سچ یہ ہے کہ ایک جنگجو قوم کو، جسے آئے دن دشمنوں سے لڑنا پڑتا ہو، ان تیاریوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مگر عرب سپاہی اپنی چھاؤنیوں میں بیکار نہ رہتے تھے بلکہ گھڑ دوڑ، کشتی، بھاگ دوڑ، پیراکی یا اسی قسم کے سپاہیانہ کھیل اُن کا عام مشغلہ تھے۔

سپاہیوں کو بیش قرار تنخواہوں کے علاوہ مال غنیمت سے حصّہ ملتا تھا۔ اور غالباً وہ ہر قسم کے محاصل سے مستثنیٰ تھے۔ البتہ وہ عرب سردار جنہیں بڑی بڑی زمینیں معافی کے طریقے پر مل جاتی تھیں، صدقہ و زکوٰۃ کی مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔

سرکاری محاصل

ایسے تمام سرکاری محاصل درحقیقت مذہبی نوعیت رکھتے تھے اور مسلمانوں سے صدقہ و زکوٰۃ اور غیر مسلم ذمّیوں سے جزیہ کے سوا کوئی محصول نہ لیا جاتا تھا لیکن بعد میں مقامی ضروریات یا جابر حکام کی زبردستی سے بعض اور ایسے ابواب بڑھ گئے جن کی اسلامی قانون میں کوئی ہدایت نہیں۔ مگر اس جگہ خاص طور پر یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ خوش حال مسلمانوں کو ذمّیوں کی نسبت زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا کیونکہ مسلمان اپنی آمدنی کا کم سے کم ڈھائی فیصدی (یعنی چالیسواں حصّہ)، اور بعض اوقات ½ ۱۲ فیصدی (یعنی آٹھواں حصّہ) بیت المال میں

داخل کرتے تھے اور ذمی غیر مسلم کو سالانہ پانچ دینار جزیہ دینا پڑتا تھا جو ہمارے حساب سے تیس روپیہ کلدار سے بھی کم ہوا۔ اس میں بھی معذور و غیر مستطیع اشخاص بالکل مستثنیٰ تھے اور کم استطاعت والوں کو مذکورہ شرح سے کم تر دینا ہوتا تھا اور خواہ وہ کتنے ہی مالدار ہوں، زیادہ سے زیادہ پانچ دینار سالانہ ادا کرتے تھے حالانکہ دولتمند مسلمانوں کو مذکورۂ بالا حساب سے جو رقم زکوٰۃ کی دینی پڑتی تھی وہ جزیہ سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھی[1]

جزیہ ادا کرنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کا مسلمان ذمہ لیتے تھے اور تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اگر جزیہ وصول کرنے کے بعد کسی شہر سے مسلمانوں کو ہٹنا پڑا تو اُنہوں نے ذمیوں کا تمام وصول کیا ہوا روپیہ واپس کردیا[2] اسی طرح جو غیر مسلم اسلامی فوجوں میں بھرتی ہوجاتے تھے اُن کو جزیہ دینا نہیں پڑتا تھا۔

مالگزاری

مزارعین سے زمین کی حیثیت کے مطابق مالگزاری لیجاتی تھی

ع۱ ہم نے یہ شرح محاضل الیعقی کی تاریخ سے لی ہے۔ (جلد اول ص ۴۰۷) مولوی شبلی مرحوم کی تحقیقات یہ ہے کہ جزیہ کی سالانہ رقم زیادہ سے زیادہ بیس روپیہ ہوتی تھی۔ (رسائل شبلی ص ۱۰۵)

ع۲ رسائل شبلی۔ صفحہ ۱۰۲ بحوالۂ کتاب الخراج وغیرہ۔ فتوح البلدان (ص ۱۳۷) میں "خراج" کا لفظ لکھا ہے اور اس میں جزیہ کے علاوہ شاید دیگر محاصل بھی آگئے جنہیں مسلمانوں نے واپس کردیا۔

اور زمین کی پیمائش اور پیداوار و جنسِ کاشت کے لحاظ سے اُسکی حیثیت قائم کرنے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی - مورخ گبن کے الفاظ میں، اس قسم کی پیمائش اور مردم و مویشی شماری کے جو قاعدے عربوں نے بنائے وہ ہر عہد کے اہل الرائے کے لئے سبق آموز ہیں[1]۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان دنوں عام طور پر سرکار اپنا مقررہ حق جنس کی صورت میں وصول کرتی تھی - اور یہ حق بارانی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کل پیداوار کا ایک چوتھائی ہوتا تھا - فصل تیار ہونے کے بعد ہر گاؤں میں سرکاری عہدہ دار یا ٹھیکے والے پہنچ جاتے تھے - اور ہر کھیت کی پیداوار کو اپنے سامنے تلوا کر ایک چوتھائی یا کم و بیش خود لے لیتے اور باقی کاشتکار یا زمیندار کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ اگرچہ سرکار کو یہ اجناس پھر اپنے طور پر فروخت کرنی پڑتی ہوں گی لیکن ظاہر ہے کہ اس طریقے میں کسان کو سرکار کی زیادہ ستانی کا خوف نہیں رہتا اور جو کچھ پیداوار ہوتی ہے اُس کا ٹھیک حال معلوم ہوجاتا ہے[2]۔

باغات یا نہری زمینوں کی قیمتی پیداوار پر مالگزاری کی شرح

[1] رومی سلطنت کا زوال اور خاتمہ" باب ۵۱ فٹ نوٹ ۱۲۲۔

[2] جنس کی صورت میں مالگزاری کا یہ طریقہ سندھ میں انگریزوں کے قبضے تک جاری تھا اور ۱۸۶۳ء سے اس کی بجائے سرکار نے مالگزاری میں روپیہ لینے کا قانون جاری کیا۔ گزیٹیر جلد ۲۲ ص ۴۲۳

زیادہ تھی[1] مگر آبپاشی کا غالباً علیحدہ کوئی آبیانہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس طرح ولایت سندھ کی کُل مالگزاری تخمیناً ایک کروڑ پندرہ لاکھ درہم ہوتی تھی جس کے ہمارے حساب سے کوئی ۴۰ ½ لاکھ روپیہ (کلدار) ہوے۔ اس میں علاقۂ مکران شامل نہیں مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس زمانے میں ولایت سندھ کا رقبہ موجودہ سندھ سے تقریباً سہ گنا زیادہ تھا اور اس میں موجودہ ملتان اور جنوبی پنجاب تک کے اضلاع داخل تھے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اِن دنوں بہت سی زمین مذہبی اوقاف یا "معافیات" میں شمار ہوتی تھی اور اِن کے مُزارعین سے کوئی محصول نہ لیا جاتا تھا۔ اِس قسم کی معافیوں کا مجمل حال آگے ہماری نظر سے گزرے گا۔

عدالت لیکن رعایا کے سرکاری یا باہمی معاملات کے متعلق قوانین کیسے ہی اچھے کیوں نہ بنائے جائیں جب تک ان کی تعمیل کا اطمینان نہ ہو، بیکار ہوں گے۔ اور جب کوئی غیر قوم فاتح کی حیثیت سے کسی ملک پر قابض ہو جاتی ہے تو غریب رعایا کے ساتھ اکثر ناانصافیاں کی جاتی ہیں اور اسے طوعاً و کرہاً ہر "خلافِ قانون" سختی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت میں ایسی زیادتیاں روا نہ رکھی جاتی تھیں۔ وہ جنگ کے وقت جس قدر خونخوار و خوفناک تھے، حالتِ صلح اور خاص کر فتح کے بعد اُسی قدر

[1] الیٹ ص ۴۷۴

نرم و حلیم تھے ۔ اُن کے عمل کی بنیاد قرآنی احکام پر تھی اور اس میں صاف صاف اور تاکید کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ عین دشمنی کی حالت میں بھی کسی قوم کے ساتھ تمہیں بے انصافی کرنی نہ چاہیئے[1] مغلوب اور کمزور سے جُھک کر ملنا خالص اسلامی شعار ہے اور جس قدر مسلمان شرفا میں یہ وصف پایا جاتا ہے دوسری قوموں میں اسکی نظیر ملنی شاید دشوار ہوگی ۔ دوسرے اسلامی حکومت مفتوح اقوام کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرتی تھی اور اُن کے باہمی تنازعات کا فیصلہ انہی کے سرگروہوں یا پنچایتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاتا تھا[2] گویا دورِ جدید کی زبان میں، اُنہیں قریب قریب ”حکومت خود اختیاری“ (سیلف گورنمنٹ)، حاصل تھی ۔

مسلمانوں کے باہمی تنازعے اور دیوانی مقدمات قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے تھے ۔ ہر بڑے شہر اور

[1] سورہ مائدہ رکوع ۲ ولایجرمنّکم شنآن قومٍ الآیۃ

[2] الیٹ جلد اول ص ۴۷۸ ۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ عربی حکومت نے ہندو پنچایتیں خود مختار اور نہایت منتظم حالت میں رہنے دی تھیں، سرہنری الیٹ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ نفرت اس کی وجہ تھی، مگر اس عجیب بدظنی کا کوئی معقول سبب اُنہوں نے پیش نہیں کیا ۔ اسیطرح ان کے بعض اور اعتراض بھی جن کی تاریخ سے مطلق تصدیق نہیں ہوتی ہے ذاتی تعصب پر دلالت کرتے ہیں ۔

چھاؤنی میں اس قسم کی عدالتیں سرکار کی جانب سے قائم تھیں اور اِن میں شرع شریف کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا۔ فقہِ اسلامی اُس وقت تک ایسی مُرتّب اور مروّج نہ ہوی تھی کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید پر انحصار کرلیا جاتا۔ پس ہر قاضی اوّل اوّل ایک حدتک مجتہد کی حیثیت رکھتا تھا اور قرآن و احادیث سے احکام کا استخراج کرنا اس کا فریضہ سمجھا جاتا تھا پھر کچھ عرصے بعد اکثر مقامات میں فقہِ حنفی پر عملدر آمد ہونے لگا تھا؛

تعزیری جرائم کی نوعیت اور سزا بھی شرع اسلامی کی رو سے مقرر کی جاتی تھی اور اس میں قتل و سرقہ کے علاوہ قماربازی، شراب خواری و بدکاری وغیرہ وہ اخلاقی جرائم بھی قابل تعزیر مانے گئے ہیں جو نہ صرف موجب فتنہ و فساد ہیں بلکہ قوموں کی غیرت اور بعض اوقات نسل کو غارت کردیتے ہیں؛ بایں ہمہ اِن قوانین کا نفاذ صرف مسلمانوں پر ہوتا تھا اور بعض شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو رعایا کو اِن کا پابند نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ اِن کے بعض گروہوں میں یہ خرابیاں اِس قدر بُری اور قابلِ تعزیر نہیں سمجھی جاتیں؛ ظاہر ہے کہ یہ استثنٰی محض مذہبی رواداری پر مبنی تھا اور اسلامی حکومت اپنی رعایا کے عقائد و رواج کے خلاف اُسے کسی قانون کا پابند بنانا نہ چاہتی تھی۔ جمہوری حکومت میں

قانون" کی تعریف ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ جماعت یا جمہور کی منشا (Will of the Community) کے مطابق ہو۔ اربابِ حکومت اسی پر قوم کو چلانے کی خدمت انجام دیں اور اِن کی ذاتی پسند یا ناپسند کا قانون میں دخل نہ ہو۔

ہندوؤں کے ساتھ رعایات

سیاسی طور پر دیکھئے تو ہندو رعایا کے ساتھ یہ بڑی رعایت تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ نہ صرف اپنے مقدمات کا فیصلہ کرنا بلکہ اپنے لئے قانون وضع کرنا بھی انہی کے ہاتھ میں تھا، اور انقلاب حکومت نے بجز اس کے کہ نظم و نسق میں تازہ قوت پیدا کردی، نہ ان کی اندرونی آزادی میں کسی قسم کا فرق ڈالا نہ غیر حکومت کا کوئی ایسا بوجھ اُن پر رکھا جس کا برداشت کرنا ناگوار ہوتا۔ مذہبی معاملات میں بھی وہ بالکل آزاد تھے۔ ہر شخص کو اپنے عقائد اور عبادات کا اختیار تھا اور شروع ہی میں محمد بن قاسم نے علمائے دمشق سے فتویٰ منگوا لیا تھا کہ اُن کے مندروں کے ساتھ وہی مراعات کی جائیں گی جو اسلام نے مسیحی اور یہودی معابد کو دی ہیں[1]۔ مگر اس سے بھی کہیں بڑھکر یہ رعایت تھی کہ ان کے مذہبی پیشواؤں کے قدیم امتیازات کو بحال رکھا اور مالگزاری میں تین فیصدی لینے کا جو حق پہلے ان کو حاصل تھا اس میں اب بھی کوئی کمی نہیں کی گئی اور یہ وہ رعایتِ خاص تھی جو پہلے سندھ کے برہمن

[1] چچ نامہ مترجمہ الیٹ، جلد اول ص ۱۸۶؛ فتوح البلدان ۴۳۹

راجہ ہی کے وقت میں ان کے ہم قوموں کو دی گئی تھی[۱]
معلوم ہوتا ہے کہ عرب فاتحین مفتوحوں کے دل میں گھر کرنے کی تدابیر کو خوب سمجھتے تھے اور ان پر خلوص کے ساتھ عمل کرنے کی قابلیت رکھتے تھے کیونکہ گو یہ سب جانتے ہیں کہ رعایا کے ساتھ نرمی، محبت اور کامل اعتماد و مساوات کا سلوک ملک کے امن و رفاہ کی بہترین ضمانت ہے مگر عمل کے وقت ان شریفانہ اصول کو عام طور پر بُھلا دیا جاتا ہے۔
اسی لئے ہمیں خوشی ہوتی ہے جب کہ تاریخ سندھ میں جا بہ جا ہم ایسے ضوابط و آئین کا حال پڑھتے ہیں جو عربوں نے اپنی ہندو رعایا کی اجنبیت دور کرنے کی غرض سے جاری کئے تھے[۲] حجاج بن یوسف کے ہر خط میں تاکید ہوتی تھی کہ جو لوگ اطاعت قبول کریں اور جزیہ دیں انکو ہر قسم کی آزادی دی جائے اور اُن کے ساتھ نرمی اور برابری کا سلوک مرعی رکھا جائے[۳] خود محمدؒ بن قاسم جہاں جاتا وہاں مفتوحین کو یہی پیغام سناتا اور اُن کے دل بڑھاتا تھا۔ رعایا کے دینی اور دنیاوی سرگروہوں کو اس کی بار بار یہی تاکید تھی کہ وہ بے خوف و خطر رہو اور مسلمانوں سے جس قدر چاہو میل جول رکھو۔ اپنی فلاح و بہبود کی جو تدابیر مناسب سمجھتے ہو انہیں اختیار کرو تمہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ اپنے مندر تعمیر کرو۔ اور جو تمہارے بزرگوں کی

[۱] چچ نامہ ص ۱۸۲ و ۱۸۳ و ۱۶۹ [۲] تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۲۰

رسمیں ہیں ان کو برابر ادا کرتے رہو۔ اپنے غریب برہمنوں کے ساتھ مہربانی اور عزت سے پیش آؤ اور قدیم رواج کے موافق خیرات و زکوٰۃ میں اُن کا جو کچھ حق ہے وہ اُن کو دو۔[1]

رعایا کو خوش رکھنے کی سب سے کارگر تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ اُن کے محاصل کی تشخیص و تعین اور وصول کا کام خود اُن کے مذہبی پیشواؤں (یعنی برہمنوں) پر چھوڑ دیا تھا۔ بعض بڑے اور تجارتی شہروں میں چند نامی سوداگروں کو منتخب کرلیا جاتا تھا کہ شہر کا مسلمان حاکم اُن سے مشورہ لئے بغیر کوئی کام نہ کرے۔ اہم ملکی مسائل میں رائے لینے کی غرض سے محمد بن قاسم نے راجہ داہر کے وزیر کو اپنے عہدے پر بحال رکھا تھا اور ہر معاملے میں اسی کی تجویز کے مطابق کام کرتا تھا۔[2]

محمد بن قاسم کے سبق آموز اقوال و ضوابط سے مذکورۂ بالا بیان کو اور طول دیا جا سکتا ہے مگر یہاں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ہندوؤں کے ساتھ یہ مراعات جس بلند نظری اور فیاضی کی دلیل تھیں، اس کے دوسرے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اسلامی اوقاف

اس سے ہماری مراد وہ فیاضی ہے جو حکومتِ عرب نے مساجد و مدارس یا اسی قسم کے دوسرے اوقاف قایم کرنے میں

---

[1] چچ نامہ۔ الیٹ جلد اول ص ۱۸۶

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۸۹ و ۲۶۹

صرف کی تھی[۱] ہر شہر یا چھاؤنی میں جہاں مسلمانوں کی کوئی جمعیت متعین کی جاتی تھی ایک مسجدِ جامع سرکار کی طرف سے تعمیر کردی جاتی۔ موقع بہ موقع امرائے عرب بھی مسجدیں بنوا دیتے اور اُن کے مصارف کے واسطے بڑی بڑی جاگیریں وقف کردی جاتی تھیں۔ یہ جاگیریں سرکاری محاصل سے بالکل مستثنیٰ تھیں اور انکی آمدنی سے نہ صرف مساجد کی مرمت اور عام نگہداشت کا کام لیا جاتا تھا بلکہ اس کا زیادہ حصہ علماء اور طلبہ کے وظائف یا مسافروں کی مہمانی میں خرچ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہر مسجد مستقل طور پر درس گاہ کا کام دیتی تھی اور اس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔[۲] اِن اوقاف کی ٹھیک تعداد بتانی محال ہے لیکن اس بارے میں اسلامی حکومت کی فیاضی کا کچھ اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب انگریزوں نے ریاست سندھ پر قبضہ کیا تو وہاں کی کل مالگزاری کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی قسم کے مذہبی اوقاف میں صرف ہوتا تھا[۳]!

علم دین

"علم الادیان" مسلمانوں کی نظر میں سب سے محبوب اور ضروری علم ہے اور عربی حکومت کے زمانے میں سندھ میں بھی دیگر ممالک اسلامی کی مثل اس تعلیم کو

---

[۱] الیٹ جلد اول ص ۴۶۲

نہایت فروغ تھا۔ شام و عراق کے نامور اساتذہ یا وہاں کے سند یافتہ علما، یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے اور اسی ضمن میں فقہ، منطق، فلسفہ یا علم کلام اور صرف ونحو کی تعلیم دی جانے لگی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخری سیاح علامہ مقدسی نے یہاں کے مُحدّثین اور بعض صاحبِ تصنیف علما کا اپنے جغرافیے میں ذکر کیا ہے[1] اور اس سے پہلے کے چند مشہور سندھی اساتذہ کا حال بھی مختلف کتابوں میں ملتا ہے[2] مگر طوالت کے خوف سے ہم اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہیں۔ تاہم خاص طور پر توجہ دلانے کی بات یہ ہے کہ اس تعلیم میں اخلاقی تربیت کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں جا بہ جا عمل صالح

[1] احسن التقاسیم۔ ص ۴۷۹ و ۴۸۱

[2] ان میں سے بعض علمائے سندھ کے حال میں دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد دوم ص ۶۵ و ۲۵۶ نیز معجم البلدان جلد سوم ص ۱۶۶۔ اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے سب سے پہلے مصنّف اور نامور مُحدّث ابوحفص ربیع بن صبیح بصری بھی شرکت جہاد کے لئے سندھ آئے تھے اور صاحب مُغنی کی روایت کی بموجب اسی سرزمین میں انتقال کیا۔ (مآثر الکرام جلد اول ص ۶ نیز ملاحظہ ہو تاریخ کامل حالات ۱۶۰ھ) کسی قدر اختلاف روایت کے ساتھ رسالۂ یادِ ایام کے فاضل مؤلف نے بھی ان بزرگ کا ذکر کیا ہے (ص ۸) ۱۲

کی تاکید کی گئی ہے اور اُس زمانے میں جس قدر نامور علماء اور ائمۂ دین گزرے وہ بھی مسائل الٰہی میں فلسفیانہ موشگافی یا منطق کے دقیق مباحث کو زیادہ وقعت نہ دیتے تھے بلکہ عمدہ اخلاق اور اچھے اعمال ان کے نزدیک تحصیلِ علم کا صحیح معیار تھے۔ دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے لئے تقویٰ اور سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہا صلواۃ) کی عملی پابندی مقدّم شرط سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح، اگر عربوں کی جنگی قوت نے سندھ کے بڑے بڑے قلعے سر کئے تو اِن کے عمدہ اخلاق واوضاع نے اہلِ سندھ کے دلوں کو مسخّر کرلیا۔ چندہی روز میں یہاں کے لوگ اُن سے ایسے گھل مل گئے کہ سندھ کے اصلی اور عربی باشندوں میں تمیز نہ ہوتی تھی۔ مذہبی طور پر بھی اگرچہ بُت پرستی کا ان میں رواج تھا مگر یہ لوگ بودھ مت کے نام لیوا تھے اور اس کی اخلاقی تعلیم اسلام سے ایک قسم کی مناسبت رکھتی ہے۔ لہذا اِن کے رئیس وراجہ یا مذہبی پیشواؤں کو توحید کا مذہب قبول کرنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ اور سندھ کے لوگ جوق جوق مسلمان ہونے لگے۔ بلکہ مولّف عجائبُ الہند کی روایت صحیح ہوتو ہندوستان کی زبان میں ایک کشمیری راجہ ہی کی فرمائش سے قرآن مجید کی سب سے پہلی تفسیر کی گئی[1] جس کے معنی یہ ہوئے کہ

[1] عجائب الہند صفحہ ۳

(تیسری صدی ہجری میں) سندھ سے باہر اسلام کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ سرحد کابل کے ایک خود مختار راجہ کے بطور خود اسلام لانے کی روایت بھی اس قول کی تائید کرتی ہے۔ اس راجہ کا بیٹا بہت بیمار ہوگیا تھا اور برہمنوں نے اپنے دیوتا کی طرف سے حکم لگایا تھا کہ وہ اچھا ہوجائے گا۔ لیکن یہ پیشین گوئی غلط نکلی۔ لڑکا مرگیا۔ راجہ نے بعض مسلمان سوداگروں کو بلاکر اسلام کے عقائد دریافت کئے اور مسلمان ہوگیا۔[1]

اسلامی مذہب و معاشرت کے اختیار کرنے سے اہل سندھ پر جو اثر پڑا اس کا مختلف زمانوں کے حالات پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ محمد بن قاسم نے جس وقت یہ ملک فتح کیا تو اس میں قومیں کی قومیں وحشی اور خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتی تھیں لوٹ مار پر اُن کا گزارہ تھا اور درندوں سے بدتر ان کی خصلت تھی چنانچہ سندھ کے برہمن راجہ نے بعض کے متعلق نہایت شدید قوانین جاری کئے تھے اور ادنیٰ چوری کے جرم پر ملزم کے زن و بچہ تک کو جلوا دیتا تھا۔[2] مگر دو تین صدی کے بعد یہی جاہل وحشی ہمیں نہایت شایستہ شہری نظر آتے ہیں جو مقدسی

۱۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۶

۲۔ چچ نامہ، ایلیٹ جلد اول صفحہ ۱۸۷

اور ادریسی کے بقول صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت میں ہنرمند پیشہ ور اور اپنے حاکموں کی خوش اطوار ومتمدن رعایا بن گئے تھے؛ آج بھی جب کہ اِدھر جہل و افلاس اور اُدھر مغربی تمدن ان کے سادہ اخلاق کو بگاڑنے کے اسباب مہیا کر رہا ہے، سندھ کے لوگ جن میں ۷۶ فیصدی مسلمان ہیں اپنی دیانت وراست گفتاری میں مشہور ہیں[1]۔

۴۔ فتوحاتِ عرب اور تاریخی واقعات کا خلاصہ

فتوح

قدیم "مکران" کی حدود جو خلیفہ ثانیؓ کے عہد میں فتح ہوا[2] قریب قریب وہی تھیں جو موجودہ مکران کی ہیں۔ اور مختلف تاریخوں کو غور واحتیاط سے پڑھنے کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ موجودہ ریاست قلات وبلوچستان کا مشرقی ثلث اُن دنوں ریاست سندھ میں داخل تھا اور ابتدائی فتح کے بیس برس بعد یہی مشرقی ٹکڑا مسلمانوں نے تسخیر کرکے صوبۂ مکران میں، جو پہلے فتح ہوچکا تھا شامل کرلیا اور اس وقت سے یہ نیا شامل کیا ہوا حصہ بھی جو پہلے "سندھ" کہلاتا تھا "مکران" کہلانے لگا؛ یہی وہ نکتہ ہے جسکی قدیم اسلامی مورخوں نے صراحت نہیں کی اور جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے الیٹ کو بہت پریشانی پیش آئی اور اُس نے کئی جگہ غلط قیاس کیا ہے و نسنٹ اسمتھ نے

[1] گزیٹیئر جلد ۲۲، ص ۸۰۔ [2] اسی فاروقی عہد اور نیز بعد میں سواحلِ ہند اور سندھ پر جو تاختیں عربوں نے کی تھیں اُن کا اجمالی حال ہم اپنی پہلی (برائے میٹرک) میں بیان کرچکے ہیں (ص ۴۲ تا ۴۴)۔

بھی جس مکران کو (بلوچستان کے نام سے) سندھ کی برہمن سلطنت کا صوبہ بتایا ہے، وہ حقیقت میں موجودہ بلوچستان کا یہی مشرقی ٹکڑا ہے جو عربوں نے سندھ کے راجہ سے چھین کر اپنے مفتوحہ مکران میں ملا لیا تھا۔

یہ فتح امیر معاویہ رضؓ کے زمانے میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ عربی سیلاب جس نے ساسانی تاجدار کو اپنے آبائی ملک سے باہر دھکیل دیا، کوہستان مکران کی وادئ کیچ (عربی: کوج) تک آکر رک گیا تھا کیونکہ یزدجرد کے خیر خواہ ایران میں جا بجا بغاوتیں کرتے تھے اور عربوں کی نئی حکومت کو انہیں فرو کرنے میں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ فتحِ ایران کی تکمیل خلیفہ ثالث رضؓ کے عہد میں ہوئی اور اسی وقت مسلمانوں کو آگے بڑھنے کی فرصت ملی۔ لیکن خلیفہ ممدوح رضؓ کی شہادت کے تھوڑے دن بعد مسلمانوں میں باہمی نزاع پیدا ہوگئی اور اس فرقہ بندی نے کئی سال اُن کو غیر متحد رکھا۔ حتیٰ کہ ۴۱ھ میں قریب قریب تمام اسلامی ممالک دوبارہ ایک فرماں روا کی اطاعت پر متفق ہوگئے۔

اس شیرازہ بندی کے بعد اسلامی فوجوں نے پھر ہر طرف پیش قدمی شروع کی اور اسی سلسلے میں بلوچستان کی

مذکورۂ بالا فتح، اور قندہار و کابل کے کوہستانی علاقوں پر جو ان دنوں ہندوستان ہی میں داخل سمجھے جاتے تھے، فوج کشی عمل میں آئی - ان لڑائیوں کے لئے سیستان و مکران گویا فوجی مرکز بنادئے گئے تھے جہاں سے عربی فوجیں مشرق کی جانب بڑھائی جاتی تھیں۔ عربی تاریخوں میں انہی "ہندوستان کی مہمات" کے حالات ہیں جن کے پڑھنے سے بعض اوقات طرح طرح کے مغالطے پیدا ہوتے ہیں - اسی زمانے کا عرب شاعر (ابن مفرّغ) کہتا ہے:-

کم بالجروم وارض الھند من قدم

ومن سرائنک قتلی لا ھُم قُبِروا

یعنی سرزمین ہند اور ممالک گرم میں ہمارے بہت سے نقش قدم اور بہت سے وہ دلیر شہید پڑے ہیں جن کی قبریں تک نہیں! "ہند" اور "ممالکِ گرم" سے شاعر کی مراد بظاہر وہی کابل و بلوچستان کے علاقے ہیں جہاں امیر معاویہؓ کے عہد میں

۱؎ فتوح البلدان مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں، جو مشہور مستشرق ڈی گیڑی کے زیر اہتمام یورپ میں چھپی ہے یہ لفظ اسی طرح درج ہے اور ذیلی حاشئے میں صراحت کی گئی ہے کہ قلمی نسخے میں "سراصل" تحریر تھا جسے فارسی لفظ "سرہنگ" کی معرب جمع "سرائنک" سمجھا گیا۔ (فتوح البلدان صفحہ ۴۳۴)

بار بار فوج کشی اور بعض فتوحات ہوئیں ۔

ان چھوٹی چھوٹی مہمات کے حالات لکھنے یہاں نا موزوں ہوں گے دوسرے سچ پوچھئے تو یہ بیرون ہند کی لڑائیاں تھیں ۔ ہندوستان کی حدود میں خاص ریاست سندھ پر کوئی حملہ نہ ہوا تھا ۔ کرنل ٹاڈ جس نے ”غیر معتبر افسانوں کو ”وقایع راجستان“ کا پُر شکوہ لقب دیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ ۶۶ھ / ۶۸۶ء میں مسلمانوں نے سندھ کے راستے راجپوتانے پر بھی حملہ کیا تھا ، حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جب میں خلافت اموی اندرونی لڑائیوں میں اُلجھی ہوئی تھی ۔ اور مروان یا عبدالملک کو اپنی تخت نشینی کے وقت (۶۵ھ) اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ کسی بیرونی ملک پر فوج کشی کا خیال کرتے ۔ غرض ٹاڈ کی روایت الیٹ کے الفاظ میں محض ”لایعنی اور مصنوعی ہے“[1]

سندھ پر فوج کشی

جب عبدالملک نے اپنے مخالفوں پر غلبہ پایا اور عراق و ایران کی حکومت حجّاج بن یوسف ثقفی کو تفویض ہوئی تو اُس وقت بھی خود مسلمانوں کو ریاستِ سندھ پر حملہ کرنے کا خیال نہ تھا لیکن دو اتفاقی واقعات نے جنکا پہلی فصل میں ذکر آچکا ہے حجّاج کی توجہ ادھر منعطف کردی اور اس نے دیبل کے بحری قزّاقوں کی سرکوبی کیلئے خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ تا ۹۶ھ / ۷۱۵ء) سے

[1] الیٹ ۔ جلد اول ص ۴۲۶ ۔

ملک سندھ پر فوج کشی کی اجازت طلب کی۔
ولید کو ایسے بعید دغیر آباد ملک پر حملہ کرنا پسند نہ تھا مگر حجاج کے اصرار اور المضاعف خراج ادا کرنے کے اقرار پر اس نے بادلِ ناخواستہ منظوری دے دی اور حجاج نے عبداللہ بن نبہان کو، اور جب وہ ناکام ہوا تو پھر بُدیل بجلی کو بھیجا کہ دیبل اور جنوبی سندھ کو فتح کرے۔ مگر لڑائی میں بدیل کام آیا اور بہت سے مسلمان سپاہی گرفتار ہو گئے، حجاج نے قسم کھائی کہ اس ہزیمت کا سخت انتقام لئے بغیر نہ رہوں گا۔
معلوم ہوتا ہے کہ اس پچھلی جنگ میں نیرون[1] کے لوگ بھی شریک تھے اور گو انہیں فتح حاصل ہوئی لیکن عربوں کی فوجی قوت کا انہیں اندازہ تھا۔ یہ اتفاقی کامیابی ان کے آئندہ خوف کو زائل نہ کرسکی اور اُنھوں نے اپنے شہر کی طرف سے حجاج کو صلح کا پیام دیا اور اقرار کیا کہ اگر

[1] اکثر فارسی اور بعد کے انگریز مصنف اور جغرافیہ نویس متفق ہیں کہ نیرون موجودہ حیدرآباد سندھ کا قدیم نام ہے اور اس شہر میں اب تک اس نام کا قلعہ موجود ہے۔ مگر سرہنری ایلیٹ کو گویا ضد ہوگئی ہے کہ اس قول کو غلط ثابت کیا جائے۔ ان کے نزدیک یہ "نیرون" موجودہ حیدرآباد سندھ سے ۳۵ پینتیس میل جنوب میں قصبۂ جرک کے قریب وہاں آباد تھا جہاں اب قصبہ ہلائی واقع ہے۔ خود حیدرآباد کو وہ قدیم منصورہ کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ (ایلیٹ جلد اول ص ۴۰۰ وغیرہ)۔

عرب نیرون کو امان دینے کا معاہدہ کریں تو یہاں کے لوگ باقاعدہ خراج ادا کرتے رہیں گے۔ حجاج نے یہ شرط منظور کرلی اور اسی کے ساتھ ایلچی کو جتا دیا کہ اگر مسلمان قیدیوں کو صحیح سالم نہ چھوڑ دیا گیا تو اہلِ سندھ سے کہدینا کہ سرحدِ چین تک کسی غیر مسلم کو امان نہ دی جائے گی؛ لیکن دیبل کے لوگوں کو اِس غضبناک ارادے کی اطلاع ہوی بھی تو بظاہر انھوں نے اس کی پروانہ کی اور قلعہ بند ہوکر جنگ کرنے کا انتظام کرتے رہے یہاں تک کہ محمد بن قاسم اپنی تازہ مہم لے کے سندھ میں داخل ہوا اور چند ماہ کے محاصرے کے بعد یہ مستحکم شہر فتح ہوگیا (رجب ۹۳ھ ۷۱۲ء)

پچھلی قزاقی اور لڑائیوں کا غصہ سمجھئے یا اتنے دن تک محاصرے کی جھنجلاہٹ، غرض اسلامی فوجیں سیڑھیاں لگا کے جب شہر میں گھسیں تو انھوں نے کسی لڑنے والے کو امان نہ دی اور تین دن تک دیبل کے کوچہ و بازار میں شدید خون ریزی ہوتی رہی۔ چچ نامے میں اس کشت و خون کا حال تفصیل سے لکھا ہے مگر بعض روایتیں متناقض اور ضعیف الاعتبار نظر آتی ہیں۔ بہرحال، اگر دیبل میں فاتح نے حجاج کے انتقام کی قسم پوری کی تو اور جس جگہ وہ گیا مہربانی اور امن کا پیام لے کر گیا اور جس قوم یا شہر یا سردار نے امان مانگی اور اطاعت قبول کی اس کے ساتھ محمد بن قاسم نے بلا استثنیٰ

نہایت نرم شرطوں پر مصالحت کرلی۔

غالباً اسی سال رمضان کے مہینے میں داہر والی سندھ سے بہت بڑی لڑائی ہوئی۔ اس راجہ کی طاقتوری اور شجاعت کے قصے فارسی تاریخوں میں لکھے ہیں لیکن لڑائی میں اس کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ خود مارا گیا۔ اس کا پائے تخت اروڑ یا الرور (الور) فتح ہوگیا اور مسلمانوں کو آئندہ بھی قریب ہر لڑائی میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اُن تمام لڑائیوں کے حالات لکھنا، جو راجہ کے پس ماندوں یا مختلف نیم آزاد رئیسوں سے ہوتی رہیں، بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ دوسرے اُن کے مقامات کا اب پتہ چلانا کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کم نہیں۔ عربی تاریخوں نے اس بارے میں نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور فارسی تاریخوں کو پڑھکر سخت الجھن پیدا ہوجاتی ہے اور صاف صاف کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محمدؐ بن قاسم کس راستے سے کہاں کہاں گیا۔ چچ نامہ کی تحریر کے بموجب اُس نے ایک طرف کشمیر کی کوہستانی سرحد تک اور دوسری طرف قنوج تک تمام علاقے فتح کرلئے تھے۔ اور سرہنری الیٹ بھی ان فتوحات کو ماننے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ قنوج سے ریاست قنوج کا علاقہ مراد لیا جائے جو وہ اُن دنوں اجمیر کے قریب تک پھیلا

ہوا تھا۔[1] مگر بلاذری نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ملتان فتح کر چکا تھا کہ اس کو حجاج کے وفات پانے کی اطلاع ملی اور وہ ملتان سے واپس الرور چلا آیا۔[2]

راقم الحروف کے نزدیک زیادہ صحیح یہی آخری قول ہے لیکن فتح ملتان کے معنی یہ ہیں کہ مشرق میں دیپال پور اور شمال میں شہر جہلم تک وہ تمام علاقہ جو اُن دنوں سلطنتِ سندھ میں داخل تھا اور اب کل پنجاب کا تقریباً نصف مغربی حصّہ ہے، محمد بن قاسم یا اُس کے نائبین فتح کر چکے تھے اور جنوب مشرق کی طرف بھی موجودہ ریاست بہاولپور اور راجپوتانے کا کچھ شمالی ٹکڑا اُنکے قبضے میں آگیا تھا۔ کیونکہ اِس بارے میں تمام قرائن چچ نامے کے مویّد نظر آتے ہیں کہ راجہ داہر کی قلمرو کی حدود یہی تھیں۔[3]

اوصاف ذاتی

ان فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ جب وہ شیراز سے فوج لے کر سندھ پر بڑھا تو سترہ سال یا اس سے بھی کچھ کم عمر کا

ء۱ الیٹ - جلد اوّل ص ۴۳۴ تحفۃ الکرام کے مؤلف نے بھی سرحد قنوج ہی لکھا ہے۔ (جلد سوم ص ۲۲)

ء۲ فتوح البلدان ص ۴۴۰

ء۳ تحفۃ الکرام - جلد سوم ص ۸ - نیز دیکھو الیٹ جلد اوّل ص ۴۰۵ بحوالہ چچ نامہ تاریخ سندھ وغیرہ -

لڑکا تھا۔ شاعر کہتا ہے۔

ساس الرجال بسبع عشرۃ حجۃ ❊ ولداتہ عن ذاک فی اشغال

(اس کے ساتھ کے لڑکے کھیلنے میں رہے اور اس نے سترہ برس کی عمر میں میدانِ جنگ پر حکومت و سرداری کی)، اور اس سرداری کے زمانے میں کئی بڑی بڑی لڑائیاں جیتیں۔ سنگین قلعے سر کئے اور جدھر گیا اپنی جنگی قابلیت اور شجاعت سے فتح پائی۔ اُس کے اِن سپاہیانہ اوصاف کے سامنے سکندر اعظم کی سپہ سالاری بے وقعت ہوی جاتی ہے جس نے ایک ہزار برس پہلے انہی ممالک پر کہیں زیادہ فوج اور جنگی سازو سامان کے ساتھ فوج کشی کی تھی۔ جو رئیس و راجہ سکندر کے مقابلے میں آئے اُن میں سے کوئی بھی راجہ داہر کے برابر ذی اقتدار نہ تھا باایں ہمہ یونانی مورّخوں کے یک طرفہ بیان ہی سے یہ بات ظاہر ہے کہ سکندر کی فتوحات میں مکرو سازش کا دخل تھا اور وہ بعض اوقات بے خبری میں حملہ کرکے نہتّے کسانوں کو بھی قتل کرنے میں رحم دلی یا آئینِ شجاعت کا پاس نہ کرتا تھا[1] ہندوستان میں اس کی فتوحات کا اثر کچھ دیرپا ثابت نہ ہوا اور نہ اُنکا دائرہ اِس قدر وسیع تھا جس قدر محمد بن قاسم کی فتوحات کا۔ پس مجموعی طور پر عرب فاتح سندھ کے جنگی کارناموں کے مقابلے میں

---

[1] ارلی ہسٹری۔ ص ۵۵ و ۹۵ وغیرہ

کسی سپہ سالار کا نام پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ موسیٰ بن نُصیر یا طارق فاتح اندلس اور یا قُتیبہ بن مُسلم ہیں جو اسی زمانے میں ایک طرف مراکش و اندلس اور دوسری طرف سُغد و بُخارا میں پے در پے فتوحات حاصل کر رہے تھے، اور اگر محمد بن قاسم سکندر کی طرح خود مختار بادشاہ نہ تھا یا اس قدر ملک فتح نہ کرسکا جتنے اس یونانی کشورکشا نے اپنی زندگی میں فتح کر لئے تھے، تو یہ تقدیری اُمور ہیں جن میں انسان کی ذاتی کوشش و قابلیت کا زور نہیں - یہاں اس کی سپاہیانہ صفات اور سہ سالہ سندھی فتوحات کا صرف اُن فتوحات سے مقابلہ کرنا منظور ہے جو سکندر اعظم نے ہندوستان میں پائی تھیں، اس کے بعد محمد بن قاسم کو اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا ورنہ الیٹ کو اعتراف ہے کہ حجاج کے حکم کی تعمیل میں ممالک ہند کو فتح کرتے ہوئے چین تک اس کا پہنچ جانا کوئی ناممکن بات نہ تھی[1]، اس کی جوانی، ہردلعزیزی اور مسلسل فتوحات اس کی اولوالعزمی کو تقویت پہنچا رہی تھیں اور ممالک مفتوحہ کا جس خوبی سے اُس نے انتظام کیا وہ نہ صرف بجائے خود تعجب انگیز ہے بلکہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ درحقیقت محمد بن قاسم کو خدا نے بڑے بڑے

[1] الیٹ ص ۴۳۴

ملک فتح کرنے کی قابلیت عطا فرمائی تھی۔ اس بارے میں ہماری تمام تاریخیں متفق ہیں کہ اس نے اہلِ سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا۔ اُن کے پہلے رسم و رواج اور آئین میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جو انہیں ناگوار یا فاتحین کی زبردستی معلوم ہوتی۔ قلعوں اور شہروں میں عربوں کی فوجیں اس قدر باموقع متعین کی گئی تھیں کہ تین سال کے اندر ہی اندر ملک میں امن و امان قائم ہوگیا۔ رعایا کی رفاہ و خوش حالی کے آئین جاری ہوئے اور یہ نوجوان سندھ کے لوگوں میں نہایت محبوب و محترم سمجھا جانے لگا۔ مورخ بلاذری، جس کا محققانہ اختصار اس قسم کے واقعات بیان کرنے کی بہت کم اجازت دیتا ہے لکھتا ہے کہ جس وقت محمدؐ بن قاسم معزول و گرفتار ہوکر ایران بھیجا گیا، تو وہ اہل ہند اس کے لیئے روئے اور کیرج کے باشندوں نے اس کی مورت بنائی[۱]۔ حمزہ بن بیض دو شعروں میں اس کی خوبیوں کا احاطہ کرنا چاہتا ہے۔

اِنَّ المروۃ والسماحۃ والندیٰ + لمحمد بنِ القاسم بن محمدِ
ساس الجیوش لسبع عشرۃ حجۃً + یا قرب ذلک سوددًا من مولدٖ

مگر اس کی بے تعصبی، ہردلعزیزی اور انتظامی قابلیت کا شاید سب سے عمدہ ثبوت یہ ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں اُس نے خود سندھ کے باشندوں کی ایک فوج کثیر

---

[۱] فتوح البلدان - ۴۴۰

فراہم کرلی تھی اور ان فوجوں کے علاوہ جو چھاؤنیوں میں جا بہ جا مقیم تھیں پچاس ہزار تازہ دم سپاہی ملتان میں جمع ہو گئے تھے کہ حکم ملتے ہی شمال و مشرق کی طرف کوچ کریں ۱؎

گرفتاری اور قتل

اس نئی مُہم کی تیاریاں غالباً مکمل ہو چکی تھیں کہ محمد بن قاسم کو پہلے حجّاج اور پھر خلیفہ ولید بن عبد الملک کے انتقال کی خبر ملی۔ سلیمان بن عبد الملک جو حجّاج کے خاندان کا مخالف تھا، تخت نشین ہوا (۹۶ھ تا ۹۹ھ / ۷۱۷ء) اور اُس نے عمداً صالح بن عبد الرحمٰن کو والئ عراق مقرر کیا۔ اس شخص کے بعض رشتہ داروں کو حجّاج نے مروا دیا تھا۔ اور اسی کے انتقام میں اُس نے "آل ابی عقیل" یعنی حجّاج کے کُنبے کے افراد کو چُن چُن کے قتل کیا اور اسی سلسلے میں یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو والئ سندھ بنا کر حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو قید کر کے بھیجا جائے۔ اِس حکم کی تعمیل ہوئی اور سندھ کے نوجوان فاتح نے خاموشی سے اپنی گردن جھکا دی اور اسی حلم و اطاعت گزاری میں اپنی حیرت انگیز جواں مردی کا وہ نقشہ چھوڑ گیا جو اہلِ بصیرت کے نزدیک اِس کی تمام فتوحات کی یاد سے زیادہ پائیدار ہے۔ مورّخ بلاذری نے اُس کے چند شعر نقل کئے ہیں جن میں محمد بن قاسم دعویٰ کرتا ہے کہ اگر میں

۱؎ تحفتہ الکرام جلد سوم ص ۲۲ - الیٹ ص ۴۳۵۔

جنگ و مدافعت پر آمادہ ہوتا تو ایک فوج کثیر میرے لئے اپنا خون بہانے پر تیار ہوجاتی اور کسی "سکسکی" کی مجال نہ ہوتی کہ مجھے اس طرح گرفتار کرلیتا۔[1]

محمد بن قاسم عراق عجم کے شہر واسط میں قید کیا گیا تھا اور وہیں قتل ہوا۔ خود کہتا ہے۔

"فلئن ثویت بواسط وبارضها + رہن الحدید مکبلا مغولا الخ"

اور یوں بھی معزولی و قتل کی مذکورۂ بالا روایت میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں نظر آتی لیکن چچ نامہ نے اس کے متعلق عجیب افسانہ لکھا ہے جسے میر معصوم نے اور بھی رنگین بنا دیا۔ بعد کے فارسی مورخ بھی اسی کو نقل کرتے رہے اور گو سر ہنری الیٹ پہلی روایت ہی کو قرین صحت جانتے ہیں۔[2] لیکن ہمارے زمانے کے اکثر انگریز مصنف اس معاملے میں ان کی پیروی کرنی نہیں چاہتے بلکہ اسی افسانے کو طرح طرح سے لکھتے ہیں جس میں عرب تاجدار کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہے۔[3]

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۱۔

[2] الیٹ۔ ص ۴۳۷۔

[3] اس افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ سندھ کی غنیمت میں راجہ داہر کی دو نا کتخدا لڑکیاں بھی گرفتار ہوکر خلیفہ ولید کی خدمت میں روانہ کی گئی تھیں اور جب خلیفہ نے انہیں حرم میں داخل کرنا چاہا تو انھوں نے بیان کیا کہ محمد بن قاسم ان کی عصمت دری کرچکا ہے۔ خلیفہ نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں حکم دیا کہ

آیندہ فتوحات جنید

بہر حال، محمد بن قاسم کا جانشین، یزید سکسکی ولایت سندھ کو اس کے فاتح سے لینے کے بعد کچھ زیادہ دن نہ جیا اور آئندہ نو سال تک جو عرب والی مقرر ہوئے وہ بھی یا تو سندھ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۔ محمد بن قاسم کو زندہ بیل کی کھال میں سی کر دمشق لایا جائے اور جب اس حالت میں اس کی لاش پہنچی اور ان لڑکیوں کو دکھائی گئی تو انہوں نے خلیفہ کی جلد بازی پر اسے تنبیہہ کی اور کہا کہ ہم نے اپنے باپ کے قتل کا محمد بن قاسم سے انتقام لینے کی غرض سے یہ بات بالکل جھوٹ بتائی تھی۔ یہ سن کر خلیفہ نے بہت پیچ و تاب کھایا اور ان لڑکیوں کو سخت عقوبتوں سے قتل کرا دیا۔ مگر دلین پول صاحب لکھتے ہیں، کہ یہ دوسرا جرم پہلے کی کوئی تلافی نہ کرسکتا تھا"۔ (مڈیویل انڈیا۔ ص ۱۱)

عجیب بات یہ ہے کہ لین پول صاحب اس واقعے کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی موت ولید کے جانشین کے زمانے میں ہوئی! اور یہی امر اس تمام افسانے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ میر معصوم اور چچ نامہ کے مولف یا مترجم اس بات کا صاف صاف ذکر ہی نہیں کرتے کہ محمد بن قاسم کو کس سنہ میں اور کس خلیفہ کے حکم سے یہ سزا دی گئی تھی کیونکہ اگر وہ اس قدر غور اور تحقیقات کو گوارا کرتے تو پھر اس کہانی کا بے سروپا ہونا خود بخود ظاہر ہو جاتا۔ باقی دیگر فارسی یا انگریز مصنفوں کے متعلق جنہوں نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اس واقعے پر مفصل بحث کی ہے اور متعدد عربی تاریخوں کے حوالے سے اس کا فرضی ہونا ثابت کیا ہے۔ (دیکھو ان کی تاریخ سندھ حصہ اول)

بعض سرکش رئیسوں کی بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف رہے
اور یا قومی تنازعات نے اُنکو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ
سندھ و ہند کے معاملات پر زیادہ توجّہ کرسکتے؛ البتہ
جب جنید بن عبد الرحمٰن المرّی اس عہدے پر مامور ہوا
(۱۰۵ھ / ۷۲۳ء)، تو محمّد بن قاسم کی کشور کشائی کی یاد تازہ ہوگئی۔
اس کی فتوحات کا اثر گو زیادہ پائیدار نہ ثابت ہوا، لیکن
ان کا دائرہ محمّد بن قاسم کی فتوحات سے کہیں زیادہ
وسیع تھا۔ سندھ کی اندرونی شورشوں کو فرو کرنیکے
بعد سب سے پہلے اُس نے "کیرج" پر فوج کشی کی۔
اس مقام کو سرہنری الیٹ کچھ کا کوئی قدیم شہر قرار
دیتے ہیں لیکن جیسا کہ خود اُن کا قیاس ہے وہ "منڈل"
کے قریب ہوگا، جس پر جنَید نے کچھ روز بعد حملہ
کیا تھا۔ اور یہ "منڈل" ان کے نزدیک راجپوتانے
کا قدیم "منڈور" یا علاقۂ جھالاوار کا شہر ہے[1]۔
اسی آخری قیاس کی بنا پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ
عجب نہیں "کیرج" سے مراد وہ علاقہ ہو جسے آج کل
"کاں کرج" کہتے ہیں اور جس کی پرانی راج دھانی کے کھنڈر
آج بھی اُس کی گزشتہ وسعت کی شہادت دیتے ہیں[2]۔
دوسرے یہی علاقہ جو موجودہ ریاست پالن پور کے

---

[1] الیٹ جلد اوّل ص ۳۹۱۔

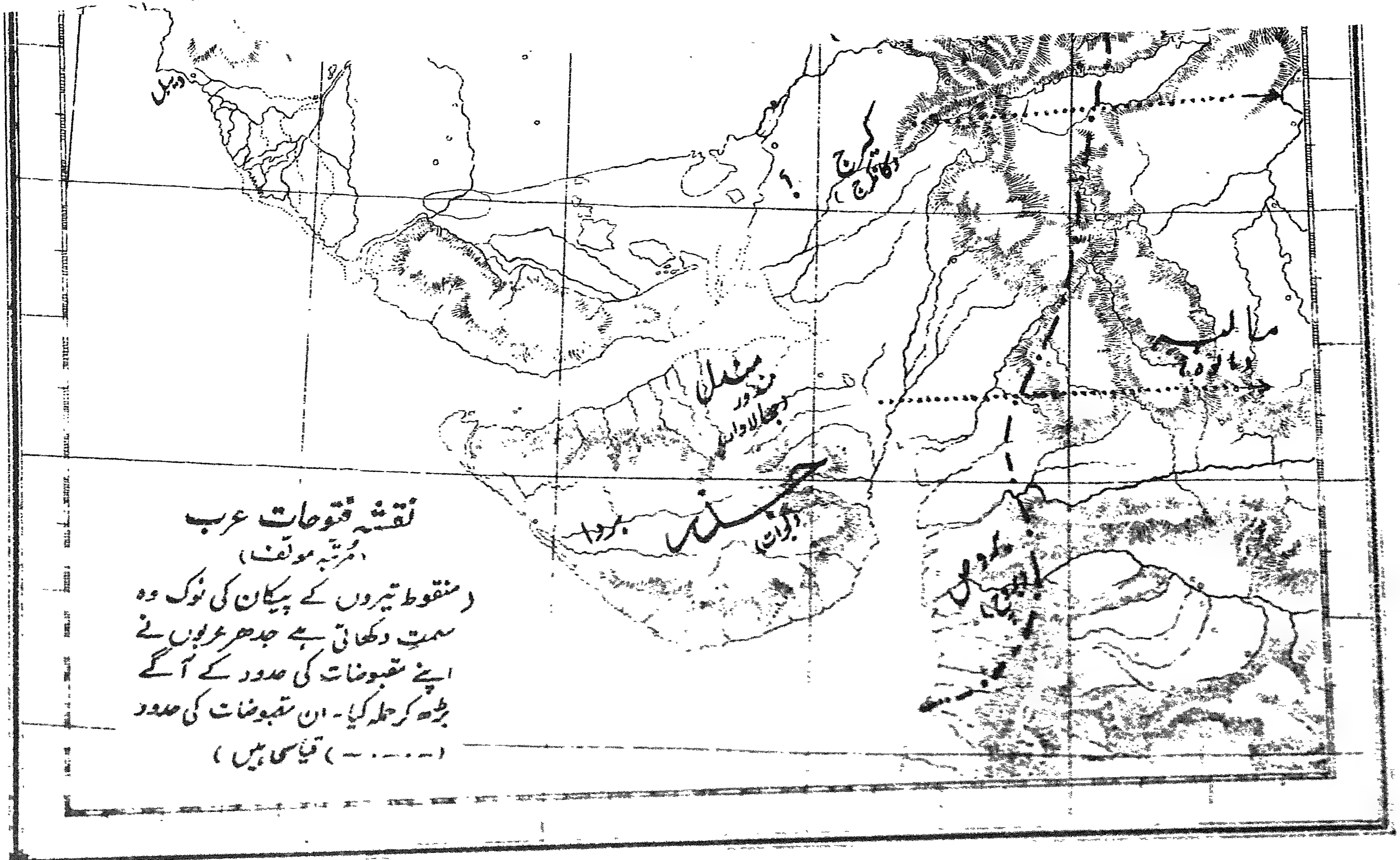
[2] گزٹیئر، جلد ۱۴ ص ۳۰۴

متصل، سندھ و گجرات کے درمیان میں ہے، قدرتی طور پر سب سے پہلے سندھ کے عرب والی کی زد میں آیا ہوگا۔ اور اسی فتح کے بعد اس کی فوجیں "مرمد" "مندل" "دھنج" اور "بروص" کی طرف بڑھی ہوں گی۔ اِن مقامات پر بظاہر مستقل قبضہ کرکے، اُس نے جبیب بن مرہ کی سرداری میں ایک فوج تو مالوے پر بھیجی جس نے اجّین تک تمام ملک پامال کردیا۔ اور خود "جندر" اور "بیلمان" کو فتح کیا۔[1]

ان عربی ناموں میں صرف "دھنج" ایسا مقام ہے جس کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا اور "بیلمان" کو سرہنری الیٹ چچ نامہ اور بیگ لار نامہ کے حوالے سے "نیلما" بتاتے ہیں جو سندھ و جیسلمیر کے درمیان کے علاقے کا نام تھا۔ "مرمد" سے مارواڑ مراد ہے اور "بروص" موجودہ بروچ ہے باقی "جندر" (یا جرز) کو گجرات کا معرب سمجھنے میں کوئی دقت نہیں نظر آتی اور الیٹ کی تاریخ کے فاضل اڈیٹر پروفسر ڈوسن کا بھی نتیجہ تحقیقات یہی ہے[2] جنید کی یہ فتوحات اگرچہ عارضی تھیں لیکن اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے مختصر عہد میں (۱۰۴ھ تا ۱۰۷ھ) تمام شمال مغربی ہندوستان کی

[1] فتوح البلدان ۴۴۲۔ الیٹ ۴۴۲۔ تاریخ سندھ مولانا شرر جلد دوم ص ۲۹ (بحوالہ یعقوبی)

[2] الیٹ ۳۵۸۔


نقشہ فتوحات عرب
(مرتبہ مولف)
(منقوط تیروں کے پیکان کی نوک وہ
سمت دکھاتی ہے جدھر عربوں نے
اپنے مقبوضات کی حدود کے آگے
بڑھ کر حملہ کیا۔ ان مقبوضات کی حدود
(—.—.—) قیاسی ہیں)
دیبل
مالوہ
گجرات

عرب چھا گئے تھے ۔ افسوس ہے کہ عربی تاریخوں میں ان ہندی فتوحات کا بہت مجمل ذکر ملتا ہے کیونکہ ان میں خود سندھ اور یہاں کے والیوں کے حالات ضمناً آجاتے ہیں ورنہ وہ سب خلفائے دمشق و بغداد یا بعد کے خود مختار اسلامی سلاطین کا حال سناتی ہیں ۔ یہی کیفیت اُن فارسی تاریخوں کی ہے جو بعد میں سلاطین غزنی یا شاہان دہلی کے حالات میں لکھی گئیں کہ ان میں سندھ کے عرب والیوں کے متعلق بہت سرسری معلومات جمع کرنے پر اکتفا کردی گئی ہے بلکہ اس بارے میں ابو القاسم فرشتہ اور ابو الفضل جیسے سلیقہ مند مؤلفین نے بھی سخت بے پروائی سے کام لیا ہے اور جا بہ جا غلطیاں کی ہیں ؎

مگر اسے محض تائید غیبی سمجھنا چاہئے کہ مذکورۂ بالا فتوحات عرب کی شہادت ہمیں خود راجپوتوں کے گیتوں اور قصوں سے ملتی ہے ؎ ان منظوم یا غیر منظوم فسانوں کی بجائے ۔ خود تاریخی وقعت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، اُن سے ایک یقینی نتیجہ نکلتا ہے، جسے ہم قومِ راجپوت کے مدّاح کرنل ٹاڈ کے الفاظ میں نقل کریں گے :-

" اس تمام زمانے میں (جس سے ۸۵ھ ۷۰۴ء تا ۱۰۵ھ ۷۲۴ء)

مُراد ہے ، ہندو اقوام کے اندر ہل چل نظر آتی ہے اور کوئی نا معلوم حملہ آور اُن کی حکومتوں کو جا بہ جا درہم برہم کئے ڈالتا ہے ۔ اس حملہ آور کی آمد کبھی تو سندھ کی طرف سے بیان کی جاتی ہے اور کبھی سمندر سے اور جا بہ جا اُسے دیو یا جادوگر کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ۔ مگر بہر صورت وہ (فاتح) " ملیچھ " یعنی غیر قوم کا آدمی تھا سمت ۷۵۰ سے ۸۰۰ تک (مطابق سنین ہجری مذکور) جادو، چوہان ، اور گہلوٹ خاندانوں کی " تاریخیں " اپنی اپنی جگہ انہی انقلابات کی گواہی دیتی ہیں ..... ٹھیک یہی زمانہ ہے جبکہ خراسان میں خلیفہ کا نائب یزید تھا اور ولید کی فوجیں دریائے گنگا تک ممالک ہند فتح کر رہی تھیں ۔ غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو راجاوں کے خاندانوں میں مذکورۂ بالا انقلابات کا اصلی باعث یزید تھا یا قاسم اور چتوڑ اور موڑی کو بچانے کے لئے جو راجہ جمع ہوئے تھے اُن کے ناموں کی فہرست بھی اسی نتیجہ کی تائید کرتی ہے .... [۱]

---

[۱] اینلز اوف راجستان ۔ جلد اوّل ص ۲۰۷ ؀

جنید کے جانشین

سر ہنری الیٹ نے چینی تاریخوں سے بھی ان عربی فتوحات کی شہادت فراہم کی ہے[1]۔ مگر معلومات کے اس ماخذ سے ہم خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے۔ بہر حال جنید کے عہد میں عرب جس قدر دور تک بڑھے تھے پھر نہ بڑھ سکے کیونکہ جب یہ بہادر و اقبالمند والی ترقی پاکر خراسان کا حاکم مقرر ہوا تو اس کی جگہ تمیم بن یزید کو سندھ بھیجا گیا جو نہایت بے پروا اور سست حاکم تھا عربی شاعر فرزدق کی ایک منظوم درخواست کی تعمیل کر دینے کی بدولت اس کا نام فیاضان عرب میں شمار ہوتا ہے لیکن اُس کے عہد میں غالباً اکثر بعید علاقے جنہیں "جنید نے فتح کیا تھا، مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے"[2]۔

بظاہر یہی تمیم ہے جسے اِلفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں محمد بن قاسم کا جانشین بتایا ہے اور لکھا ہے کہ "خلافت اموی کے خاتمے یعنی تقریباً چھتیس برس تک سندھ کی حکومت اسی تمیم کی اولاد میں رہی اور پھر ایک بغاوت میں، جسکی تفصیل ہمیں معلوم نہیں، سومرہ قوم کے راجپوتوں نے مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا اور ان کے تمام مقبوضات ہندوؤں کے قبضے میں

[1] ص ۴۴۲۔

[2] فتوح البلدان۔ ص ۴۴۳۔

آ گئے جو یہاں پانچ سو برس تک حکمراں رہے[1] بہ الفاظ دیگر الفنسٹن صاحب عربوں کی تقریباً تین صدی کی حکومت چند سال اور چند لفظوں میں ختم کئے دیتے ہیں، حالانکہ تاریخ فرشتہ میں جس کا انہوں نے حوالہ دیا ہے، نہ یہ عبارت مجھے ملی نہ سنین کا یہ تعین۔ دوسرے اس مؤلف نے سندھ کا جہاں ذکر کیا ہے (مقالۂ ہشتم، روضۂ دوم) وہاں اپنی ناواقفیت کا کئی جگہ عذر کیا ہے کہ مجھے عربوں کی فتوحات اور اس کے بعد کے صحیح حالات کسی متداول و مشہور تاریخ (فارسی؟) میں نہ مل سکے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ عام انگریزی تاریخوں میں بھی جو حال میں لکھی گئی یا لکھی جارہی ہیں، اس بارے میں الفنسٹن ہی کی پیروی کی جاتی ہے اور ایلیٹ کی تاریخ کو بھی نظر انداز کردیا جاتا ہے جس نے کمال محنت سے متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے اجزا انگریزی میں ترجمہ کئے اور تاریخ سندھ پر خود ایک مستقل مضمون لکھکر جلد اول کے اخیر میں شامل کردیا ہے۔

القصہ تمیم کے بعد حکم اور پھر فاتح سندھ کا بیٹا عمر بن محمد قاسم ولایت سندھ پر مامور ہوا ان کے عہد میں بعض علاقے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے پھر ان کے قبضے میں آئے اور محفوظہ، منصورہ نامی

[1] تاریخ ہند مولفہ الفنسٹن، ص ۳۰۴

شہروں کی بنیاد پڑی[۱]۔ جس میں منصورہ نے بہت ترقی کی اور عرصے تک حکومت و تجارت کا مرکز رہا۔ محفوظہ کی جائے وقوع الیٹ کے قیاس کے مطابق وہاں سمجھنی چاہیے جہاں اب نصرپور آباد ہے اور منصورہ متعدد فتوحات کی یادگار میں[۲] قدیم "بہمن آباد" کے قریب بسایا گیا تھا جس کے آثار قدیمہ حال میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔

یعقوبی کی روایت کے بموجب عمر بن محمد کا جانشین یزید ابن عرار ہوا[۳] (غالباً ۱۲۶ھ / ۷۴۴ء)، تحفۃ الکرام اور تاریخ سندھ میں اس سے مختلف روایتیں بھی ملتی ہیں[۴] اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ان دنوں اسلامی سلطنت میں اُس انقلاب کا طوفان آگیا تھا جس نے آخرکار اموی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کردیا اور عباسیوں نے اُن کی جگہ لی[۵] (۱۳۲ھ / ۷۵۰ء) امن و امان ہونے کے بعد جب اس خاندان کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر المنصور نے سندھ کا والی ہشام بن عمر التغلبی کو مقرر کیا (۱۴۲ھ / ۷۵۹ء)[۶] تو مسلمانوں کی اس حکومت میں تازہ روح اور قوت پیدا ہوگئی۔

---

[۱] فتوح البلدان - ۴۴۴ - ادریسی نے ایس شہر کو غلطی سے عباسی خلیفہ المنصور کے نام سے موسوم اور اسی کے عہد حکومت کی تعمیر بتایا ہے۔

[۲] مولانا ندوی، تاریخ سندھ حصہ دوم ص ۲۸، [۳] ایضاً ص ۱۲ - [۴] تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۳۳، الیٹ ص ۴۴۳ [۵] الیٹ نے بلکہ خود بلاذری نے اس کا سنہ لکھنے میں غلطی کی ہے - دیکھو تاریخ سندھ مؤلفہ ندوی حصہ دوم ص (۶۰)

ہشام نے اندرونی شورشوں سے ملک کو پاک کردیا اور شمال میں کوہستان کابل اور کشمیر تک کے بعض علاقے فتح کئے جو اب تک مسلمانوں سے مغلوب نہ ہوئے تھے۔ اسیطرح جنوب میں اُس نے ایک بحری مہم گجرات کے مغربی ساحل پر روانہ کی اور "بردا"، کو فتح کیا۔ عربی تواریخ کی مجمل روایتوں سے اُس کی فتوحات کی حدود مُعیّن کرنا دشوار ہے لیکن خاص طور پر یاد رکھنے کے لایق بات جس کے بیان کرنے میں قدیم و جدید مؤرخ متفق ہیں، یہ ہے کہ ہشام کے زمانے میں اسلامی حکومت کو کمال استحکام حاصل ہوا اور ایک اعتبار سے یہی وقت ہے جس میں سندھ صیحح معنی میں "اسلامی ملک" سمجھا جانے لگا۔

سندھ کی آزاد ...ی ریاستیں

بعد کے تمام عرب والیوں کے نام اور حالات لکھنا سندھ کی مستقل تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ ان میں زیادہ شہرت شہر بیضا کے بانی عمران بن موسیٰ برمکی کو حاصل ہوئی جو ۲۱۱ھ ۸۲۶ء میں والی سندھ مقرر ہوا تھا۔ اس جگہ صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ آئندہ ایک صدی میں جب تک عباسی خلفاء کی قوت بنی رہی، سندھ کا وسیع صوبہ بھی اُن کے والیوں کے ماتحت اچھی حالت میں رہا۔ بے شبہ اس اثنا میں کبھی یمانی اور نزاری عربوں کی شرر انگیز عداوت نے اور کبھی فرقہ اسمٰعیلیہ اور قرامطہ کی خوفناک سازش و شورش نے

اس ملک کے امن و امان میں خلل ڈالا، بایں ہمہ مجموعی طور پر سندھی رعایا کی فلاح و سرسبزی میں فرق نہیں آیا بلکہ خلافت عباسیہ کی قوت میں زوال آنے کے بعد بھی جبکہ یہاں قریشی عربوں نے دو آزاد ریاستیں قائم کر لیں سندھ کی اندرونی حالت بہت اچھی رہی ۔ جیساکہ مؤرخ **مسعودی** اور بعد کے عرب جغرافیہ نویسوں کی تحریر سے ثابت ہے ۔ یہ مؤرخ ۳۰۳ھ مطابق ۹۱۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کو آیا تھا اور گو اس نے بعض روایتیں بلا تحقیقات اپنی کتاب میں لکھدی ہیں، لیکن اس کے زمانۂ سفر کے مشاہدات ہی ہمارے لئے کافی دلچسپ و کارآمد ہیں ۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی سندھ میں اس وقت **عبد اللہ** بن عُمر ہبّاری کی موروثی حکومت قائم تھی اور اسکا صدر مقام شہر منصورہ میں تھا ۔ شمالی سندھ کی ریاست زیادہ وسیع تھی ۔ دارالحکومت ملتانؔ اور **ابو اللُباب المُنبّہ** وہاں کا فرماں روا تھا ۔ ان قریشی النسب امیروں نے اپنی اپنی جگہ مستقل بادشاہی کے تمام لوازم مہیا کر رکھے تھے ۔ اور بظاہر اسی عیش پسندی اور جاہ پرستی نے انہیں کسی دوسری طرف جنگی پیش قدمی کی فرصت نہ دی ۔ دوسرے ان کی اور عام طور پر سندھ کے اکثر عرب مُتوطّنوں کی نسلیں اب مخلوط ہوگئی تھیں اور ایک عرصے تک اس مُلک میں رہنے کی وجہ سے

اُن کے وطنی تعلقات کبھی کے منقطع ہو چکے تھے؛ سیاسی آزادی نے یقیناً اس علیحدگی کو اور تقویت پہنچائی ہوگی اور عراق و عرب کی تازہ جماعتوں کے آتے رہنے کا سلسلہ بھی بند نہیں تو کم ضرور ہوگیا ہوگا۔ غرض یہ اور دیگر اسباب جن کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلانا دشوار ہے، ایسے پیش آئے کہ خلافت سے علیحدہ اور خود مختار ہونے کے بعد سندھ میں کوئی ایسی قوی سلطنت نہ بن سکی جیسی کہ ماوراء النہر یا شمالی ایران میں قائم ہوگئی تھی ملتان و منصورہ بھی مل کر کبھی ایک متحد اور مستحکم ریاست نہ بنی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد انہی کا مغربی علاقہ چھن کر مکران اور اس کے شمال میں چار علیحدہ ریاستیں قائم ہوگئی تھیں جن میں عباسی خلفا کے نام کے ساتھ آلِ بویہ کے سلاطین کا نام بھی خطبوں میں پڑھا جاتا تھا۔[۱]

یہ اصطخری اور ابن حوقل کے زمانۂ سیاحت یعنی چوتھی صدی ہجری کے وسط کے حالات ہیں۔ اسی صدی کے اواخر میں جب علامہ مقدسی نے ان ممالک کا سفر کیا تو خلفائے بغداد کا یہ مذہبی تعلق بھی منقطع ہوگیا تھا اور ملتان میں علانیہ فاطمی خلفائے مصر کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، یوں بھی اکثر مقامات

[۱] تاریخ سندھ مؤلفہ مولانا شرر۔ ص ۱۲۱

میں مذہب قرامطہ و اسمٰعیلیہ کا زور بڑھتا جاتا تھا[1] چنانچہ آخر میں تمام سندھ کی حکومت انہی کے قبضے میں آگئی اور سلطان محمود غزنوی کے حملے کے وقت (۴۱۶ھ) وہ اس ملک میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دونوں فرقے شیعہ مسلمانوں کی شاخیں ہیں لیکن اِن کے بعض گروہ جمہور مسلمانوں سے یا فرقۂ سنّت و الجماعت سے اتنے سخت مذہبی اور سیاسی اختلافات رکھتے تھے کہ انہیں مسلمان سمجھنا دشوار ہے۔ اسی لئے چوتھی صدی ہجری میں جب اسمٰعیلیوں نے افریقہ میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی اور ادھر عراق و حجاز میں قرامطہ نے ہنگامہ بپا کیا تو کچھ عرصے کے لئے اسلام اور اسلامی ممالک کی حالت نہایت مخدوش نظر آنے لگی تھی اور یہ محض تقدیری امر تھا کہ اسمٰعیلیوں میں پہلے باہمی نفاق ہوا اور پھر اُن کی سیاسی قوّت زائل ہوگئی[2]

غرض اسی مذہب کے لوگ تھے جنھوں نے غزنوی سلطنت میں ضعف آنے کے بعد پھر سندھ پر تسلط

---

[1] احسن التقاسیم ص ۴۸۱ و ۴۸۵۔

[2] اِن فرقوں کے عقائد اور سیاسی عروج و زوال کو، مولانا شرر نے اپنی تاریخ سندھ کے آخری حصّے میں بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اُردو میں بعض اور تاریخیں بھی ایسی ترجمہ یا تالیف ہوچکی ہیں جن میں ان مذہبی فرقوں کے جستہ جستہ حالات موجود ہیں۔

کرلیا اور انہی کے حکمران فرقے یا قبیلے کا نام تاریخ میں "سومرہ" ہے جن کو بعض فارسی مولفوں نے بے پروائی سے نومسلم راجپوت قرار دیا ہے اور بعد کے بعض انگریزوں نے خالص ہندو راجپوت لکھکر مسلمانوں کی حکومت ہی کو سندھ میں ختم کردیا ہے۔ لیکن اس بارے میں سب سے زیادہ قدر کے قابل مولانا شرر لکھنوی کی تحقیق ہے جنہوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ درحقیقت یہ لوگ یہودی النسل نومسلم تھے جنہوں نے عراق سے آکر سندھ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور قرمطی مذہب میں آنے کے بعد تقریباً ۴۴۵ھ سے ۷۵۲ھ تک اس ملک پر حکومت کرتے رہے[۱]۔

صاحب تحفۃ الکرام نے خاندان سومرہ کی حکومت کا خاتمہ خاندان سمہ کی حکومت کے سالِ آغاز ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء کو قرار دیا ہے اور سرہنری الیٹ بھی اسی سے اتفاق کرتے ہیں[۲]۔ "بیگ لارنامہ" اور "تاریخ طاہری" میں اس سے مختلف سنہ لکھے ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں سندھ پر سلاطین غور و دہلی کے حملے ہونے لگے تھے جن سے یہاں کی مقامی حکومت سالہا سال تک متزلزل ہوجاتی تھی بہرحال یہ انقلابِ حکومت آٹھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے اور اس بارے میں قریب قریب سب موَرخ

---

[۱] تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۱۳ وغیرہ۔ [۲] تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۴۹۔ الیٹ جلد اول ص ۲۹۵

متفق ہیں کہ خود سمہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں ہوا۔

جدید تحقیقات کی رُو سے یہ نیا خاندان جسکے فرمان روا **جام** کے ہندی لقب سے ملقب ہوتے تھے، نسلاً راجپوت اور دیناً مسلمان تھا۔ اور اسی کے عہدِ حکومت میں سندھ کے جنوبی علاقوں میں اسلام پھیلا اور وہاں کی بہت سی قومیں مسلمان ہوگئیں[1]۔ فارسی تاریخوں سے بھی اس خاندانکے بعض حکمرانوں کی دینداری اور اعلیٰ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ان میں ہمارے مؤرخ سب سے زیادہ **جام نظام الدین** کے مدّاح ہیں جسکا عرفِ عام ننده تھا اور جسکے طویل عہد میں (از ۸۶۶ھ تا ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء) اس خاندان کی حکومت ہر اعتبار سے اوجِ کمال پر پہنچ گئی تھی۔

سمہ خاندان کے اس فرمان روا کے بعد معلوم ہوتا ہے سندھ میں پہلے خانہ جنگی شروع ہوی اور پھر **شاہ بیگ ارغون** نے جو چنگیز خاں کی اولاد میں تھا، یہ ملک اِن سے چھین لیا۔ اسی کا بیٹا شاہ حسین ارغون تھا جسکے عہد حکومت میں ہمایوں پادشاہ کو ہندوستان چھوڑکر سندھ کے راستے ایران میں جانا پڑا تھا۔ وہ ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں لاولد فوت ہوا اور سندھ کی ریاست اسی کے ہم قوم سرداروں میں تقسیم ہوگئی جو **ترخان** کہلاتے ہیں۔ اِن کی خود مختاری کا خاتمہ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں ہوا جب کہ یہ تمام علاقہ مستقل طور پر سلطنتِ مغلیہ کا صوبہ بن گیا۔

[1] انسائکلو جلد ۲۵ ص ۳-۱۴۲۔ گزیٹیر جلد ۲۲ ص ۳۹۶۔ الیٹ ۴۹۶۔

باب دوم

سلطنتِ غزنی کا عہدِ فروغ

۱۔ شاہانِ غزنوی کا تعلق "ہندوستان" سے

ہندوستان کی تاریخ میں غزنی کے بادشاہوں کا ذکر آنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ سندھ و مکران میں عربوں کے جانشین ہوئے یا سلطان محمود نے اس ملک پر چند یورشیں کیں اور یہاں کے شہروں سے بہت سا مال لوٹ کر لے گیا۔ بلکہ درحقیقت یہ بادشاہ جنہیں مسلمان مورخ آلِ سبکتگین اور زیادہ تر سلاطین یمینیہ[۱] کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسلامی دنیا میں عام طور پر "ہندوستان" کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور خود انہیں اپنے ہندی

۱۔ دارالخلافت بغداد سے محمود کو "یمین الدولہ امین الملت" کا خطاب دیا گیا تھا (۳۸۹ھ)، نیز مسلمان بادشاہوں میں وہ سب سے پہلا شخص ہے جو سلطان کے لقب سے ملقب ہوا۔ (طبقات ناصری ص ۱۱، وغیرہ)

مقبوضات و فتوحات پر ناز تھا۔ صحیح معنی میں ان کا تسلّط آخر تک صرف پنجاب پر قائم رہا جس کا سلطان محمود کے زمانے میں (۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء) باضابطہ سلطنت سے الحاق کرلیا گیا تھا اور دربارِ غزنی (غزنہ یا غزنین) سے وہاں کے عُمّال و والی مقرر ہوکر آتے تھے۔[1] نیز محمود کے آخری جانشینوں نے اُسے اپنا ماوی و مستقر بنالیا تھا۔ لیکن ممالکِ اسلامی میں انہیں "ہندوستان" کا فرماں روا سمجھے جانیکے اسباب دوسرے تھے۔

"سلاطین ہند" کہلانیکی وجہ

لفظ ہندوستان سے بہت دن تک (بلکہ دکن میں اب تک) دریائے نربدا کے شمال کا وہ علاقہ مراد ہوتا تھا جو پنجاب، نیپال، مگدھ (یا بہار) اور بندھیل کھنڈ کے درمیان واقع ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہرش کی وسیع و قوی سلطنت اسی علاقہ میں قائم ہوئی پھر ڈھائی سو برس بعد راجہ بھوج نے اسی کی راج دھانی قنوج کو اپنا پائے تخت بنا کے بڑی قوت و نام آوری پائی تھی اور اسی وجہ سے شہر قنوج اُن دنوں "ہندوستان" کا دار السلطنت سمجھا جاتا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں نے یہی اطلاع اسلامی ممالک میں شائع کردی تھی۔ اور گو سلطان محمود کے حملوں کے وقت قنوج کی سلطنت گھٹتے گھٹتے چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی تاہم شہر قنوج کی شہرت میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ کیونکہ اس کی بجائے

[1] فرشتہ۔ ۳۰۔

نہ کوئی اور بڑی سلطنت قائم ہوئی نہ کسی دوسرے شہر نے وہ مرکزی حیثیت پائی، جو ڈیڑھ صدی پہلے قنوج کو حاصل تھی۔ پس ہندوستان کے قدامت پسند باشندوں کے نزدیک اگر کوئی شہر تمام ملکِ ہند کا پایۂ تخت کہلا سکتا تھا تو وہ یہی راجہ بھوج کی پرانی راج دھانی تھی جہاں سلطان محمود کے زمانے تک اُسی (پریہار) خاندان کے راجہ فرمانروائی کرتے تھے؛ مسلمان حملہ آوروں کا بھی خیال یہی تھا اور اسی لئے جب قنوج فتح ہوا (۱۰۱۸ء ۴۰۹ھ) اور اُسی یورش میں برن (بلند شہر)، متھرا وغیرہ اکثر علاقے فتح کر کے سلطان بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ غزنی پہنچا تو ان فتوحات کی خاص طور پر خوشی منائی گئی۔ خلیفۂ بغداد (القادر باللہ) کو بیش قیمت اور نادرِ روزگار تحائف کے ساتھ یہ اطلاع ملی تو وہاں بہت بڑا جلسہ کیا گیا اور خلیفۂ موصوف کے حکم سے تمام مساجد میں سلطان محمود کا مرسلہ فتح نامہ پڑھکر سنایا گیا اور "اُس روز بغداد میں ایسی خوشیاں منائی گئیں کہ معلوم ہوتا تھا آج مسلمانوں کی کسی عید کا دن ہے....."[۱]

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۔ الفنسٹن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے (صفحہ ۳۲۲)، کہ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ قنوج میں ایسی کونسی خصوصیت تھی جسکی بنا پر .... ہندو اور مسلمان دونوں قوم کے مصنف ایک سے ایک بڑھ کر اس کی مدح و ثنا اور اس کے دربار کی شوکت و احتشام کے بیان کرنے میں

اسی پر منحصر نہیں بلکہ بعد میں بھی یہ سلطان ہندوستان میں جب اور جدھر بڑھا ملک فتح دیا کم سے کم پامال، کرتا ہوا نکل گیا اور یہاں کے جس رئیس یا راجہ نے اس کا مقابلہ کیا شکست کھائی۔ ان وجوہ سے اگر محمود کے ہم عصر، جنہیں ہندوستان کے جغرافی عرض وطول کا صحیح علم نہ تھا اس تمام ملک کو اس کا مفتوحہ سمجھنے لگے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ دوسرے بیان کرتے ہیں کہ سلطان محمود نے فتح سومنات کے بعد گجرات کو مستقل یا کچھ عرصے کے لئے اپنا مستقر بنانے کا ارادہ کیا تھا[۱] اور گو اس ارادے پر ساتھ والوں کی حُبِّ وطن کی وجہ سے عمل نہ ہوسکا تاہم بجائے خود یہی واقعہ اسے ایک حد تک "ہندوستان کا بادشاہ" کہلانے کا مستحق بنا سکتا ہے[۲]

سلطان کو ہندوستان اور وہاں کے نفائس و نوادر سے جو دلچسپی تھی اس کی بعض مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر یہ روایت ہے کہ قنوج و متھرا کے حملے سے واپس آنے کے بعد جب اس نے غزنی میں ایک وسیع و رفیع مسجدِ جامع تیار کرائی اور اس کے ساتھ بہت بڑا مدرسہ اور کتب خانہ بنانیکا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۶۳) مبالغہ کرتے ہیں ...." مگر جیساکہ راقم الحروف نے اوپر لکھا، ہندوستان میں اگر اسوقت درحقیقت کوئی شہر مدح وثنا یا شہرت کے قابل تھا تو وہ قنوج تھا۔ ۱۲ [۱] روضۃ الصفا۔ ۸۱۔ فرشتہ ۳۳۔

حکم دیا اور نہایت بیش قیمت فرش و فانوس سے ان کی زینت بڑھائی، تو اِن عالیشان عمارات میں بہترین سنگ مرمر و رُخام ہندوستان کی کانوں سے منگاکر لگائے اور انکے متعلق جو باغ بنوایا اُس میں درخت بھی ہند و سندھ سے کر نصب کرائے ۔ انہیں وہاں بویا نہیں گیا تھا بلکہ پرورش یافتہ بڑے بڑے درخت یا پودے جو وزن و ضخامت میں ایک دوسرے کے برابر تھے بجنسہٖ اکھڑوا کر غزنی منگوالئے گئے تھے[1]۔

ہندی ہاتھی اور سپاہی

مگر غالباً ان سب باتوں سے بڑھکر جو شئے ہم عصر بادشاہوں پر سلطان کے "بادشاہِ ہند" ہونیکا رعب ڈالتی تھی وہ اس کے جنگی ہاتھی تھے ۔ ہندوستان کی یہ شاہانہ سواری دارالخلافت بغداد میں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ سندھ سے عرب والیوں اور ہند کے راجہ مہاراجوں نے بارہا خُلفائے بغداد کی خدمت میں یہ "تحفہ" ارسال کیا تھا ۔ لیکن سلطان محمود کے پاس اِن ہاتھیوں کی جتنی تعداد جمع ہوگئی تھی اتنی اب تک کسی مسلمان فرماں روا کے خیال میں بھی نہ گذری ہوگی بلکہ خود ہندو راجہ مہاراجوں میں بہت کم ہوں گے جن کے ہاں فیل خانۂ غزنی کے برابر ہاتھی موجود ہوں کیونکہ لُوٹ اور خراج میں صد ہا ہاتھی سلطان کے قبضے میں آجاتے تھے اور غالباً ذاتی

---

[1] روضتہ الصفا ۴۲ ۔ فرشتہ ۳۰ ۔ اسی مسجد کو "عروس فلک" کہتے تھے اور اس کے کتب خانے میں بے شمار اور نادرِ روزگار کتابیں جمع کی گئی تھیں ۔

طور پر بھی وہ اس "مہیب آلۂ جنگ" کا بہت قدردان تھا چنانچہ فارسی تاریخوں میں یہ قصہ محفوظ ہے کہ جب حملۂ قنوج کے زمانے میں سلطان نے قلعہ منج[1] کو فتح کیا تو گو وہاں کا راجہ چندرائے بچ کر نکل گیا لیکن اسکا سب سے بڑا ہاتھی جو ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور جسے سلطان بڑی سے بڑی قیمت پر خریدنا چاہتا تھا اور راجہ نے اسے دینے سے انکار کردیا تھا، ایک رات از خود شاہی لشکر میں آگیا۔ سلطان کو بے حد خوشی ہوی اور ہاتھی "خداداد" کے نام سے فیل خانے میں داخل کرلیا گیا[2]۔ اُسے اپنے "صاحبِ فیل" ہونے پر جو ناز تھا اس کا اظہار اس مشہور قصے سے بھی ہوتا ہے کہ جب خلیفہ بغداد نے اسے سمرقند پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی تو سلطان محمود نے غضب ناک ہوکر ایلچی سے کہا کہ کیا تمہاری یہ منشا ہے کہ میں ایک ہزار ہاتھی سے بغداد پر فوج کشی کروں اور اُسے پامال و خراب کرکے اس کا ملبہ ہاتھیوں پر لاد کر غزنی اٹھوا منگاؤں؟ القادر باللہ نے اس کے جواب میں جو مراسلہ بھیجا اس میں بسم اللہ کے بعد صرف ایک سطر تھی اور اس میں بھی صرف ال م ال م یہی تین حرف الگ الگ لکھکر حمد و نعت پر خط کو ختم کردیا تھا۔ ان حروف مقطعات کو

---

[1] منج، سرہنری الیٹ کے قیاس کے مطابق سرحد بندھیل کھنڈ کے قریب کا مقام تھا۔ (جلد دوم ص ۴۶۰)۔ [2] فرشتہ صفحہ ۳۰۔ طبقات اکبری۔ الیٹ جلد دوم صفحہ ۴۶۱۔

دیکھکر سب حیران رہ گئے اور دیرتک مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ایک شخص نے بڑھکر عرض کی کہ شاید یہ سورۂ "الم ترکیف" کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے "اصحاب فیل" کی تباہی کا ذکر کیا ہے! یہ سنتے ہی سلطان دم بخود رہ گیا اور شدتِ خوف سے اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ ایلچی سے بہت کچھ معذرت کی اور تحائفِ گران بہا کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عریضۂ ندامت و افسوس لکھکر بغداد بھیجا۔

اُس زمانے کی مشہور و مستند تاریخ یمینی میں بھی بعض جگہ سلطان کی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کا ذکر آتا ہے[1]۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ہند و ایران و ترکستان کے معرکوں میں بھی سلطان کا ساتھ دیتے تھے۔ باقی غیر سپاہی پیشہ ہندیوں کی تو ہندوستان کے ساتویں آٹھویں حملے کے بعد ہی غزنی میں وہ کثرت ہوگئی تھی کہ فرشتہ کے الفاظ میں "غزنین را دراں سال از بلاد ہندوستان می شمردند"[2] (سنہ ۱۰۱۱ء)

خلاصہ یہ ہے کہ گو سلطان محمود نے صحیح معنی میں تمام ہندوستان کو بلکہ شمالی ہندوستان کو بھی فتح نہیں کیا نہ اسکا مستقل قبضہ رکھا، تاہم سنہ ۹۹۴ء سے سنہ ۱۰۲۷ء تک اس ملک پر چودہ پندرہ یا کم سے کم بارہ حملے کئے وہ اپنا غیر معمولی

---

[1] اقتباس از تاریخ یمینی - الیٹ جلد دوم ۳۲

[2] فرشتہ - صفحہ ۲۸ -

اثر ڈالے بغیر نہ رہے ۔ اوّل تو سلطان کی توجّہ سے ممالک سندھ میں، جہاں عربوں کے زوال اور قرامطہ کی مُلحدانہ بے پروائی سے اسلام کی قوّت نہایت ضعیف ہوگئی تھی، مسلمانوں کے قدم پھر جم گئے ۔ دوسرے پنجاب کا وسیع و سرسبز علاقہ مستقل طور پر اُن کی ملکیت بن گیا اور یہ وہ صوبہ تھا کہ ہندوستان کے باہر کے تمام مقبوضات نکل جانے کے بعد بھی محمود کی اولاد کے قبضے میں رہا اور خاندانِ یمینیہ کا چراغ اسی کے پائے تخت لاہور میں گُل ہوا۔ مگر ان سب سے بڑھکر یہ کہ محمود ہی کے حملوں نے مسلمانوں کو آئندہ تمام ہندوستان فتح کرنے کا راستہ دکھایا اور گو خود اس کی اولاد اپنے اور جھگڑوں کی وجہ سے یہ کام نہ کرسکی لیکن اکثر اس بات کی آرزو مند رہی ۔ حتّی کہ اُن سے زیادہ اولوالعزم سپاہی میدانِ عمل میں داخل ہوے جنھوں نے محمود کے خوابِ پریشاں کو عالمِ خارج میں سچّا کردکھایا۔

ہندوستان پر سلطان محمود کے مذکورۂ بالا حملوں کا مجمل احوال اس زمانے کی عام انگریزی اردو تاریخوں میں موجود ہے ان کے مختصر واقعات اور سنین اس باب کے آخر میں بطریق ضمیمہ یکجا لکھ دئے گئے ہیں۔ زیادہ مفصل اور محققانہ بیان کی ہماری کتاب میں گنجایش نہیں۔ دوسرے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ترتیب زمانی کے

ساتھ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ غوریوں کے آنے تک، ہندوستان سے شاہانِ غزنی کے کیا تعلقات رہے تاکہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا سلسلہ، جو اکثر انگریزی تاریخوں میں جابجا گسستہ نظر آتا ہے، حتی الامکان ٹوٹنے نہ پائے۔

مسعود کی تخت نشینی

تینتیس برس کی فاتحانہ حکومت کے بعد سلطان محمود نے ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء میں وفات پائی اور غزنی کی چھوٹی سی ریاست کو اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت بنا گیا جس میں غزنی، زابلستان، خراسان، خوارزم، چغانی طبرستان، اصفہان، کرمان، مکران، کیچ، سندھ (تا گجرات)، پنجاب، اور خراج گزاروں کی حیثیت سے قنوج، و کالنجر کے علاقے شامل تھے[1]۔ دنیاوی جاہ وجلال اور دولت و مال کے ساتھ خدا نے اسے بیٹے بھی سات[2] عنایت کئے تھے لیکن ان میں محمد اور مسعود صرف دو بھائیوں کو وراثتِ تخت کا دعویٰ تھا اور انہی کی طرف داری نے امرائے غزنی کے دو گروہ کر دئے تھے۔ شہزادہ محمد نہایت خلیق، علم دوست اور باپ کا چاہیتا بیٹا تھا اور سلطان محمود اسی کو وارث

---

[1] طبقات ناصری مترجمہ میجر راورٹی حاشیہ صفحہ ۸۸۔

[2] الفنسٹن صاحب نے تاریخ فرشتہ میں دو بیٹوں کا حال دیکھکر محض اپنے قیاس کی بنا پر لکھدیا ہے (صفحہ ۳۴۳) کہ سلطان محمود کے صرف دو بیٹے تھے!

بنانا چاہتا تھا[1] لیکن اکثر امرا اور اہل ملک شہزادہ مسعود کے گرویدہ تھے جو نہایت قوی ہیکل، دریا دل، سپاہی مزاج آدمی تھا اور باپ کی زندگی میں کئی معرکے سر کر چکا تھا۔ اوّل اوّل اس نے ممالک عراق و جبال و طبرستان لے کر بھائی سے مصالحت کرنی چاہی تھی۔ بہت سے درباری بھی خانہ جنگی اور باہمی فساد سے بچنے کی صلاح دے رہے تھے لیکن سلطان محمد اپنی بادشاہی کا اعلان کر چکا تھا سلطنت کی تقسیم اسے گوارا نہ تھی۔ وہ بزور شمشیر مسعود کو مطیع کرنے پر آمادہ ہوا اور جن اُمرا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اُن کے تعاقب میں اس نے اپنے ایک ہندو امیر سوبند رائے کو ہندی فوج دیکر آگے روانہ کیا اور خود وسیع پیمانے پر بھائی سے جنگ کی تیاریاں کیں[1] مگر سوبندرائے منحرف امیروں سے شکست کھا کے مارا گیا[2] اور کچھ دن بعد خود سلطان محمد کو اہل دربار نے حراست میں لے لیا۔ سلطان مسعود کی بادشاہی متفقہ طور پر تسلیم کرلی گئی[1] (۴۲۱ھ)

هندو عہدہ دار

سوندر یا سوبندرائے پر منحصر نہیں بلکہ اس عہد کے مشہور مورخ ابو الفضل بیہقی (ولادت ۳۸۶ھ وفات

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۳ - فرشتہ صفحہ ۴۰ وغیرہ

[2] فرشتہ صفحہ ۴۰ - بیہقی نے "سوبندرائے" کی بجائے اس ہندو سپہ سالار کا نام "سوندر" بتایا ہے تاریخ بیہقی (صفحہ ۵۰۲)۔

۲۰۴۴ھ، کی تاریخ میں ہمیں کئی جگہ دربار غزنی کے ہندو عہدہ داروں اور سپاہیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں سب سے معزز **تلک** نامی ایک ہندو حجام تھا جو اپنی ہوشیاری، خوش بیانی اور قابلیت کی وجہ سے خواجہ احمد بن حسن میمندی کا دبیر بن گیا تھا اور آخر میں ہندوستان کے باغی سپہ سالار **احمد نیال تگیں** کے مقابلے کے لئے خلعتِ سپہ سالاری پاکر ہندوستان بھیجا گیا!

(۲۲۶ھ) الیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ یہی شخص ہے جسے صاحبِ طبقات اکبری نے "ملک بن جے سین" کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورخ اسے نو مسلم ہندو سمجھتا تھا[۱] لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ کتابت کی غلطی ہے اور غالباً اسی کو بگاڑ کر فرشتہ نے "تولک بن حسین" کر دیا ہے[۲]

بہر حال، ہمیں بعد کی تاریخوں کی بجائے تا امکان خود بیہقی سے استفادہ کرنا چاہیئے جس کی دلچسپ تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے اور گو اس کے بعض اجزا ایسے ضائع ہوئے کہ اب اُن کا پتہ نہیں چلتا تاہم جو کچھ موجود ہے وہی یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ اُس زمانے میں ہند اور اہلِ ہند کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور دربارِ غزنی کے

---

[۱] الیٹ جلد دوم ۶۰۔ [۲] فرشتہ صفحہ ۴۲۔

وزیر اعظم کو اس بات کی ضرورت پڑنے لگی تھی کہ ہندوؤں سے گفتگو یا معاملات کرنے کے لئے ایک ہندو مترجم کو اپنی سرکار میں ملازم رکھے[1]۔

ہند پر حملے

اس کے علاوہ سلطان محمود کے پیہم حملوں نے اہل غزنی کو ہندوستان کا جو راستہ دکھا دیا تھا اُسے وہ بھولے نہ تھے اور گو مسعود کو اپنے شمالی ہمسایوں کی لڑائیوں سے بہت کم فرصت ملی تاہم اس کے عہد میں ہندوستان پر دو حملے ہوئے۔ ان میں پہلا حملہ اسی احمد نیالتگین نے کیا تھا جس کی بغاوت کا ذکر اُوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ دریائے گنگا کے کنارے کنارے شہر بنارس تک بڑھا (۴۲۴ھ - ۱۰۳۳ء) جہاں اب تک کسی مسلمان کے قدم نہ پہنچے تھے، اور اس دولتمند شہر کو لوٹ کر واپس ہوگیا[2]۔ مگر اس حملے کو محض ایک اتفاقانہ تاخت سمجھنا چاہئے جس کا کوئی مستقل نتیجہ نہیں نکلا۔ دوسری مرتبہ خود سلطان مسعود نے موجودہ صوبۂ پنجاب کے جنوب مشرقی حصے پر فوج کشی کی اور قلعۂ ہانسی اور سون پت کو فتح کیا (۴۲۹ھ - ۱۰۳۷ء)[3] اور فرشتہ کی روایت

۱۔ بیہقی صفحہ ۵۰۳ - ۲۔ بیہقی صفحہ ۴۹۷ - ایلیٹ جلد دوم صفحہ ۵۸ راورٹی ترجمہ طبقات ناصری حاشیہ صفحہ ۹۳ - ۳۔ بیہقی صفحہ ۶۶۵ - فرشتہ اسے ۴۲۶ھ کا واقعہ بتاتا ہے (صفحہ ۴۲) اور طبقات ناصری کا حوالہ دیتا ہے مگر اس تاریخ کے موجودہ نسخوں میں کہیں یہ عبارت نہیں ملتی - دیکھو راورٹی کا ترجمہ طبقاتِ ناصری حاشیہ صفحہ ۹۳۔

کے بموجب اپنے فرزند ابو المجدود کو یہاں کا عامل بنا کر خود غزنی کو مراجعت کی۔
اس کا جلد سے جلد غزنی پہنچنا ضروری تھا، بلکہ وہاں پہنچکر ہندوستان آنے پر وہ پشیمان ہوا کیونکہ اس عرصے میں سلجوقی ترکوں نے سلطنت کے بہت سے علاقے پامال کر دیئے تھے اور سیلاب کی طرح خراسان و رتے تک بڑھے چلے آتے تھے! سلطان کے آئندہ تین سال انہی کے ساتھ کشمکش میں گزرے اور کئی مرتبہ سخت خوں ریز لڑائیاں ہوئیں، ان لڑائیوں کے حالات ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں البتّہ خاص طور پر لکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ آخر میں جب مسعود کو خراسان میں شکستِ فاحش نصیب ہوی اور وہ نہایت شکستہ دل ہوکر غزنی واپس آیا تو اس نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اب ہندوستان جاکر نئے سرے سے جنگی تیاریاں کرنی چاہئیں، چنانچہ تمام قیمتی سازوسامان اور زروجواہرات اونٹوں پر لدواکر ہندوستان کی جانب روانہ ہوگیا (۱۰۴۲ء)۔

مسعود کی گرفتاری

غزنی کے اُمرا سلطان کے اس ارادے کے خلاف تھے کیونکہ اس اہتمام کے ساتھ پائے تخت کو خیرباد کہنا ترکِ وطن کا مرادف تھا اور بیہقی کا مفصل بیان[1] پڑھنے سے بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ شکست خوردہ سلطان کو

[1] تاریخ بیہقی صفحات ۸۲۷ تا ۸۳۲۔

افغانستان میں اپنا مستقبل کچھ خوشگوار نظر نہ آتا تھا اور عجب نہ تھا کہ آلِ سُبک تگین کا آیندہ مستقر کوہستانِ سلیمان کے مشرق میں قائم ہوجائے[1] لیکن تقدیر کو یہ انقلاب ابھی منظور نہ تھا۔ سلطان مسعود لاہور کے راستے ہی میں تھا کہ اُس کے غلاموں نے بغاوت پر کمر باندھی اور تمام خزانہ لوٹ کر سلطان کو حراست میں لے لیا[1]۔
انھوں نے اس کے نابینا بھائی امیر محمد کو قید سے نکال کر دوبارہ تخت پر بٹھا دیا تھا اور چند روز بعد مسعود کو قتل بھی کردیا گیا تھا لیکن اس کے بیٹے مودود کو اس غداری کی اطلاع ہوی تو نہایت غضب ناک ہوا اور اُمرائے دربار نے بھی فوراً اس کی بادشاہی کا اعلان کرکے امیر محمد پر فوج کشی کی۔ اس موقع پر یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان کے اُمرا اس کشمکش میں امیر محمد کے طرفدار تھے[1]۔ لیکن لڑائی میں مودود کو فتح ہوی (۴۳۳ھ ۱۰۴۲ء) اور اس نے باپ کے انتقام میں امیر محمد، اس کی اولاد اور بہت سے باغی غلاموں کو چن چن کر قتل کرادیا[1]۔
تاریخ فرشتہ کی روایت[2] کے بموجب مودود کو اس فتح کے بعد سب سے زیادہ خوف اپنے چھوٹے بھائی مجدود سے تھا جو پہلے باپ کی جانب سے ہانسی کا

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۵۔ [2] فرشتہ صفحہ ۴۴۔

صوبہ دار مقرر ہوا اور مذکورۂ بالا خانہ جنگی کے زمانے میں بہ اطمینان تمام پنجاب پر مسلّط ہوگیا تھا۔ بلکہ قلعۂ ہانسی کو اپنا جنگی مستقر بناکے اب دہلی پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مودود نے اس کے خلاف لشکرکشی کی اور ادھر سے مجدود بہ عجلت لاہور پہنچ کر مقابلے پر آمادہ تھا کہ مرگِ ناگہاں نے اس کا اور آیندہ جنگ کا خاتمہ کردیا اور صوبۂ پنجاب لڑے بھڑے بغیر مودود کے قبضے میں آگیا۔

مگر مودود کو اپنے سلجوقی ہمسایوں کی لڑائیوں سے فرصت نہ تھی اور پنجاب کے مسلمان عُمّال باہمی نفاق و شقاق میں مبتلا ہوگئے تھے۔ دہلی کے راجہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور نہ صرف ہانسی اور تھانیسر بلکہ نگرکوٹ کا قلعہ بھی مسلمانوں سے چھین لیا اور دربار غزنی کو نو برس تک اس طرف توجہ کرنے کی مہلت میسر نہ آئی۔ البتہ ۴۴۴ھ میں جب سلطنت سلطان عبدالرشید کے قبضے میں آئی اور ازسرِ نو انتظام درست ہوا تو اس کے مشہور سپہ سالار نوشتگین نے پنجاب پر لشکرکشی کی اور نگرکوٹ کو دوبارہ چھین لیا۔ (۴۴۴ھ)

سلطان ابراہیم

اس واقعے کے تقریباً تیس برس بعد آلِ سبکتگین کے دسویں بادشاہ سلطان ابراہیم بن مسعود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور موجودہ سہارن پور کے

ضلع تک بڑھا جہاں اُن دنوں نہایت خوفناک جنگل کھڑے تھے اس نے بہت سے قلعے فتح کئے اور آیندہ طغانگین کی یورش کا حال پڑھکر قیاس ہوتا ہے کہ شاید یہ علاقہ مستقل طور پر سلطنت غزنوی میں شامل کرلیا گیا ہوگا کہ اس سپہ سالار کو ہندوستان میں اتنی دُور تک بڑھنے میں آسانی ہوی "جہاں سلطان محمود کے سوا اور کوئی اسلامی بادشاہ نہ پہنچ سکا تھا" [1] (۴۹۳ھ؟)

اسی طرح آخری شاہانِ غزنوی کے زمانے میں بھی جابجا ہندوستان کا ذکر آتا ہے بلکہ جس قدر اُن کی سلطنت ضعیف ہوتی گئی اور بیرونِ افغانستان کے شمالی علاقے اُن کے حریف سلجوقیوں کے قبضے میں آتے گئے اسی قدر اُن کا تعلق اپنے ہندی مقبوضات کے ساتھ قوی ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۵۴۵ھ میں علاءالدین حاکم غور نے بہرام شاہ غزنوی کو کئی شکستیں دیکر پائے تخت پر قبضہ کرلیا اور شہر میں آگ لگا دی۔[2]

بہرام کے جانشین، خسرو شاہ کے زمانے میں غز نامی ایک ترکی قبیلے نے ملک سنجر سلجوقی سے بغاوت کی اور

---

[1] طبقات ناصری - ۲۳ - فرشتہ - ۸۸ مگر یہ تصریح کسی تاریخ میں ہمیں نہ ملی کہ وہ کس مقام تک بڑھ آیا تھا۔

[2] ان واقعات کے سنین میں بہت اختلافات ہیں جن پر راورٹی نے نہایت محققانہ بحث کی ہے (ملاحظہ ہو اس کا ترجمہ طبقات ناصری - حاشیہ صفحہ ۱۱۲)

اسے گرفتار کرکے خود تمام خراسان پر مسلط ہو گئے اسی سلسلے میں انہوں نے پایۂ تخت غزنی پر حملہ کیا اور "محمود اعظم" کا جانشین جو غالباً دوبارہ غزنی آ گیا تھا، اس بے سر گروہ سے بھی مقابلہ نہ کر سکا اور اپنا قدیم پایۂ تخت چھوڑ کر پنجاب میں ہٹ آیا۔ اس قبیلے کو بعد میں غوریوں نے غزنی سے نکال دیا تھا لیکن غزنی کے اصلی وارثوں کو آئندہ اپنے وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی اور خسرو شاہ نے مجبوراً لاہور میں جسے قدیم مورخ لوہور لکھتے ہیں، سکونت اختیار کرلی اور سات آٹھ برس حکومت کرکے اسی ہندی شہر میں فوت ہوا۔ (۵۵۵ھ)

مذکورۂ بالا واقعات نے شاہان یمینیہ کو گویا خالص ہندوستانی فرماں روا بنا دیا تھا اور آیندہ اسی ملک میں اپنی سلطنت بڑھانے کا انہیں بہت اچھا موقع مل گیا تھا۔ لیکن اول اوّل اُن کی حسرت آلود نگاہیں انہیں افغانی پہاڑوں کی طرف لگی رہیں جہاں اُن کے اجداد نے قریب قریب دو صدی تک اس شان و شوکت کے ساتھ فرماں روائی کی تھی۔ پھر ادھر سے مایوسی ہوئی تو شاہانِ غور نے انہیں خود پنجاب میں اطمینان سے نہ بیٹھنے دیا اور سلطان معزالدین یا شہاب الدین غوری نے چند حملوں میں پیشاور، ملتان اور سندھ فتح کرکے خاص لاہور پر فوج کشی کی۔ سلطان **خسرو ملک** بن خسرو شاہ قلعہ بند ہوگیا تھا اس لئے پہلی مرتبہ شہاب الدین

صرف اس کے بیٹے کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لے آیا اور دو برس بعد پھر بُھلاوا دے کے یکایک لاہور پہنچ گیا۔ بے خبر خسرو سے مدافعت نہ ہوسکی۔ وہ اور اُس کا تمام خاندان گرفتار کرلیا گیا اور اسی سال ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء میں، آلِ سبکتگین کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

ع بقا، بقائے خدایست و ملک، مُلکِ خدائے!

۲۔ طرزِ بادشاہی۔

مُلکِ ہندوستان سے شاہانِ غزنوی کے سیاسی تعلقات کا مجمل احوال اوپر ہماری نظر سے گزرا۔ لیکن اُن کے سب سے قوی اور تاریخی تعلّق کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے کیونکہ ہندوستان میں جو اسلامی سلطنت آئندہ قائم ہوی اس میں "بادشاہی" کا طریقہ عرصے تک وہی رہا جو اوّل اوّل غزنی میں جاری ہوا تھا۔ اس طرزِ حکومت کو ہم "تُرک شاہی" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں جس میں بادشاہ کے انتخاب اور بڑے بڑے کاموں کے انصرام میں ایک حد تک تُرک سرداران فوج کی رائے کا دخل ہوتا تھا، اور موروثی ہوجانے کے بعد بھی مطلق العنان بادشاہی کی پوری شان پیدا نہیں ہوی تھی، گو امیر سبُکتگین کے بعد غزنی کی خود مختار سلطنت خاص اس کے خاندان کی میراث بن گئی تھی تاہم اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ اس

خاندان کے بہت کم افراد ایسے تھے جو اُمرائے دربار کی اتفاق رائے کے بغیر تخت نشین ہوئے ہوں۔[1]

ایک اعتبار سے یہ طرزِ حکومت اُسی آئین کی بگڑی ہوئی صورت تھی جسے دینِ اسلام نے عرب میں رواج دیا تھا لیکن غزنی میں محض وقتی ضرورت و حالات نے اسے پیدا کیا تھا اور اس کا کوئی مستقل قانون یا دستورالعمل نہ تھا لہٰذا جب وہاں کے فرماں رواؤں کی قوت بڑھی تو اُن کی بادشاہی موروثی ہوگئی اور اُن کے درباروں میں اُس مطلق العنانی کے جلوے بھی نظر آنے لگے جو ایرانی تمدن اختیار کرنے کی بدولت خود بغداد کے عرب خلفاء میں پیدا ہوگئی تھی۔[1]

الپتگین

بہرحال، اس حکومت کی بنیاد امیر الپتگین ترک کے زمانے میں پڑی (۳۲۲ھ ۹۳۴ء) جو سامانی بادشاہوں کا غلام تھا۔ خراسان و ہرات کے جنوب مشرق میں غزنی، مکران، اور سندھ کے یہ سب علاقے خلافتِ بغداد کے زوال کے وقت سے آلِ سامان کے زیرِ اثر آگئے تھے اگرچہ یہاں جو اسلامی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں اُن کے موروثی رئیسوں پر سامانیوں کی حکومت برائے نام تھی اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں قریب قریب خود مختار تھے؛ یہی سبب

[1] اس کی مثال کے واسطے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحات ۱۲، ۱۶، ۱۸، ۲۰ نیز راورٹی کا ترجمہ۔ حاشیہ صفحہ ۹۷۔ اور منتخب التواریخ، ملا بداونی جلد اول صفحات ۲۱، ۳۰، ۳۳، ۳۴۔

ہوا کہ جب الپتگین، منصور سامانی (شاہ بخارا) کے عتاب سے ڈر کر غزنی آیا اور یہاں کے رئیس یا والی کو شکست دیکر خود اس علاقے پر قابض ہوگیا تو دربارِ بخارا نے بھی اس کو وہاں کا والی تسلیم کرلیا اور وہ برائے نام اُن کے باج گزار کی حیثیت سے تیس برس[1] فرماں روائی کرتا رہا (۳۲۲ھ / ۹۳۳ء تا ۳۵۲ھ / ۹۶۲ء)

اس کے جانشین

الپتگین کے بیٹے اسحٰق کو اپنے باپ کی جانشینی کے لئے حریفوں سے لڑنا پڑا اور جب تک دربارِ بخارا سے اجازت اور مدد نہ ملی وہ غزنی کی حکومت حاصل نہ کرسکا۔ ان کوششوں میں اس کے باپ کا غلام سبکتگین اس کا شریکِ حال اور رفیق تھا لیکن اسحٰق کی وفات کے بعد بعض یورپی مؤرخوں نے سبکتگین کو اس کا جانشین قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے الپتگین کے دو غلاموں نے حکومت کی: پہلا والی امیر بلکاتگین ہوا جو اُس عہد کا مشہور سپاہی اور نامی سپہ سالار تھا اور دوسرا امیر پیرے جس کی ہندوستان والوں سے بھی ایک لڑائی کا حال ملتا ہے۔ طبقاتِ ناصری کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ بلکاتگین اتفاقِ آرا سے

[1] یعنی ۳۵۲ھ تک (ملاحظہ ہو ترجمہ راورٹی حاشیہ صفحہ ۱۷) الفنسٹن، ٹامس اور خود بعض فارسی مؤرخوں نے اس کے زمانۂ حکومت اور دیگر حالات کے متعلق سخت غلطیاں کی ہیں۔

حاکم بنایا گیا تھا (۳۵۵ھ) مگر پیرے ایسا ہر دلعزیز نہ تھا اور بلکاتگیں کی وفات (۳۶۲ھ) کے چار پانچ سال کے اندر ہی لوگ اس کی فتنہ پردازی سے ناراض ہو گئے اور اُسے معزول کر کے انھوں نے امارتِ غزنی کے منصب پر امیر سبکتگیں کو منتخب کیا[1] (۳۶۶ھ)

ان واقعات کو پڑھکر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ غزنی کی چھوٹی سی ریاست میں اب تک "اولی گار کی" یا حکومتِ خواص قائم تھی جسے ہم نے ترک شاہی کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس کے بانی اور حکومت کے حصہ دار تُرک تھے، لیکن سُبکتگیں کے زمانے میں اِدھر تو سلطنت کی حدود وسیع ہوئیں اور اُدھر جنگی قوت اور ذاتی قابلیت نے اس فرماں روا کو پہلے سے کہیں زیادہ قوی کر دیا۔ اُس نے ہرات، مکران اور لمغان کے بعض اضلاع بزورِ شمشیر فتح کئے اور افغانوں کو جنگی تربیت دیکر اتنی زبردست فوج مرتب کر لی کہ خود شاہِ بخارا کو اس کی مدد کی ضرورت ہوی اور حفاظت کے لئے اس نے ملک خراسان کو بھی افواجِ غزنی کی تحویل میں دے دیا۔ امیر محمود بن سُبکتگیں ان افواج کا سپہ سالار تھا اور مذکورہ خدمات ہی کے صلے میں دربار بخارا نے اُسے "سیف الدولہ" کا اور اس کے باپ کو "ناصر الدین"

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۷۔ ترجمہ راورٹی حواشی صفحات ۱، تا ۳،

کا خطاب عطا کیا تھا (۳۸۴ھ)

اب غزنی کے مستقل اور خود مختار سلطنت بننے میں کچھ کسر نہ رہی تھی اور جب امیر سبکتگین نے وفات پائی (۳۸۷ھ/۹۹۷ء) تو وراثت کے لئے ہر شخص کی نظر اسی کے بیٹوں پر پڑتی تھی جن میں سے تین خود باپ کی زندگی میں بڑے بڑے معرکوں میں شریک رہے تھے مختصر یہ کہ سبکتگین ہی وہ شخص ہے جس سے غزنی میں خود مختار و موروثی بادشاہی کا آغاز ہوا اور اس کے لایق بیٹے کے زمانے میں وہ بدرجۂ غائت مستحکم ہوگئی تھی۔

لوازم مطلق العنانی

مزید براں، سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اس قسم کے تمام اسباب و لوازم جمع ہو گئے تھے جو جمہوریہ فرانس کے ایک سپہ سالار تک کو مطلق العنان بادشاہ بننے کی طمع دلا سکتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا فاتح اور سب سے قوی اور دولت مند فرماں روا تھا جیحوں و دجلہ تک اس کی حکومت کی حدیں پہنچ گئی تھیں۔ سندھ و پنجاب کی مالگزاری براہ راست اس کے خزانے میں وصول ہوتی تھی اور اُس دولت کا حساب لگانا محال ہے جو اسے ہندوستان کے حملوں میں خراج و غنائم کی صورت میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ سُن کر کہ آلِ سامان کے خزانے میں جواہرات کی مقدار سات رطل[1] سے زیادہ

[1] رطل وزن میں غالباً ۶ چھٹانک کے قریب ہوتا تھا۔

نہ تھی، وہ اگر سجدۂ شکر بجالایا تو کچھ بیجا نہ تھا کیونکہ خود اس کے خزانے میں سو رطل سے زیادہ وزن کے بے نظیر جواہر موجود تھے[1]۔

صاحب روضۃ الصفا نے اس کے تزک و احتشام کی نہایت دلچسپ تصویر الفاظ میں کھینچی ہے۔ یہ ایک مجلسِ مصالحت کا بیان ہے جسے سلطان محمود نے ایلک خان اور اس کے بھائی کی نزاع کا فیصلہ کرنے کی غرض سے منعقد کیا تھا۔ مجلس کے راستے پر دو ہزار غلام بیش قیمت لباس پہنے صف بستہ کھڑے تھے اور اُن کے آگے پانچ سو غُلامانِ خاصہ کی صف تھی جن کی سنہری پیٹیاں جواہرات سے مرصّع تھیں۔ تختِ شاہی کے گرد، حاجبوں کے گروہ میں ہر شخص قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے اشارۂ سلطانی کا منتظر تھا۔ میدان میں سات سو کوہ پیکر ہاتھی کھڑے جھوم رہے تھے اور اُن کی بیش بہا جھولوں پر نفیس اسلحہ اور مختلف قسم کا قیمتی اسباب آراستہ کیا تھا۔ میدان میں پیادہ و سوار "زرہ ہائے داود در بر وخود ہائے فرنگی بر سر"، تلواریں کھینچے، نیزے تانے کھڑے تھے کہ بہ مکان میں

[1] روضۃ الصفا ۸۹ - فرشتہ ۳۶

سفیروں کو کھانا کھلایا گیا، وہ جواہرات کی چمک سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے تکلّفات کو دیکھکر لوگ حیران رہ گئے۔ سب نے متفق اللسان اقرار کیا کہ کسی زمانے میں بھی ایسے نفائس "اکاسرۂ عجم، قیاصرۂ روم، حکّامِ عرب و رایانِ ہند" کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔[1]

طبقاتِ ناصری کی مختصر تحریر میں بھی سلطان کی وسعتِ سلطنت اور درباری شان و شوکت کی شہادت محفوظ ہے کہ دربارِ عام کے روز تختِ شاہی کے گرد چار ہزار کمسن غلاموں کی صف ایستادہ رہتی تھی جن کے ہاتھوں میں سیم و طلائے خالص کے گرز (یا عصا) اور سروں پر نہایت بیش قیمت کلاہیں ہوتی تھیں۔ اسی کتاب کے مؤلف کا بیان ہے کہ شاہی فیل خانے میں ڈھائی ہزار (جنگی) ہاتھی تھے[2] اور گو فوج کی صحیح تعداد نہیں معلوم نہ ہوسکی لیکن قنوج کی فوج کشی کے وقت ایک لاکھ سوارانِ خاصہ لشکرِ سلطانی کے تنخواہ دار ملازم تھے اور بیس ہزار جنگجو ماوراء النہر کی طرف سے آکر شریکِ فوج ہوگئے تھے۔ ایسی سپاہ کو فوج مطوّعہ (یعنی "والن ٹیرز") کہتے تھے اور انہیں صرف جہاد فی سبیل اللہ کا جوش غزنی کھینچ لایا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کا شوقِ شہادت

---

[1] روضۃ الصفا صفحہ ۸۳ و ۹۴۔ [2] طبقاتِ ناصری ۱۰، ۱۱

دیکھکر سلطان محمود نے ہندوستان پر یہ حملہ کیا[1]۔
غرض دربار غزنی میں تمام وہ سازوسامان افراط کے ساتھ جمع تھے جو حکومت شخصی کے بادشاہوں کو مطلق العنان جابر بنا دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اسلامی اور یوروپین بادشاہوں کا فرق نمایاں ہوتا ہے کہ گو ایشیا کا مطلق العنان فرماں روا بھی کسی دنیاوی قانون کا ماتحت اور اپنے کسی فعل کا رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں تھا اور اس لئے بعض بادشاہوں نے محض اپنی خودرای سے لوگوں کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ کم سے کم انہی کی بدولت قوموں کو یہ نقصانِ عظیم پہنچا کہ اُن کی آزادی رائے اور خود داری فنا ہوگئی اور وہ خود اپنی نگاہ میں ذلیل وخوار ہو گئے ۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہئے کہ ممالکِ ایشیا میں ایک اور قوت بھی تھی جو بادشاہی کے اِن بُرے اثرات کو کم وبیش زائل کرتی رہتی تھی۔ اس سے ہماری مراد مذہب ہے جس کی ہمہ گیر بندش سے بہت کم اسلامی بادشاہ آزاد ہوتے تھے ورنہ عمل میں اسلامی اوامر سے تجاوز و انحراف کے باوجود، عقائد و اخلاق میں

[1] تاریخ فرشتہ۔ ۲۹۔ نیز دیکھو تاریخ یمینی مترجمہ انگریزی۔ ایلیٹ جلد دوم صفحہ ۴۱ ۔ تعجب ہے کہ الفنسٹن صاحب نے سلطان محمود کی باقاعدہ سوار فوج کی تعداد ۵۴ ہزار بتائی ہے (تاریخ ہند صفحہ ۳۴۲) اور گو کوئی حوالہ نہیں دیا لیکن ان کا سب سے بڑا ماخذ فرشتہ ہے اور اس میں مذکورۂ بالا حملے کے وقت ہی ایک لاکھ سوارانِ خاصہ کی تعداد موجود ہے ۔

وہ بالعموم کسی نہ کسی حد تک اسلام کی تعلیم سے مغلوب و متاثر ہوتے تھے۔ اور یہ اثر جس بادشاہ پر زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس کی مطلق العنانی کے بُرے اثرات و شیوؤں میں کمی آجاتی تھی۔ کیونکہ اپنی بندگی بیچارگی کا احساس اور آیندہ محاسبے کا خوف، ظلم و ستم کا ہاتھ کوتاہ کردیتا ہے اور جس دل میں "خدا پرستی" گھر بنالیتی ہے۔ وہاں "خود پرستی" کو جگہ نہیں ملتی۔

سلاطینِ غزنی میں بھی بعض ایسے افراد ملتے ہیں جو عدل و مساوات کے حامی تھے اور محض رعایا کی خدمت گزاری کو "بادشاہی" کا اصلی فریضہ سمجھتے تھے۔ اس مختصر کتاب میں ان سب کے واقعات لکھنے کی گنجایش نہیں لیکن اس خاندان کے سب سے نامور سلطان کے بعض حالات اس قابل ہیں کہ اُن کے مطالعہ سے اس عہد کے اسلامی بادشاہوں کے ذاتی عقائد و اوصاف کا عام اندازہ کیا جائے۔ تاریخ بناکتی کے حوالے سے فرشتہ بیان کرتا ہے کہ خراسان پہنچکر ایک مرتبہ سلطان کو شیخ ابوالحسن خرقانی رحہ[1] کی خدمت میں حاضر ہونے کا خیال آیا۔ مگر سوچا کہ کسی دنیاوی کام کے لئے آنا اور اسی

[1] شیخ ابوالحسن خرقانی رحہ سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ جواہر علویہ میں کشف المحجوب کے حوالے سے (جو اسی پانچویں صدی ہجری کی مشہور و مستند کتاب ہے) لکھا ہے کہ حضرت ممدوح اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ ۴۲۵ھ میں انتقال کیا۔

ضمن میں دوستانِ خدا کی زیارت کرنا خلافِ ادب ہوگا۔ لہٰذا اس مرتبہ واپس چلاگیا اور پھر غزنی سے خاص شیخ کی زیارت کے لئے خرقان آیا اور ایک شخص کو بھیجکر اپنے آنے کی اطلاع اور شیخ سے اردوئے شاہی میں آنے کی درخواست کی۔ قاصد کو اشارۃً سمجھا دیا تھا کہ اگر شیخ انکار کرے تو یہ آیت سنا دینا "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (یعنی فرماں برداری کرو اللہ کی اور رسول صلعم کی اور اپنے بادشاہوں کی) یہی ہوا کہ شیخ نے جانے سے انکار کیا۔ قاصد نے آیت پڑھی۔ شیخ نے فرمایا "محمود سے کہنا کہ میں خدا کی اطاعت میں اس قدر مستغرق ہوں کہ رسول کی اطاعت کا حق ادا نہ ہونے سے شرمندگی ہے۔ بادشاہوں کی اطاعت سے مجھے معذور رکھا جائے" یہ جواب سُن کر سلطان کے آنسو نکل پڑے اور خود اٹھ کھڑا ہوا۔ ملاقات کے وقت سلطان نے چند باتوں کے بعد درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے کہا چار چیزیں اختیار کرو۔ اوّل پرہیزگاری۔ دوسرے نماز با جماعت تیسرے سخاوت اور چوتھے شفقت برخلق۔ آخر میں سلطان کی استدعا پر اپنا کرتہ بطریق یادگار عنایت کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب سومنات کی لڑائی میں دشمنوں کا نرغہ ہوا اور کثرتِ اعدا کے سامنے اسلامی فوج کی شکست کا اندیشہ ہونے لگا تو سلطان ایک طرف ہٹ کر گھوڑے سے اترا

اور اسی کرتے کو ہاتھ میں لے کر خدا سے دعا کی کہ خدایا اس کرتے والے کی آبرو کا واسطہ مجھے دشمنوں پر فتح دے، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس لڑائی میں جو غنیمت ملے گی وہ سب درویشان خدا پر تقسیم کردوں گا......

اس روایت کے تمام وکمال صحیح یا غیر صحیح ہونے سے یہاں گفتگو نہیں، ہمیں صرف سلطان محمود کے مذہبی عقائد کا اندازہ کرنا مقصود ہے اور اس قسم کی مختلف شہادتیں دیکھکر فرشتہ کا یہ قول بالکل درست نظر آتا ہے کہ "سلطان کو درویشوں اور گوشہ نشینوں سے بدرجۂ غایت ارادت تھی"[1] اس قسم کی خوش اعتقادی سے بھی اکثر انکسار و خدا ترسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جیساکہ ہم ابھی بیان کر رہے تھے، یہ صفات مطلق العنانی کی نہایت عمدہ مُصلح ہیں۔

دوسرے یہ ہم بتا چکے ہیں کہ غزنی کی "ترک شاہی" سلطنت میں "حکومتِ خواص" کی شان تھی اور وہاں کے بادشاہ کسی حد تک اپنے ترکی اُمرا کی رائے کے پابند ہوتے تھے اور گو اس کے واسطے کوئی قانون منضبط نہیں ہوا تھا تاہم وضع قدیم کا تھوڑا بہت لحاظ بھی ان کی مطلق العنانی کو ناگوار جبر واستبداد کی صورت اختیار کرنے نہ دیتا تھا۔ کم سے کم ان کے سب سے بڑے بادشاہ سلطان محمود کے حالات میں ہمیں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جس سے

---

[1] فرشتہ۔ صفحہ ۳۸۔

یہ ثابت ہو کہ اُس کی مطلق العنانی رعایا کے حق میں باعثِ آزار و نقصان ہو گئی تھی ؎

اس سلسلے میں باقی شاہانِ غزنی کے متعلق صرف چند سطریں کافی ہوں گی کیونکہ گو سلطنت ایک خاندان کی میراث بن گئی تھی پھر بھی آئینِ حکومت میں غالباً کوئی خاص فرق نہیں ہوا تھا اور جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں یہ بادشاہ اُمرائے دربار کے اجماع یا اتفاق رائے سے تخت نشین ہوتے تھے ۔ مگر اس بات کا پتہ چلانا دشوار ہے کہ آیا ہر درباری امیر کو اس معاملے میں رائے دینے کا حق ہوتا تھا یا امرا کا کوئی خاص گروہ اس کو طے کرتا تھا ۔ بہر حال، سلطان محمود کی وفات کے بعد یہ سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی اور یہ بھی ایک وجہ ہوئی کہ وہاں کے بادشاہ اپنے اُمرا کی مدد سے کبھی مستغنی نہ ہو سکے اور ان کی مُطلق العنانی اپنی پہلی حدود میں محدود رہی۔ بایں ہمہ ایک مختصر حکایت سے جو اتفاقیہ طور پر تاریخ میں محفوظ رہ گئی ہے اس بات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ صرف نصف صدی تک موروثی اور شخصی بادشاہی کے قیام نے سلاطین غزنی کے خیالات پر کیا اثر ڈالا تھا۔ یہ حکایت سلطان ابراہیم بن مسعود (شہید) کے متعلق ہے جسے اہل تاریخ نے "سید السلاطین" کا لقب دیا تھا۔ اس نے اپنے طویل عہدِ حکومت (۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ / ۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء) میں

محمود کے بعد

نہ صرف بعض وہ علاقے واپس لئے جو پہلے سلاطین غزنی کے ہاتھ سے نکل گئے تھے بلکہ تمام نظم ونسق کی اصلاح کی۔ رفاہِ عام کے لئے بہت سی عمارتیں بنائیں، کئی نئے شہر آباد کئے[1] اور ان کامیابیوں کے باوجود ذاتی اخلاق و انکسار کا جو نمونہ پیش کیا اس کی نظیر سلاطین غزنی میں نہیں ملتی۔ تمام اسلامی مورّخ اس کے زُہد و تقویٰ عدل ورعایا پروری کی تعریف کرتے ہیں۔ جامع الحکایات[2] میں لکھا ہے کہ یہ سلطان ہرسال امام یوسف سجاوندی کو بلواتا تھا اور وہ اپنے وعظ میں خود سلطان پر سرِمجلس اعتراض کرنے میں مطلق باک نہ کرتے تھے اور سلطان سُنتا اور کچھ بُرا نہ مانتا تھا۔ اسی حلیم الطبع بادشاہ کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے کسی مزدور کو دیکھا کہ شاہی عمارات کے لئے بھاری پتھر سر پر رکھے جارہا ہے اور بوجھ کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ سلطان کو رحم آیا۔ حکم دیا کہ پتھر کو سر پر سے پھینک دے۔ اُس نے تعمیل کی اور وہ پتھر وہیں میدان میں ڈال دیا۔ بعد میں سواروں کے گھوڑے جب یہاں پہنچتے تو دوڑنے میں اس پتھر سے اکثر ٹھوکر کھاتے اور اسی خیال سے کسی مصاحب نے سلطان سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو پتھر کو وہاں سے

---

[1] طبقاتِ ناصری - ۲۰ - [2] واضح رہے کہ یہ کتاب محض ناقابلِ اعتبار حکایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

ہٹوا دیا جائے۔ سلطان ابراہیم نے کہا میں نے اسے وہاں گرا دینے کا حکم دیا تھا اب اگر دوبارہ اسے اٹھوانے کے لئے کہوں گا تو اس سے میری بات کی بے ثباتی ظاہر ہوگی۔ "و آں لائقِ باوشاہانِ صاحب اقتدار نیست"[1] اپنے جیا قول کا اس قدر پاس کرنا خاص مطلق العنان بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ مسلمانوں میں یہ خیالات اہل عجم کی صحبت سے پیدا ہوئے تھے اور جب سلطان ابراہیم جیسا نیکدل بادشاہ بھی اُن سے نہ بچ سکا تو دوسروں کے متعلق ہم خود قیاس کرسکتے ہیں کہ وہ کب اِن سے محفوظ رہے ہوں گے؟ بلکہ غور سے دیکھئے تو یہ عُجب وخودپسندی انہی لوازم عیش اور شاہانہ طمطراق کا نتیجہ تھی جنہیں خُلفائے عرب نے ایرانیوں کی تقلید میں اختیار کیا تھا کیونکہ غُرور کے یہ جذبات ہمیشہ عالیشان محلّات اور بیش قیمت لباسوں کے اندر پرورش پاتے ہیں، چند مُستثنیات کے سوا غزنی[2] کے اکثر بادشاہ بھی انہی ایرانی رسوم کے عادی تھے۔ اور ان میں سے بعض سونے کے اتنے وزنی تاج پہن کر تخت پر بیٹھتے تھے کہ سر اس کے وزن کو برداشت نہیں کرسکتا اور اس لئے تاج کو طلائی زنجیروں میں باندھکر لٹکا دیا جاتا تھا۔ خوبصورت

[1] جامع الحکایات ۔ قسم دوم باب شانزدہم۔ حکایت ششم، تاریخ فرشتہ میں دصفحہ ۴۹)، غالباً اس واقعہ کو وہیں سے نقل کیا ہے۔

[2] فرشتہ صفحہ ۴۴ سلطان مسعود کی تاج پوشی کے بیان میں ؟

غلاموں کی فوج ان کے گرد و پیش رہتی تھی۔ مطرب و ساقی اِن کی بزمِ عیش کا لازمہ ہو گئے تھے۔ نجومیوں کے مہورت بتائے بغیر وہ بالعموم کوئی کام نہ کرتے تھے[1]۔

۳۔ شاہانِ غزنوی کی علم نوازی۔

مگر سلطان محمود اور اس کی اولاد کا مشرق پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کی سرپرستی نے فارسی علم ادب کو فروغ دیا اور یہی علمی خدمات ان کے نام نیک کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضامن ہیں۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنے مشہور قطعے میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے:

"بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد ✤ کہ در رفعت ہمی با ماہ مِرا کرد۔
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پائے ✤ مدیحِ عُنصُری ماندست بر جائے![2]

واضح رہے کہ اسلامی فتح کے دو صدی بعد تک ایران کے مصنّفین اور شعرا عربی زبان ہی میں نظم و نثر کے کمال

---

[1] اِن بادشاہوں کی مے کشی اور نجومیوں سے عقیدت مندی کے بہت سے واقعات تاریخ بیہقی، جامع الحکایات، چہار مقالہ نظامی عروضی اور بعد کی فارسی تاریخوں میں مذکور ہیں۔

[2] چہار مقالہ۔ صفحہ ۴۷۔ قطعے کا مطلب یہ ہے کہ سلطان محمود نے بہت سی عمارتیں بنائیں جو بلندی میں چاند سے جھگڑا کرتی تھیں۔ ان کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں نظر آتی لیکن عُنصُری نے اُس کی تعریف میں جو کچھ لکھ دیا تھا وہ آج تک سلامت ہے۔

دکھاتے تھے اور معمولی یادداشتوں یا بچوں کی کتابوں کے سوا تیسری صدی ہجری تک غالباً کوئی کتاب فارسی میں نہیں لکھی گئی۔[1] اس کے بعد جب عربی حکومت میں زوال آیا اور ایرانی النسل بادشاہوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو ایرانیوں کو اپنی قومی زبان میں لکھنے کا خیال آیا اور فارسی علم ادب کا آغاز ہوا۔ لیکن سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت تک نثر میں صرف گنتی کی چند کتابیں لکھی یا عربی سے ترجمہ کرلی گئی تھیں اور اگرچہ ایرانی نیز ترکی امیروں کی قدردانی سے مختلف مقامات خاص کر بخارا میں بہت سے فارسی شعرا پیدا ہو گئے تھے مگر ان میں صرف دو مشہور ہیں: (۱) رودکی اور (۲) دقیقی، جس نے شاہ نوح بن منصور کی فرمائش سے "شاہ نامہ" نظم کرنا شروع کیا تھا۔ گویا فارسی زبان کی سب سے ممتاز صنفِ شعر یعنی مثنوی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ قصیدہ اور غزل بہت سادہ اور ابتدائی حالت میں تھے اور دورِ غزنوی سے پہلے زیادہ تر قطعات اور رباعیات کا رواج تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ فارسی علم ادب گھٹنیوں چلنے لگا تھا، دوڑنے کی اُس میں طاقت نہ آئی تھی۔[2]

محمود کی علم دوستی

یہ بھی عجیب اتفاقِ زمانہ ہے کہ اِس بچے کی پرورش

---

[1] لٹریری ہسٹری۔ جلد اوّل صفحہ ۱۱، ۱۲، و ۳۴۰۔ نیز شعر العجم حصہ اوّل صفحہ ۱۶۔

[2] لٹ ہسٹری۔ جلد اول صفحہ ۴۷۲

ترکوں نے غزنی میں کی جو اُس کے وطنِ اصلی سے کہیں دُور تھا۔ اور فردوسی اپنی ہجو میں سلطان محمود کو کتنا ہی بدنام کرے، علم اور خاص کر فارسی شاعری پر اس بادشاہ نے جو احسانات کئے ہیں وہ کسی طرح نہیں مٹ سکتے۔ وہ بذاتِ خود فاضل اور نہایت سلیم المذاق شخص تھا۔ جواہر مضیئہ جیسی مستند کتاب میں اُسے فقیہ مانا ہے اور فقہ میں اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے[۱]۔ فارسی تذکروں اور تاریخوں میں اس کے طبعزاد چند شعر بھی منقول ہیں[۲]۔ لیکن اس کی علم دوستی کا شاید سب سے اچھا ثبوت وہ عالیشان مدرسہ اور کتب خانہ ہے جو اُس نے صرفِ کثیر کے ساتھ غزنی میں تعمیر کیا تھا۔ نہایت نادر اور بیش قیمت کتابیں اس میں جمع کی تھیں اور اس کے سالانہ مصارف کے واسطے جاگیریں اور گاؤں وقف کردئے تھے[۳]۔

۱۔ شعر العجم حصۂ اوّل صفحہ ۵۷

۲۔ لباب الالباب جلد اوّل صفحہ ۲۴، ۲۵ و نیز دیکھو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۲۰

۳۔ روضۃ الصفا ۳۰۴۔ فرشتہ ۳۰۔ مگر حیرت ہے کہ پروفیسر براؤن جیسا واقف کار شخص محمود کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقات یا مُلکی فتوحات کا نتیجہ تھا کہ سلطان کے دربار میں اتنے ادیب جمع ہو گئے ورنہ اس میں "نہ کوئی ذاتی قابلیت تھی نہ خیرد شرافت نہ علمی لیاقت" (لٹ ہسٹری جلد دوم صفحہ ۱۰۲)۔ خاکسار مؤلف کے نزدیک اگر مذکورۂ بالا تاریخی واقعات اور شعرا کو سلطان کی شاہانہ داد و دہش اس کی شرافت ولیاقت کا کافی ثبوت نہیں ہیں تو پروفیسر

اس علمی قدر دانی اور شاہانہ داد و دہش کا ہر طرف شہرہ ہوگیا تھا اور دُور دُور کے علماء و شعرا کھنچ کھنچ کے غزنی آ رہے تھے۔ عربی زبان کا بے مثل انشاپرداز **بدیع الزماں** ہمدانی جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے "اعجوبۂ روزگار" مانا جاتا تھا سلطان کے جوارِ فیض میں ہرات آگیا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور چالیس برس کی عمر میں رحلت کرگیا (۳۹۸ھ) محمود کی مدح میں اس کا ایک عربی قصیدہ محفوظ ہے ؎

حکیم **ابوعلی** سینا اور **ابوریحان** بیرونی وغیرہ چند ارباب کمال شاہِ خوارزم کے دربار میں تھے۔ محمود نے انہیں خود اپنا سفیر بھیج کر غزنی بلایا۔ یہ سفیر، خواجہ **حسین بن علی میکال** بھی اپنے زمانے کا نامور فاضل تھا اور یہ انتخاب ہی محمود کی قدر شناسی کی شہادت ہے۔ بوعلی سینا نے یہ دعوت قبول نہ کی لیکن ان اہل کمال میں جو سلطان کی فیاضی کا شہرہ سُن کر غزنی آئے، علامہ ابوریحان **بیرونی** بھی تھا۔ جو اپنے زمانے کے متعدد علوم کا متبحر عالم گزرا ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں کتاب "آثار الباقیہ" "قانون مسعودی" اور "تفہیم" سب سے زیادہ مشہور اور موجود ہیں ورنہ کئی ضایع ہوگئیں اور اُن کے صرف نام

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳۔ براؤن کی یہ ذاتی رائے بھی صاف واقعات و شواہد کے بغیر چنداں وقیع نہیں سمجھی جاسکتی ؎

باقی رہ گئے۔ مگر بیرونی کی نام آوری کا دوسرا سبب "کتاب الہند" ہے جسے اُس نے کئی سال ہندوستان میں رہ کر اور سنسکرت زبان میں پورا عبور حاصل کرکے تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر سخاؤ جنھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا ہے شہادت دیتے ہیں کہ آج بھی دورِ جدید کی تمام آسانیوں کے باوجود، اتنی صحت اور وسعتِ نظر کے ساتھ قدیم ہند پر ایسی محققانہ کتاب لکھنا جیسی بیرونی لکھ گیا ہے سالہا سال کی محنت کا کام ہے[1]

فردوسی کا قصہ

لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی سلطان محمود سے زیادہ خوش نہیں رہا اور نہ سلطان ہی اس پر کچھ بہت مہربان تھا۔ عجب نہیں کہ اس باہمی نارضامندی کا ایک سبب وہی مذہبی اختلاف ہو جس کی بدولت فردوسی کو دربارِ غزنی سے ناکام واپس جانا پڑا۔ مذہبی اختلاف سے ہماری مراد یہ ہے کہ اُس زمانہ میں مسلمانوں کے شیعہ اور سنّی فرقوں میں سخت مخالفت پیدا ہوگئی تھی اور فردوسی بھی پکّا شیعہ تھا۔ اسی بناپر، جب وہ اپنی لاجواب مثنوی لے کر غزنی آیا، تو بعض درباریوں نے سلطان کو اس سے بدظن کردیا اور بطریق انعام اُسے صرف بیس ہزار درہم دئے گئے۔ یہ رقم فردوسی کی امید سے بہت کم تھی اُس نے رنج وغضب کی حالت میں

[1] مقدمۂ کتاب "بیرونیز انڈیا"

اسے وہیں خیرات کردیا اور اپنے وطن طوس چلا آیا۔ یہاں سلطان محمود کی مشہور ہجو کے علاوہ اُس نے ایک اور مثنوی "یوسف و زلیخا" نظم کی اور غالباً ۱۱۴ھ ۱۰۲۰ء میں وفات پائی ؎

سلطان کا نامور دبیر خواجہ احمد (بن) حسن میمندی جس نے فردوسی کو دربار میں پیش کیا تھا اور جس کو خفیف کرنے کے لئے اُمرائے دربار نے فردوسی کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے تھے، ایک مرتبہ ہندوستان میں سلطانی لشکر کے ہمراہ تھا اور کسی باغی قلعہ دار کے پاس محمود نے قاصد بھیجا تھا کہ اب بھی اطاعت قبول کرلے۔ دوسرے دن قاصد کو لشکر کی طرف واپس آتا دیکھکر محمود خواجہ کی طرف مخاطب ہوا کہ تمہارے خیال میں کیا جواب لایا ہوگا؟ خواجہ نے جواب میں شاہ نامے کا یہ شعر پڑھا کہ۔

اگر جز بکام من آید جواب — من و گرز و میدان وافراسیاب

محمود نے پوچھا یہ جوش انگیز شعر کس کا ہے؟ خواجہ نے عرض کیا فردوسی کا جس نے پچیس برس محنت کی اور کچھ پھل نہ پایا۔ محمود نے کہا واقعی مجھے بہت پشیمانی ہے کہ وہ غریب میرے پاس سے محروم واپس گیا۔ غزنی پہنچ کر مجھے یاد دلانا؛ پھر غزنی میں خواجہ کے یاد دلانے پر حکم دیا کہ ساٹھ ہزار اشرفی (دینار) طوس بھیج دی جائیں اور فردوسی سے پہلی فروگزاشت کی معذرت کی جائے؛ مگر وہ اُسی

زمانے میں فوت ہوگیا تھا۔ لہٰذا بادشاہ کے حکم سے اس رقم سے ایک بہت بڑی سرائے فردوسی کے نام پر تعمیر کرادی گئی ہے۔

یہ روایت ازسرتاپا نظامی عروضی (سمرقندی) کی کتاب چہار مقالہ سے ماخوذ ہے (صفحہ ۶۱ تا ۶۶) اور زیر بحث واقعے کے متعلق سب سے پہلی اور مستند تحریر یہی ہے چنانچہ نول دکی ڈاکٹر ایتھے اور خود پروفیسر براؤن جیسے فاضل مستشرق اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں [۱] راقم الحروف کا قیاس ہے کہ شاید یہ دوبارہ ساٹھ ہزار دینار بھیجنا ہی اس غلط فسانے کی بنیاد ہے کہ محمود نے فی شعر ایک دینار دینے کا وعدہ کیا تھا اور بعد میں بجائے دینار کے درہم دیے۔ کیونکہ یہ امر نہ صرف معتبر بیرونی شواہد بلکہ خود شاہ نامے کے اشعار سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ فردوسی نے یہ کتاب محمود کی فرمایش سے غزنی میں نہیں لکھی بلکہ وہ اسے اپنے شوق سے محمود کی تخت نشینی سے ۲۲، ۲۳ برس پہلے شروع کرچکا تھا اور پچیس برس کی محنت میں یعنی ۴۰۰ھ میں وہ مکمل ہوگئی تھی۔ شاعر اپنے وطن طوس کے قریب ہی ایک مقامی رئیس کے نام اسے منسوب کرچکا تھا لیکن بعد میں سلطان محمود کی فیاضی اور شعرانوازی سن کر غزنی آیا اور غالباً یہیں اُس نے شاہ نامے کی

---

[۱] ادبی ہسٹری" جلد دوم - صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۱

نظرِ ثانی کی اور سلطان محمود کی مدح میں جا بہ جا اشعار کا اضافہ کیا[1]

"دو شعرائے محمودی"

بہر کیف اگر فردوسی کو غزنی کی سکونت راس نہ آئی تو اور بہت سے شاعر سلطان کی داد و دہش سے فیضیاب ہونے والے موجود تھے؛ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ چار سو "شاعر متین" سلطان کے ملازم تھے[2] انعام واکرام کی یہ حالت تھی کہ ایک موقع پر ہر شاعر کو جس نے قصیدہ لکھا تھا صلے میں ۲۰، ۲۰ ہزار درہم عطا ہوئے[3] عنصری کی ایک برجستہ رباعی پر حکم دیا گیا کہ شاعر کا منہ تین مرتبہ جواہر سے بھر دیا جائے[4]! یوں بھی عنصری کی، جو پہلے نادار شخص تھا، دولت مندی مشہور ہے کہ سلطان کی فیاضی کے طفیل چار سو زریں کمر غلام اس کے جلو میں چلتے تھے اور ظروف میں اس کی دیگیں تک طلائی یا نقرئی تھیں[5] لیکن سلطان کے ادبی ذوق کی شاید سب سے عمدہ شہادت یہ ہے کہ اس نے عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دیکر اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ سب شعرا کا کلام دیکھے اور

---

[1] "لٹ ہسٹری" جلد دوم - صفحہ ۱۴۱ -

[2] فرشتہ - صفحہ ۳۹ -

[3] شعر العجم صفحہ ۸۰ بحوالہ مجمع الفصحا -

[4] چہار مقالہ صفحہ ۴۵ -

[5] شعر العجم - صفحہ ۷۱ - بحوالہ مجمع الفصحا، تذکرۂ دولت شاہ وغیرہ ۔

اس کی تنقید و اصلاح کے بغیر کسی کے شعر دربار میں پیش نہ ہوں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر سخن سنج کو ایک خاص معیار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا ورنہ اس کے شعر مقبول نہ ہوتے تھے۔[1]

غرض سلطان محمود کی سرپرستی اور ان شعرا کی عرق ریزی نے فارسی شاعری میں، غزل کے سوا، ہر صنفِ شعر کو اوجِ کمال پہ پہنچا دیا اور **آسدی**، **فرخی** اور **منوچہری** جیسے قادر الکلام شاعر پیدا کئے جن کا کلام آج بھی دنیائے ادب کا نہایت عزیز سرمایہ ہے۔

سلطان مسعود کا زمانہ

لیکن منوچہری کی شاعری کا زیادہ زمانہ سلطان مسعود کے دربار میں گزرا اور اسے ہم عہدِ مسعود ہی کے ادیبوں میں شمار کرسکتے ہیں۔ بیرونی کی کتاب "قانون مسعودی" بھی اسی عہد میں تکمیل کو پہنچی اور مسعود کے نام سے منسوب ہے۔ مصنف کو صلے میں اس نے "ایک ہاتھی چاندی" عنایت کی تھی۔[2] ایک اور فاضل روزگار قاضی **ابو محمد ناصحی** نے بھی فقہِ حنفی میں اپنی تصنیف کو اس بادشاہ کے نام پر "کتاب مسعودی" موسوم کیا۔

واضح رہے کہ محمود کی اولاد میں علم وفضل کا امتیاز شہزادہ محمد کو حاصل تھا۔ لوگ عربی اشعار میں اُس سے استناد کرتے تھے[3] اور مسعود کی شہرت سپاہ گری اور

[1] تاریخ فرشتہ - ۴۴۔ [2] طبقات ناصری صفحہ ۱۳۔ [3] ترجمہ راورٹی حاشیہ صفحہ ۸۸۔

جسمانی قوت کی وجہ سے تھی۔ لیکن تخت نشین ہوکر اس نے اپنی سخاوت اور علم کی قدردانی سے یہ کمی پوری کردی اور ممالک محروسہ میں نہایت کثرت سے مدرسے تعمیر کرائے۔[1]

ہندی شاعر

لیکن اس جگہ سب سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ پنجاب پر پچاس ساٹھ برس کی اسلامی حکومت نے خود اس ملک میں فارسی گو شعرا پیدا کردئے تھے چنانچہ عوفی کو اپنے مشہور تذکرے میں ان کے نام پر ایک علیحدہ باب قائم کرنے کی ضرورت ہوئی[2] ان میں سے دو خاص طور پر لائق ذکر ہیں؛ اوّل اُستاد **ابوالفرج رونی** جو مضافات لاہور میں موضع **رونی** کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں ملا عبدالقادر بداونی کے زمانے میں ویران و بے چراغ ہوچکا تھا[3]۔ مگر استاد موصوف کے وہاں سکونت اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ سلطان محمود یا مسعود ہی کے زمانے میں مسلمانوں کی آبادی شہروں تک محدود نہ رہی تھی۔ بہرحال یہ شخص اپنے زمانے کا نہایت نامور شاعر گزرا ہے اور عوفی کا بیان ہے کہ **انوری** جیسا مسلم الثبوت اُستاد قصیدہ نگاری میں اسی کا مُقلّد تھا۔ دوسرا مشہور شاعر جسے خاک ہند سے منسوب کرتے ہیں، **مسعود سعد سلمان** ہے۔ وہ

---

[1] فرشتہ صفحہ ۴۴۔ افسوس ہے کہ ان مدارس کی صحیح تعداد اور مفصل حالات کا ہمیں پتہ نہیں چل سکا۔ [2] لباب الالباب جلد دوم باب دہم "شعرائے غزنہ ولوہور" (لاہور)۔ [3] منتخب التواریخ صفحہ ۳۷۔

"سید السلاطین" ابراہیم بن مسعود کا مدّاح تھا۔ قصائد و قطعات کے علاوہ عوفی نے اس کی ایک غزل نقل کی ہے جو حقیقت میں "چمنِ لطافت کا پھول ہے"[۲] اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کی یہ صنف بھی سلاطینِ غزنی کی سرپرستی میں بہت کچھ ترقی کر گئی تھی؛ مگر ہماری نظر میں سعد سلمان کی ناموری کا سب سے بڑا سبب دوسرا ہے: وہ یہ کہ مسلمانوں میں یقیناً سب سے پہلا شخص وہ ہے جس نے "ہندوی" یا ہندوستانی زبان میں شاعری کی اور عربی و فارسی کے پہلو بہ پہلو اس زبان میں ایک مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا[۳] جو غالباً ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانے تک موجود تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ یہ دیوان پنجاب کی مقامی بولی میں نہیں بلکہ اسی ہندی زبان میں ہوگا جو "ہندوستان خاص" یا دوآب کی زبان تھی؛

عہد بہرام شاہ

سلطان ابراہیم کے بعد کچھ عرصے تک سلطنت میں فتنہ و فساد ہوتے رہے اور امن اس وقت ہوا جب کہ خاندان یمینیہ کا بارھواں بادشاہ بہرام شاہ ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں

[۱] اس کے قریبی زمانے کے سخن سنج نظامی عروضی نے اس کلام کی جس فراخ دلی سے داد دی ہے وہ اس کی خوبی کی بہترین شہادت ہے۔ (ملاحظہ ہو چہار مقالہ صفحہ ۵۰ و ۵۱) [۲] لباب جلد دوم صفحہ ۲۵۱ - [۳] لباب۔ صفحہ ۲۴۶۔ منتخب التواریخ صفحہ ۳۸؛ نیز ملاحظہ ہو خزانہ عامرہ صفحہ ۱۴ و ۱۵ جس میں شاعر کے خاص "ہندوستانی" ہونے کو بھی بدلائل ثابت کیا ہے؛

(یعنی سلطان ابراہیم کی وفات کے بیس برس بعد) تخت نشین ہوا۔ اس کے اوائل عہد کا درباری شاعر سیّد حسن غزنوی تھا لیکن حکیم سنائیؒ اور نظامی گنجویؒ جیسے اساتذہ کے مقابلے میں اس غریب کی چنداں شہرت نہ ہوسکی اور یہ دونوں باکمال بہرام شاہ کے مدّاح تھے۔ سنائیؒ کی مشہور مثنوی حدیقہ اسی بادشاہ کے نام پر لکھی گئی اور گوشہ نشین نظامیؒ کا وطن اگرچہ سلطان طغرل کی قلمرو میں تھا اور شہرتِ کلام کی بدولت بڑے بڑے سلاطین عصر انہیں اپنے دربار میں بلانا بلکہ بعض اپنی اولاد کا ان کے ہاں پیوند کرنا چاہتے تھے مگر سب سے پہلے جس بادشاہ کی سرپرستی کو انہوں نے قبول کیا وہ یہی بہرام شاہ تھا۔ مثنوی مخزن الاسرار اسی فیاض بادشاہ کے نام پر تصنیف ہوی اور اس کے صلے میں "پانچ ہزار اشرفی ایک قطار شتر اور بہت سے بیش قیمت کپڑے" بادشاہ نے انہیں ارسال کیے[۱]

اسی بادشاہ کی سرپرستی میں اور بہت سی کتابیں فارسی میں تصنیف یا ترجمہ ہوئیں[۲] جن میں سب سے زیادہ "کلیلہ دمنہ" مشہور ہے۔ یہ ہارون الرشید کے

ع۱ شعر العجم - ۲۹۰ -

ع۲ راورٹی - ۱۰۹ - فرشتہ ۵۰ - منتخب ۴۹ -

عہد میں پہلوی سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی۔ اب اُسے دوبارہ فارسی کا لباس پہنایا گیا اور یہی ترجمہ کچھ مدت کے بعد زیادہ سلیس عبارت میں بدل کر انوار سہیلی کہلانے لگا۔

بہرام شاہ کے آخری زمانے میں ملوکِ غور سے وہ لڑائی چھڑ گئی جس نے انجام کار شہر غزنی کی عظمت کو خاک میں ملا دیا، اور علاء الدین کے ہاتھوں علم و فضل کا یہ مرکز ایسا تاراج ہوا کہ پھر اسے اُبھرنا نصیب نہ ہوا۔

ضمیمۂ باب دوم

۱۔ شاہانِ غزنی کے سنینِ حکومت

امیر الپ تگین

۳۲۲ھ تا ۳۵۲ھ مطابق ۹۶۳ء

اسحٰق بن الپ تگین	بلکاتگین (غلام الپ تگین)	امیر پیرے (غلام الپ تگین)
۳۵۲ھ تا ۳۵۵ھ	۳۵۵ھ تا ۳۶۲ھ	۳۶۲ھ تا ۳۶۶ھ یا ۳۶۷ھ

امیر ناصر الدین سبکتگین (غلام الپ تگین)

۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء

(۱) سلطان یمین الدولہ ابو القاسم محمود

۳۸۸ھ تا ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء

(۲) امیر محمد بن سلطان محمود	(۳) سلطان مسعود بن محمود	(۴) سلطان مودود بن مسعود
ہفت ماہ	۴۲۲ھ تا ۴۳۲ھ	۴۳۲ھ تا ۴۴۱ھ
مسعود بن محمود	(۵) علی بن مودود	(۶) عبدالرشید بن سلطان محمود
ایک ماہ	۴۴۱ھ تا ۴۴۳ھ	۴۴۳ھ تا ۴۴۴ھ

طغرل غلام چہل روز	(۷) فرخ زاد بن سلطان مسعود ۴۴۴ھ تا ۴۵۱ھ	(۸) سید السلاطین ابراہیم بن مسعود ۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ
(۹) مسعود الکریم بن ابراہیم ۔ ۴۹۲ھ تا ۵۰۸ھ	(۱۰) شیرزاد بن مسعود الکریم ۔ ۵۰۸ھ تا ۵۰۹ھ	(۱۱) ملک ارسلان بن مسعود الکریم ۵۰۹ھ تا ۵۱۱ھ
(۱۲) بہرام شاہ بن مسعود الکریم ۔ ۵۱۲ھ تا ۵۴۷ھ	(۱۳) خسرو شاہ بن بہرام شاہ ۔ ۵۴۷ھ تا ۵۵۵ھ	(۱۴) خسرو ملک بن خسرو شاہ (فرمان روائے پنجاب) از ۵۵۵ھ تا ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء

۲۔ سلطان محمود کے حملے[1] ہند پر۔

واقعات

سنین

۱×۔ سلطان محمود کا پہلا حملہ سرحد ہند پر اور جنوبی ہند کے جاٹوں کی سرکوبی ۳۹۰ھ ۱۰۰۰ء

۲۔ جنگ پشاور اور راجہ جے پال کی شکست و گرفتاری۔ ۳۹۱ و ۳۹۲ھ ۱۰۰۲ء

---

[1] سلطان محمود کے کُل حملوں کی تعداد بعض مورخوں نے ۱۲، بعض نے ۱۶ اور بعض نے ۱۷ بتائی ہے اور اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض نے معمولی سرحدی لڑائیوں کو شمار کے قابل نہیں سمجھا؛ ہم نے اُوپر صرف اُن حملوں کا ذکر کیا جن کے سنین و واقعات قریب قریب مسلّم ہیں۔ اور اگر ان میں ۱۔ ۵۔ اور ۱۵۔ کو جن پر نشان × کردیا گیا ہے اور جو چنداں دقیع نہیں چھوڑ دیا جائے تو محمود کے حملوں کی تعداد بارہ رہ جائے گی؛ موتف

	سنین
۳۔ راجہ بجھاٹیا پر فوج کشی - جنگ بھیرا۔	۳۹۵ھ
۴۔ ابو الفتح والی ملتان پر فوج کشی -	۳۹۶ھ
× ۵۔ سُکھ پال (نومسلم) کی بغاوت اور اس کی تنبیہ کے لئے محمود کی فوج کشی۔	۳۹۸ھ
۶۔ راجہ انند پال سے جنگ نگرکوٹ یا کوٹ کانگڑے کی فتح۔	۳۹۹ھ
۷۔ ملتان پر دوسرا حملہ۔	۴۰۱ھ
۸۔ راجہ بھیم والی ناردین یا نندونہ (مشرقی پنجاب) پر فوج کشی۔	۴۰۴ھ
۹۔ فتح تھانیسر وغیرہ۔	۴۰۵ھ
۱۰۔ کشمیر پر ناکام فوج کشی	۴۰۶ھ
۱۱۔ فتوحاتِ قنوج و متھرا	۴۰۹ھ
۱۲۔ کشمیر پر دوسرا حملہ	۴۱۲ھ
۱۳۔ گوالیار و کالنجر کی فتح۔ الحاقِ پنجاب	۴۱۳و۴۱۴ھ ۱۰۲۱ء
۱۴۔ سومنات و گجرات کی فتح	۴۱۶و۴۱۷ھ ۱۰۲۵ء
× ۱۵۔ ملتان کے قزاقوں کی سرکوبی	۴۱۷ھ

باب سوم

مسلمانوں کا تسلّط ہندوستان پر

۱۔ سلطان معزّالدین محمد بن سام

نسل و خاندان

غور کے رئیس جنھوں نے سلطان محمود کی اولاد سے بادشاہی چھینی، تاریخ میں **آلِ شنسب** یا **سلاطین شنسبانیہ** کہلاتے ہیں کیونکہ عام روایت کے مطابق اُن کے بزرگون میں سب سے پہلا شخص جس نے حضرت علیؓ کے عہد میں اسلام قبول کیا، **شنسب** تھا۔ ان کی نسل کے متعلق بعض مورّخون نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے نیم تاریخی بادشاہ **ضحّاک تازی** کی اولاد میں ہیں۔ لیکن تحقیقاتِ جدید ان افسانہ آمیز روایتیون کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کی رُو سے یہ بادشاہ ”تاجیک“ (یعنی اہل ایران و عرب کی مخلوط نسل سے) ہیں اور غالباً خراسان سے اُٹھ کر ان اضلاع میں آئے تھے[۱]۔

۱۔ راورٹی حواشی صفحہ ۳۲۶ وغیرہ۔

ان کی قدیم تاریخ پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں - لیکن یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ غور کے یہ رئیس افغانی نہیں تھے اور سلطان محمود کے زمانے تک نہ انہوں نے مدنیت میں کچھ ترقی کی تھی نہ اُن کی سیاسی قوت چنداں قابل لحاظ تھی - اُن کے ماتحت قبائل، افغانستان کے پہاڑی جرگوں کی طرح، نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور قدرتی پیداوار کے علاوہ لُوٹ کا مال ان کی دلپسند وجہ معاش تھی۔ تاریخ یمینی سے یہ بات ثابت ہے کہ ابھی تک ان کے بہت سے افراد بت پرست یا غیر مُسلم تھے - ان کی قزاقانہ دست بُرد پر غضب ناک ہوکر سلطان محمود نے جب فوج کشی کی تو آہن گراں[۱] نامی قصبہ اُن کا سب سے مضبوط اور دشوار گزار قلعہ اور سوری کا بیٹا[۲] ان کا مالک

[۱] میجر راورٹی نے اس قلعے کو غزنی کے قریب "آہنگ" نامی ندی کے متصل بنایا ہے (حاشیہ صفحہ ۳۲۰)، لیکن تعجب ہے کہ اس غیر معروف دیہہ کی بجائے (جو آہنگ ندی کے قریب تھا)، اُس "قلعۂ آہنگراں" کی طرف ان کا خیال نہ گیا جو غزنی سے تقریباً سوا دو سو میل مغرب میں رودِ ہری پر واقع ہے (دیکھو روائیل ایٹ لس - نقشہ ۲۴)، غور کے رئیسوں کا خاص علاقہ یہی تھا اور اسی علاقہ میں کچھ عرصے بعد اُن کا مشہور قلعہ فیروز کوہ تعمیر ہوا۔

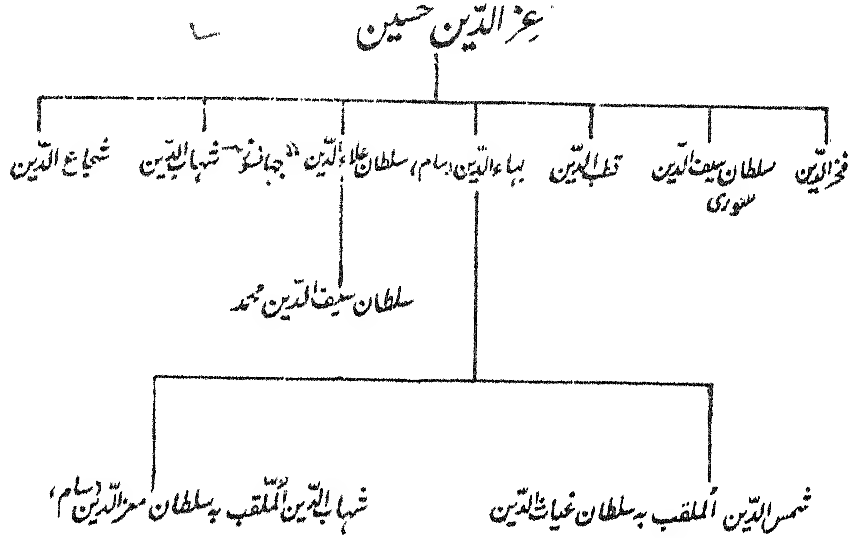
[۲] بعض مؤرخوں نے اس کا نام "محمد بن سوری" بتایا ہے - بقیہ بصفحۂ آیندہ

یا بڑا سردار تھا جسے لڑائی میں شکست ہوی اور قید کر کے غزنی بھیج دیا گیا؛ وہاں اس پر جو کچھ گزری اِس کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے اور اِس لڑائی کا سنہ (۴۱۱ھ) بھی مسلّم نہیں - لیکن تمام روایتوں کو پڑھکر جو نتیجہ ہمارے مفید مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اسی شکست کے بعد سے غور کے رئیس شاہانِ غزنی کے باج گزار ہو گئے اور وہاں کے قبائل میں اسلام کی اشاعت ہوی؛

معلوم ہوتا ہے اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں نہ صرف مدنیّت اور نظم و نسق کی قابلیّت پیدا ہوی بلکہ قومی حوصلے بڑھ گئے اور قزّاقی کی بجائے اب وہ بادشاہی کے خواب دیکھنے لگے؛ سلاطین غزنی کے انحطاط نے اِن حوصلوں کو تقویت پہنچائی - غوؔر کے رئیس رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے گئے اور سنہ ۴۹۳ھ / ۱۰۹۹ء میں عِزالدّین حسین کی بادشاہی کو خود سلطان مسعود (الکریم) نے تسلیم کر لیا؛ "فاتح ہندوستان" غور کے اسی پہلے بادشاہ کا پوتا تھا اور چونکہ آئندہ واقعات میں عِزالدّین حسین کے بیٹوں کا بار بار ذکر آئے گا لہذا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸- طبقات ناصری (صفحہ ۱۴ وغیرہ) لیکن تاریخ یمینی میں صرف "ابن سوری" لکھا ہے؛ مفصّل بحث کے لئے دیکھو راورٹی حاشیہ ص ۳۲۱ تا

یہ ورق پڑھتے وقت ذیل کا شجرہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔



عزالدین نے اپنا مُلک بیٹوں میں تقسیم کردیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ خود مختار رئیس تھے لیکن غالباً "سلطان" کا لقب صرف **سیف الدین سوری** کو حاصل تھا۔ اور جب اُس کا بھائی **قطب الدین** غزنی میں قتل ہوا تو اُسی نے انتقام کے لئے بادشاہ غزنی پر فوج کشی کی۔

غزنی کی پہلی تسخیر

قطب الدین کے قتل کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں سے ناراض ہوکر غزنی چلا آیا تھا اور اپنے حُسنِ صورت و سیرت کی بدولت اُمرائے غزنی کا محسود ہوا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے خود غزنی کے بادشاہ بہرام شاہ نے بُلایا اور اپنی بیٹی بیاہی یا بیاہنی چاہتا تھا کہ کسی سنگین قصور کی بنا پر اس سے ناراض ہوگیا اور زہر دے کر

مروا ڈالا۔ بہرحال، یہ مسلّم تھا کہ قطب الدّین بہرام شاہ کے حکم سے مارا گیا اور اس کا کوئی سبب بتایا نہیں گیا تھا لہذا مقتول کے بھائی سیف الدّین سوری کو یہ خبر ہوئی تو نہایت غضب ناک ہوا اور انتقام لینے کے لئے اس نے خاص پائے تخت غزنی پر فوج کشی کی۔ بہرام شاہ کو شکست کھا کے فرار ہونا پڑا اور سوری نے شہر پر قابض ہوکر اپنے "سلطان غزنی" ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعض روایتوں سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید اس فتح میں سوری کا بھائی بہاء الدّین سام شریک غالب تھا اور یہ کامیابی کسی حیلے سے حاصل ہوئی تھی۔ بہرحال ۵۴۳ھ میں سیف الدین سوری غزنی میں تخت نشین ہوا اور اُمرائے غزنی کی اطاعت گزاری پر مطمئن ہوکر اس نے اپنے غوری سپاہیوں کو وطن جانے کی اجازت دے دی اور صرف تھوڑی سی فوج اس کے پاس غزنی میں رہ گئی۔

تھوڑے دن میں برف باری نے غور کے راستے بھی بند کر دیئے۔ امرائے غزنی موقع کی تاک میں تھے انہوں نے خفیہ طور پر بہرام شاہ کو بلا بھیجا اور وہ سرحد ہندوستان سے تازہ لشکر لیکر غزنی آگیا۔ سوری نے کثرت تعداد کے مقابلہ سے بچ کر بھاگنا چاہا لیکن وہ اور اس کا وزیر سیّد مجد الدّین موسوی گرفتار کر لیے گئے

اور سخت ذلّت و تشہیر کے بعد انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔[1]

دوسری تسخیر وتاراجی۔

بھائی کی اس فضیحت و قتل کی اطلاع پہلے بہاء الدّین سام کو ملی اور مورّخ لکھتا ہے کہ طیش و انتقام کے جوش میں اس نے مجلس عزا کو بھی ملتوی کردیا اور بہرام شاہ سے لڑنے کے لئے فوج مہیا کی۔[1] لیکن وہ غزنی کے راستے میں مرگیا اور یہ فرض تیسرے بھائی **علاء الدّین حسین** کے ہاتھوں انجام کو پہنچا جس نے بہرام شاہ کو تین شکستیں دے کر دوبارہ غزنی پر قبضہ کرلیا۔ اور حکم دیا کہ شہر کو لوٹ کر آگ لگادی جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوی اور سات شبانہ روز اِدھر شہر جلتا رہا اور لوگوں کا خون برسات کے میلے پانی کی طرح گلیوں میں بہتا رہا اور اِدھر یہ افغانستان کا **نیرو** ایک قصر میں بیٹھا عیش وطرب کا لُطف اٹھاتا رہا۔ آخر آٹھویں رات مطربوں کو حکم دیا کہ چنگ وچغانہ پر یہ نظم گائیں جو خود اُس نے اپنی مدح میں نظم کی تھی:۔

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم — چراغ دودۂ عبّاسیانم

. . . .

بران بودم کہ ازاو باش غزنی — چو رودِ نیل جوئے خوں برانم
ولیکن گندہ پیر انند وطفلاں — شفاعت می کند بخت جوانم
ببخشیدم بدیشان جان ایشاں — کہ بادا جان شان پیوند جانم

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۵۰۔

مگر اس "جان بخشی" کا اعلان ہوتے تک "کم سے کم ستّر ہزار" شہری قتل ہو چکے تھے[1] جو بھاگے یا گرفتار ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ غزنی اور گرد ونواح کے شہروں کی وہ عماراتِ محمودی کہ "درآفاق مثلِ آں نہ بود" بالکل مسمار کردی گئیں اور آج بھی کھنڈروں سے اُن کی عظمت و وسعت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے[2]۔ اِس خوفناک انتقام سے سلطان محمود، مسعود اور ابراہیم کے مقبرے مستثنےٰ کردئے گئے تھے ورنہ دیگر سلاطین غزنوی کی قبریں تک کھدوا کے پھینک دی گئیں۔

مگر تقدیر نے خود علاء الدین سے اِن وحشیانہ مظالم کا بدلہ لینے میں دیر نہ کی۔ وہ تھوڑے ہی دن بعد سلطان سنجر سے شکست کھا کے گرفتار ہوا اور دوسال تک اس کے "اُردو" میں نانبائیوں کے تنور سلگاتا اور طرح طرح کی ذلّتیں اٹھاتا رہا۔ پھر اِس قید سے مخلصی ملی تو موت نے فرصت نہ دی وہ غُور پہنچ کر مرگیا اور صرف اس کی بے رحمی اور آتش زنی کی داستانیں باقی رہ گئیں۔

شمس الدین و شہاب الدین

اِس خونخوار فرماں روا نے جسے تاریخ "جہاں سوز" کے لقب سے یاد کرتی ہے، اپنے مرحوم بھائی بہاء الدین

---

[1] راورٹی (حاشیہ صفحہ ۳۴۶)

[2] طبقات ناصری ۵۸۔ راورٹی حاشیہ ۳۵۵

سام کے دو بیٹوں کو بھی قید میں ڈلوا دیا تھا لیکن جب وہ مرا اور اُس کا بیٹا **سیف الدّین محمد** تخت نشین ہوا تو اُس نے چچیرے بھائیوں کو رہا کردیا اور اپنے دربار میں جگہ دی پھر سیف الدّین مارا گیا تو اُمرائے دربار نے انہی میں سے بڑے بھائی شمس الدین (بن بہاء الدین) کو غور کا بادشاہ بنایا (۵۵۶ھ) اور اُس نے کچھ عرصے بعد سلطان **غیاث الدّین** کا لقب اختیار کرکے تینتالیس برس تک کمال شوکت و شان کے ساتھ بادشاہی کی ؎

اِس جواں سال بادشاہ کی فتوحات جنہوں نے عہد محمود کی یاد تازہ کردی تھی، ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں۔ اہل ہند کو صرف اس کے بھائی **شہاب الدّین** سے سابقہ پڑا جس کے نام کو انگریزی تاریخوں میں نئی نئی طرح سے لکھا ہے؎ اصل یہ ہے کہ اپنے بھائی کی تخت نشینی اور بعض فتوحات کے بعد اُس نے "معز الدّین والدّنیا محمد بن سام" کا لقب اختیار کرلیا تھا اور فارسی تاریخوں میں اس کو اکثر اسی لقب سے اور کبھی کبھی اصلی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے انگریز "مؤرخ" جن کا ماخذ الفنسٹن یا تاریخ فرشتہ کا غلط در غلط انگریزی ترجمہ ہے، اِس بات کو نہ جاننے سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں؎

؎ ناموں کی اِس تبدیلی کے متعلق دیکھئے طبقات ناصری صفحہ ۶۹ ؎ الیٹ نے

ہندوستان پر ابتدائی حملے۔

الغرض بھائی کی تخت نشینی کے چند سال بعد جب قبیلۂ غز کو شکست ہوی اور شہر غزنی تیسری مرتبہ غُوریوں کے قبضے میں آیا، تو یہاں کا صوبہ دار معزّ الدّین مقرر ہوا (۵۶۹ھ) اور چونکہ شاہی خاندان کے ایسے عہدہ دار اپنی جگہ قریب قریب خود مختار حاکم ہوتے تھے، لہذا بعض مؤرخوں نے اسی سال کو اس کے عہد بادشاہی کا آغاز قرار دیا ہے حالانکہ بھائی کی زندگی میں خود اُس نے کبھی خود مختار بادشاہ ہونے کا دعوے نہیں کیا اور ہمیشہ اس کا مطیع و فرماں بردار رہا ہے پھر بھی اس میں شک نہیں کہ غزنی کی حکومت محمودِ اعظم کی میراث تھی۔ اس کے سوختہ اور شکستہ درو دیوار بھی ہمت عالی کے حیرت انگیز کرشمے یاد دلاتے تھے۔ اور اگر فیروزکوہ میں رہ کر سلطان غیاث الدّین کو محمود کے قدیم مقبوضات کو واپس لینے کی آرزو ہوسکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خاص محمودی پائے تخت کا مالک اس کے جنوب مشرقی علاقوں کو پھر غزنی کے ماتحت لانے کی سعی نہ کرتا۔ ادھر اُسے اپنے چچا کی طعن یاد تھی جس نے شمس الدّین (یا غیاث الدّین) کی تخت نشینی کا حال سُن کر کہا تھا کہ تیرے بھائی نے یہ نام پیدا کیا دیکھے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴) بھی ایک ضمیمے میں روضتہ الصفا کے حوالے سے اس واقعے کو لکھا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۴۸۴)

کیا کر کے دکھاتا ہے ۔ غرض غزنی کے علاقے کا انتظام درست کرتے ہی وہ فوج لے کر پہلے سندھ پر بڑھا اور ملتان کو قرامطہ کی بدعملی سے نجات دلائی ۔ اسی سال اُچھ فتح ہوا یہاں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی جس کی بیوی مسلمان حملہ آوروں سے مل گئی[۱] (۱۰۰۶ء)

اس راستے سے تین سال بعد اُس نے گجرات پر فوج کشی کی جس کا قدیم پایۂ تخت انہلواڑہ (یا نہروالہ) ان دنوں سرستی (سرسوتی) ندی کے جنوبی کنارے پر ساحل بحر سے کوئی پچاس میل دُور (موجودہ ریاست بڑودہ کے شمالی اضلاع میں) واقع تھا ۔ اسلامی تاریخوں میں یہاں کے راجہ کا نام بھیم دیو لکھا ہے مگر ونسنٹ اسمتھ کی تحقیقات کی رو سے یہ راجہ مول راج تھا[۱]۔ نام جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ ان دنوں اُس کی ریاست شمالی ہند کی سب سے قوی اور بڑی ریاستوں میں شمار ہوتی تھی[۲]۔ مگر معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کو راستے کی خرابی اور حریف کی قوّت کا صحیح اندازہ نہ تھا اور جب اُن کی تھکی ماندی فوج بہ مشکل سندھ کے ریگستان کو طے کر کے انہلواڑے کے سامنے پہنچی تو راجہ کے لشکر کثیر پر کچھ زور نہ چل سکا اور لڑائی میں

---

[۱] اوکس فورڈ ہسٹری ص ۔ ۱۸۹، ۲۱۸ ۔

[۲] ٹاڈ ۔ جلد دوم صفحہ ۷ ۔

تھوڑا سا نقصان بھی مضمحل سپاہیوں کو بددل کرنے کے لئے کافی ہوگیا۔ مُعزّ الدین نے بےنیلِ مرام پسپائی کا حکم دیا اور نقصان و صعوباتِ سفر کے سوا اس حملے میں کچھ اُس کے ہاتھ نہ آیا۔[1]

فارسی تاریخوں میں اس حملے کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی گئی۔ ممکن ہے کہ معزالدین کے سندھی دشمنوں کو انہلواڑے سے کچھ مدد ملتی ہو یا یہ کہ محض سلطان محمود کی تقلید کے جوش میں یہ حملہ کیاگیا ہو۔ بہر حال، اس بے سود مُہم سے اتنا فائدہ تو ہواکہ آیندہ معزالدین کی توجّہ پنجاب کی طرف مبذول ہوگئی اور تین حملوں میں یہ علاقہ اور پائے تخت لاہور اِس کے قبضے میں آگئے۔ (۱۱۸۶ء؁ ۵۸۲ھ؁)

جنگ ترائن

لیکن محمودی مقبوضات میں پنجاب کے بعض علاقے اور خود یہاں کی پرانی راج دھانی یعنی قلعہ بھٹنڈہ ابھی تک مطیع نہ ہوئے تھے۔ لہٰذا معزالدین کو جب اور طرف سے فرصت ملی تو پھر ادھر بڑھا اور ۵۸۶ھ؁ میں یہ مستحکم قلعہ بھی اس نے مسخر کرلیا۔ واضح رہے کہ

[1] بعض مورخوں نے اس ناکامی کو بے جا اہمیت دی ہے اور اسمتھ صاحب نے اسے بہت زور دے کے بیان کیا ہے حالانکہ وہ محض ایک ناکام حملہ تھا اور میجر راورٹی کے الفاظ میں "کوئی موجبِ عاربات نہ تھی" (راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۴۵۲)

قدیم اسلامی تاریخوں میں اس قلعے کا نام کہیں تو "تبرہندہ" لکھا ہے اور کہیں "سرہندہ" جس سے طرح طرح کے مغالطے پیدا ہوتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک فرشتہ اور لُب التواریخ کے قول مان لینے میں کوئی حرج نہیں جنہوں نے صاف صاف "بھٹنڈہ" لکھا ہے۔ کیونکہ دوسری شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہی مقام پہلے "بٹھرِنڈہ" کے نام سے مشہور تھا اور جے پال راجہ کا پائے تخت سمجھا جاتا تھا[1]۔ پس بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اسی لفظ کو بگاڑ کر قدیم مورخ یا اُن کے کاتبوں نے "تبرہندہ" بنا دیا ہو گا۔

الغرض معزالدین اس قلعے میں کچھ فوج اور اپنا عامل مقرر کرکے لاہور کو واپس جا رہا تھا کہ اسے پرتھی راج یا رائے پتھورا کے بہت بڑی فوج کے ساتھ بڑھنے کی اطلاع ملی اور اُس نے اپنا شمالی سفر ملتوی کرکے راجہ کی طرف رُخ کیا۔ طبقات ناصری کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ راجہ کی فوج قریب پہنچ گئی تھی لیکن مسلمانوں کے آنے کی خبر سُن کر وہ پیچھے ہٹ گئی یا در حقیقت محض اُس کی جنگی تیاری سُن کر ہی معزالدین چل کھڑا ہوا تھا، غرض اصلیت جو کچھ ہو اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ فریقین کا مقابلہ تھانیسر سے کچھ دور مقام ترائن پر ہوا جو بھٹنڈے سے تقریباً

[1] گزنی ٹیئر۔ جلد ہشتم، صفحہ ۸۹ -

سومیل مشرق میں واقع تھا[1]۔ غالباً معزالدین کی اسی پیش قدمی کی بنا پر انگریزی تاریخوں میں کمال بے احتیاطی سے یہ لکھدیا گیا ہے کہ وہ غزنی ہی سے رائے پتھورا پر حملہ کرنے کی غرض سے چلا تھا۔ حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے اور حقیقت میں یہ محض اس کی دلیری تھی کہ ہندی فوج کی جنگ پر آمادگی سُن کر لڑائی پر تیار ہوگیا ورنہ اس کی فوج کی تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھی اور پرتھی راج تین ہزار ہاتھی اور دو لاکھ سوار میدان میں لایا تھا[1]۔

کرنل ٹاڈ کا بیان ہے کہ دہلی اس وقت ہندوستان کی چار سب سے بڑی راجپوت ریاستوں میں شمار ہوتی تھی اور ایک سو آٹھ راجہ اس کے باج گزار تھے۔ لیکن واضح رہے کہ اس قوت کا اصلی سبب اجمیر و دہلی کی ریاستوں کا ایک راجہ کی میراث ہوجانا تھا ورنہ خود شہر یا ریاست دہلی کو اس زمانے میں کوئی بڑی اہمیت حاصل نہ تھی اور خود ٹاڈ کی مبہم تحریر سے ظاہر ہے کہ خاص ریاست دہلی کی حدود اس زمانے کی دو قسمتوں (یعنی قسمت میرٹھ اور قسمت دہلی یا انبالہ) سے زیادہ وسیع نہ تھیں[2] اور گمان غالب یہ ہے کہ

---

[1] فرشتہ (بحوالہ زین الآثر) صفحہ ۵۷۔

[2] آے نلز۔ جلد دوم۔ صفحہ ۷۔

خود پرتھی راج نے اس شہر کو اپنا مستقل مستقر بھی نہیں بنایا بلکہ یہاں اس کے بھائی کھانڈے رائے یا گوبند رائے کی حکومت رہی تھی۔

یہی کھانڈے رائے ہے جو ترائن کی پہلی لڑائی میں ہراول کا سردار تھا اور سلطان معزالدین اس کے ہاتھ سے زخمی ہوا۔ یہ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ روایتِ عام کی بموجب اگر ایک خلجی غلام اُسے نہ سنبھالتا تو وہ وہیں گر پڑتا یا پڑا رہ جاتا۔ سچ پوچھئے تو لڑائی اس کے زخمی ہونے سے پہلے ہی بگڑ چکی تھی اور میمنہ اور میسرہ بہت پہلے پسپا ہو چکے تھے کیونکہ مسلمانوں کا پورا لشکر گویا ہندوؤں کی طویل صف کی گود میں آگیا تھا اور جب اُن کے آگے بڑھتے ہوئے بازو رخ بدل کر قلب کی طرف چلے تو مسلمان دونوں جانب سے نرغے میں آنے لگے اور اس کا سب سے پہلے ہراس میمنہ اور میسرہ کی صفوں میں ظاہر ہوا کہ اُن کے سردار گھبرا کر پیچھے ہٹے اور جس طرح بن پڑا اس حلقے سے نکل گئے قلب کی فوج کو خود معزالدین لڑا رہا تھا اس میں بھی انتشار پیدا ہوا اور ایک امیر نے بڑھکر عرض کی کہ بازوؤں کے افغان اور خلجی سردار جنہیں بہادری کے بڑے دعوے تھے، میدان سے فرار ہو چکے ہیں اس وقت مناسب یہی نظر آتا ہے کہ فوراً باقی ماندہ فوج

کو لے کر جانب لاہور واپسی کا حکم دے دیا جائے۔
معز الدین کو یہ رائے پسند نہ آئی اور تلوار کھینچ کر حریف کے قلب لشکر پر حملہ کیا اور اسی میں وہ زخم کھایا جسکا اُوپر ذکر آچکا ہے۔ یہ روایت بھی قرین صحت ہے کہ وہ زخم کھا کر وہیں گر پڑا تھا اور بہت دیر کے بعد رات کو اس کے غلام میدان جنگ میں اپنے نزدیک اس کی نعش ڈھونڈنے آئے اور اس وقت وہ انہیں زندہ مل گیا ۱؎۔

مفرور سپاہی میدان سے چالیس میل کے قریب دُور مقیم تھے۔ وہیں زخمی امیر کو لائے اور پھر لاہور لے گئے جہاں زخم سے شفا پانے کے بعد وہ غزنی آیا اور اس ناکامی کا بدلہ لینے کی تیاریاں کیں ۲؎۔ انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کو جس طرح بیان کیا ہے وہ سراسر نادرست اور فرشتہ کے صریحاً غلط ترجموں پر مبنی ہے تاہم معز الدین

۱؎ فرشتہ۔ ۵۵ بحوالۂ زین المآثر۔

۲؎ چنانچہ اس موقع پر فرشتہ کے انگریز مترجموں نے لکھا ہے کہ سلمانوں کا چالیس میل تک تعاقب کیا گیا اور اسی کو ال فنسٹن اور بعد کے انگریز تاریخ نویسوں نے طرح طرح کے بے بنیاد مبالغوں کے ساتھ بیان کیا ہے حالانکہ تاریخ فرشتہ میں کہیں "تعاقب" کا لفظ تک نہیں ہے۔ اس قسم کی بے شمار اغلاط بلکہ اختراعات اور اصل عبارت کا بالکل الٹا ترجمہ کرنے کی مثالیں جسے خود انگریزی میں دیکھنی ہوں وہ کم سے کم راورٹی کے حواشی پڑھے۔

کی اس شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیرہ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ بھٹنڈہ دوبارہ پرتھی راج کے ہاتھ آگیا اور اُس نے مسلمان حملہ آوروں کو کامیابی سے روکنے کی ایک جوش انگیز نظیر قائم کر دی جس سے اس کی شجاعت و سپہ سالاری کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ چنانچہ ۵۸۸ھ میں جب معز الدین تازہ فوج کے ساتھ دوبارہ لاہور آیا اور پرتھی راج کو اطاعت اور قبول اسلام کا پیام بھیجا تو راجہ نے سخت جواب دیا اور اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ حلیف اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔

دوسری جنگ

اگرچہ اس دوسری لڑائی کا مقام بھی مشتبہ ہے لیکن عام روایت یہی ہے کہ وہ اُسی ترائن کے میدان میں ہوئی جہاں پہلی لڑائی ہوئی تھی۔ فریقین کی جنگی تعداد کا زیادہ تفصیل و صحت کے ساتھ علم ہے اور صاحب تاج المآثر نے اسی واقعے سے اپنی کتاب آغاز کی ہے۔ طبقات ناصری کی تحریر کے علاوہ خود فرشتہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت سی تاریخوں کا نچوڑ ہے اور ان سب کو پڑھکر ہم آج بھی اس خونریز مقابلے کا خاصا صحیح اور صاف تصور ذہن میں قائم کر سکتے ہیں۔ معز الدین کی فوج میں ایک لاکھ بیس ہزار یا کچھ کم، سوار شامل تھے، اور جدھر سے ان کا پرا گزرتا وہاں برچھیوں کی کثرت سے نیزوں کا بن

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۲) ہماری کتاب میں ان کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

نظر آنے لگتا تھا۔ چند ہاتھی بھی تھے مگر انہیں خیمہ وخرگاہ کے ساتھ کئی میل پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ قلب کے دستے بھی بطریق فوجِ محفوظ یہیں، عقب میں تھے اور باقی فوج چار حصوں میں آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے ہر طرف تیر اندازوں کے دستے متیعن تھے جن کا خاص کام یہ تھا کہ آگے نکل نکل کر غنیم کے جنگی ہاتھیوں پر حملہ کریں اور جب وہ بڑھیں تو یہ پیچھے ہٹ کر ہر طرف منتشر ہو جائیں اور تیر باری سے انہیں پریشان کردیں؟

اس کے جواب میں پرتھی راج نے حملے اور مدافعت کی غالباً کوئی خاص تدبیر نہیں سوچی تھی۔ اسے اپنی پہلی فتح اور کثرتِ تعداد پر غرور تھا اور یہ قریب قریب مسلم ہے کہ اس مرتبہ تین لاکھ سوار اور بے شمار پیادہ و تیر انداز اس کے ہمرکاب تھے۔ ڈیڑھ سو راجہ اور راج کمار اپنے اپنے دستے لے کر آئے اور قسمیں کھا کھا کر شریک جنگ ہوئے تھے کہ یا ماریں گے یا اسی جگہ مرجائیں گے اور میدان سے پیچھے قدم نہ ہٹائینگے اس جوش و خروش کا کچھ اندازہ چاند یا چند بھاٹ کے گیتوں سے بھی ہوتا ہے جو پرتھی راج کا مدح خواں تھا اور جس نے ان واقعات کو اپنی طول طویل مثنوی ''پرتھی راج راسو'' میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے کہ بعد کی تحریفوں نے اس مجموعے کی تاریخی وقعت

بالکل غارت کردی تھی اور اسی طرح کرنل ٹاڈ کی تحریر بھی ہمارے لئے کارآمد نہیں جو درایت یا صحتِ روایت کا ذرا بھی

۱؎ چاند اور اس کی کتاب کے متعلق سرچارلس لائل کی محققانہ رائے بجنسہٖ ذیل میں ترجمہ کی جاتی ہے:۔

"چاند جو بھاٹوں کے خاندان سے ہے، لاہور کا باشندہ تھا جہاں اس کے وقت میں (تقریباً ایک سو ستر سال پہلے سے) مسلمانوں کی حکومت قائم تھی اور اس لئے اس کی نظم میں بہت سے فارسی الفاظ موجود ہیں۔ لیکن اس کتاب کا جو نسخہ اب موجود ہے وہ سترہویں صدی کے اوائل میں یعنی چاند کی وفات کو چار سو برس سے بھی زیادہ گزرنے کے بعد، میواڑ کے راجہ امرسنگھ نے ازسرنو تحریر کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ شبہ کرنے کی معقول وجہ ہے کہ آیا اس میں چاند کی اصل نظم کسی حد تک بھی اپنی پہلی صورت میں باقی رہی یا نہیں۔ کیونکہ جس قسم کے واقعات اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں وہ ہمارے شبہ کو اور قوی کرتے ہیں۔ مثلاً اس میں جتنی تاریخیں لکھی ہیں، وہ سیال اس کی تحقیقات کے بموجب اصلی سنین سے قریب قریب نوے برس کا فرق رکھتی ہیں۔ پھر یہ کہ اس میں قصے کے سورما پرتھوی راج اور سلطان شہاب الدین (محمد غوری) کی بہت سی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے صرف آخری میں اسے فتح ہوئی ورنہ ہر دفعہ اسی نے شکست کھائی گرفتار بھی ہوا اور فدیہ دیکر چھوٹا۔ حالانکہ ہم عصر اور مستند فارسی تاریخوں میں آخری فتح سے پہلے صرف ایک لڑائی کا حال ملتا ہے جس میں سلطان کو شکست ہوئی مگر وہ اس قدر بھی بیچ کر لاہور چلا آیا تھا۔ کتاب کی پندرھویں فصل میں مغلوں کی آمد کا بھی

لحاظ نہیں کرتا یا نہیں کرسکتا اور بے تکان خیالی افسانے لکھتا چلا جاتا ہے ؎

فرشتہ کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ لڑائی سے کچھ پہلے فریقین میں جو خط کتابت ہوئی اُس نے راجپوتوں کو اس قدر مطمئن کردیا تھا کہ انہیں مسلمانوں کی طرف سے پیش قدمی کا خیال نہ رہا تھا اور اسی لئے جب یکا یک طبل ددمامہ پر چوب پڑی اور دور سے پرچم سرخ وسیاہ جن پر "نصر من اللّٰہ" لکھا ہوا تھا ہوا میں لہراتے نظر آئے تو وہ حیران ہوگئے اور بہت جلد اپنی صفوف آراستہ کر کے میدان میں داخل ہوئے اور تیسرے پہر تک جان توڑ کے لڑتے رہے ؛ لیکن مُعزّالدّین کی سپہ سالاری محض جاں بازی کا زور نہ چلنے دیتی تھی۔ صبارفتار گھوڑوں پر اس کے سدھے ہوئے تیرانداز ہندی بازوؤں کی صفیں اُلٹے دیتے تھے اور غالباً ان صفوں کے پیچھے دبتے ہی اسلامی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴) سے تیس برس پہلے دکھائی ہے اور ان کا بہادر پرتھوی راج سے شکست کھانا بیان کیا ہے ! اس قسم کی باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ ایسی تحریر بجنسہ ایک ہم عصر شخص کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں (ان تحریفات کے باوجود) کتاب کا معقول حصہ چاند ہی کے زمانے کا ہو اور اس صورت میں جہاں تک جدید تحقیقات کو دسترس ہے، اسی حصہ کو ہندی زبان کی سب سے پہلی تحریر مانا جائے گا۔" (انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۳ صفحہ ۴۸۴)۔

فوج قلب پر ٹوٹ پڑی اور ہندی سپاہ کا دل بادل پراگندہ ہونے لگا۔ پرتھی راج کے جنگی ہاتھی بازوؤں کی فوج کی امداد اور کبھی ان قلبی حملوں کی روک تھام کے لئے دوڑتے دوڑتے تھکے جاتے تھے۔ ان عظیم الجثہ حیوانات کا طیش و غضب میں اپنی سونڈوں کو پیچ و تاب دے کر چنگھاڑیں مارنا، بہادروں کا دل ہلائے دیتا تھا۔ ان کی جھولوں میں جو آئینے لگے ہوئے تھے، وہ سورج کی کرن سے چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ مگر غوری شہسواروں کے دلوں میں اس کالی بلا کا خوف تھا بھی تو بہت جلد زائل ہوگیا کیونکہ جب ہاتھی اُن کا رُخ کرتے تو وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کے دور نکل جاتے اور پلٹ پلٹ کے تیروں کی بوچھار کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہاتھیوں کے بدن میں تیروں نے گھس کر اُنہیں خار پشت سے مشابہ بنا دیا تھا۔"

معلوم ہوتا ہے اب ہندی فوج سمٹ کر وسط میں جمع ہو رہی تھی اور اُس نے آگے بڑھکر حملہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا تھا مگر اس کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اسلامی رسالوں کے پیہم حملے زیادہ کارگر نہ ہوتے تھے اور وہ اپنی جگہ قدم جمائے ہوئے لڑ رہی تھی۔ یہ رنگ دیکھکر معزالدین نے جو قلب کی فوج کو لئے ابھی تک الگ کھڑا تھا، میان سے تلوار کھینچ لی اور اسی اشارہ پر بارہ ہزار تلواریں ایک ساتھ میان سے باہر نکل آئیں۔ سواروں نے اپنے برچھے گھوڑوں

کے کان پر سیدھے رکھ لئے اور گھوڑے اُڑا کر غنیم پر آگرے۔ معزالدّین کے تازہ دم رسالے کا یہ حملہ نہایت سخت تھا۔ بے دل راجپوت اس کی تاب نہ لا سکے بلکہ پہلے ہی تصادم میں اُنھوں نے پیٹھ پھیر دی اور ہندی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔

اس لڑائی میں گوبند رائے یا کھانڈے رائے والئی دہلی اور بہت سے راجپوت سردار مارے گئے۔ خود پرتھی راج فرار ہوگیا تھا مگر میدانِ جنگ سے چند کوس کے فاصلے پر گرفتار ہو کے مارا گیا یا دوسری روایت کے بموجب غزنی تک پہنچ کر قید میں مرگیا۔ فریقین کے نقصانات کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں۔ تاج المآثر میں ہندی مقتولین کا شمار ایک لاکھ بتایا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب کا مصنف انشا پردازی کے زور میں صحت کی چنداں پروا نہیں کرتا اور ایسے جزئی واقعات کے متعلق اس کی سرسری شہادت کافی نہیں۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی لکھنے کے لائق ہے کہ جنگ میں پرتھی راج کی طرف سے افغان (اجیر؟) سپاہی[1] اور معزالدّین کی طرف سے اس کے باج گزار راجہ جموں کا بیٹا خود اپنے ہم مذہبوں کے خلاف لڑنے آئے تھے[2]۔

[1] فرشتہ ۵۸۔ ٹاڈ کا بیان ہے کہ قنوج اور نہروالہ کی فوج میں تاتاری سپاہی نوکر رکھے جاتے تھے۔ (جلد اوّل صفحہ ۲۱۴)

[2] راورٹی۔ حاشیہ ۴۶۶

لڑائی کے نتائج

اس معرکے نے ریاست اجمیر و دہلی کو مسلمانوں کا مطیع بنادیا تھا۔ لیکن قبولِ اطاعت اور خراج گزاری کے وعدے پر دونوں جگہ کے راج برقرار رکھے گئے اور مسلمانوں کے مستقل قبضے کی حدود موجودہ ضلع انبالہ سے آگے نہ بڑھیں۔[1] چنانچہ اُن کا سرحدی مستقر ابھی تک کہرام اور سمانہ تھا اور غزنی جاتے وقت ان کی حفاظت فاتح نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کردی تھی۔ مگر دہلی کے راجہ کی اطاعت محض دفع الوقتی کے طریق پر تھی اور جب ایبک ہانسی اور میرٹھ کے سرکشوں کا قلع قمع کررہا تھا، اُس نے بھی بغاوت کی۔ قطب الدین کو چند روز محاصرہ کرنے کے بعد دوبارہ دہلی کو تسخیر کرنا پڑا اور قلعۂ کول (یا علی گڈھ) کی فتح سے "ریاستِ دہلی" کا پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں دہلی مسلمانوں کا مستقر بن گئی لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ خود معز الدین ابھی محض اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کا ماتحت صوبہ دار تھا اور دہلی کے نئے حاکم (قطب الدین) کو تو اِس وقت تک "غلامی" سے بھی آزادی نہیں حاصل ہوئی تھی۔

فتح قنوج

اِن فتوحات نے اسلامی حکومت کی سرحدیں کئی ہندو ریاستوں کے قریب تک پہنچا دیں جن میں قنوج کا راجہ سب سے

[1] سمانہ دہلی سے تقریباً ڈیڑھ سو میل اور کہرام (گھرام یا رام گڑھ) اس سے بھی کچھ کم فاصلے پر، آج کل پٹیالے کی ریاست میں واقع ہیں۔

زیادہ قوی تھا۔ اس شہر کی عظمت و شہرت کا پہلے ذکر آچکا ہے اور گو اب یہ ایک معمولی ریاست کا پائے تخت رہ گیا تھا اور اس کے مغربی ہمسائے یعنی دہلّی کے تمار یا توار راجپوت بھی اس کی بالادستی تسلیم نہ کرتے تھے، بایں ہمہ قرائن کہتے ہیں کہ مُعزالدّین کا ہم عصر راجہ جے چند ہندوستان کے سب سے دولت مند اور طاقتور راجاؤں میں شمار ہوتا تھا اور ٹاڈ کی روایت صحیح ہو تو اس کے پاس کئی لاکھ پیادہ اور تیس ہزار زرہ پوش سواروں کی فوج تھی[۱]۔ پرتھی راج سے سیاسی رقابت کے علاوہ اس کی عداوت کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ یہ نوجوان راجہ سرِدربار جے چند کی بیٹی کو لے کر بھاگا اور لڑتا بھڑتا اپنے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ پس ترائن کی جنگ میں پرتھی راج کو قنّوج سے کسی قسم کی مدد نہیں ملی تھی مگر اس بنا پر بعض تاریخ نگاروں کا یہ قول کہ اُس نے مسلمانوں کی اعانت کی، محض بے بنیاد ہے۔ بے شبہ وہ پرتھی راج کا مخالف تھا لیکن مسلمانوں کا دوست نہ تھا اور جب اُنہوں نے ریاست دہلی پر مستقل قبضہ کیا تو خود جے چند نے اُن پر حملے کی تیاریاں کیں[۲]۔

والئ دہلی کے پاس ابھی تک پچاس ہزار سوار سے زیادہ فوج نہ تھی اور اس کو ناکافی سمجھ کر خود مُعزالدّین

---

[۱] اے گلز۔ جلد دوم صفحہ ۷۰۶

[۲] راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۴۷۰

غزنی سے ہندوستان آگیا تھا لیکن لڑائی میں زیادہ تر قطب الدین ہی کی فوج نے حصہ لیا اور غزنی کے صرف ہراول کی مدد سے جے چندر کو موضع چندواڑ یا چنداور پر شکست دی[۱]۔ میجر راورٹی کا قیاس ہے کہ غالباً یہ وہی مقام ہے جو اٹاوے سے چند میل جنوب مشرق میں، آج کل "چندوال" کہلاتا ہے[۲]۔ راجہ جے چندر اس لڑائی میں مارا گیا اور نہ صرف قنوج بلکہ ہندوستان کا "دل" یعنی گنگا جمنا کا دوآبہ (بنارس تک) مسلمانوں کے قبضے میں آگیا (۵۹۰ھ) اور اس کے ولایتِ دہلی سے علیحدہ، تین صوبے بنادئے گئے کول، بداؤں اور اودھ جہاں کے والی یا عامل براہِ راست معزالدین کے ماتحت تھے[۱]؛ اسی طرح جب سال ڈیڑھ سال کے بعد قلعۂ تھنکر (بیانہ) فتح ہوا تو وہاں ایک علیحدہ والی مقرر کردیا گیا[۲]۔

اِس واقعے کے بعد خود معزالدین کو کئی سال تک ہندوستان آنے کی فرصت نہیں ملی اگرچہ یہاں کے صوبوں سے

---

[۱] اِن صوبوں کی صاف صاف تصریح نہ ہونے سے، بعد کی تاریخوں میں سخت غلطی پیدا ہوگئی ہے اور اس تمام علاقے کا حاکم قطب الدین ایبک کو سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ عرصے تک وہ اس کے ماتحت نہ تھے جیسا کہ طبقات ناصری سے ثابت ہے۔ مگر اس کے ثبوت تاریخ مذکور کے مختلف مقامات پر منتشر ہیں۔ راقم الحروف نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری ۱۴۸۔ راورٹی حواشی صفحہ ۴۶۹ و ۵۱۰[۲]

ہر سال محاصل کی رقم اور واقعات کی اطلاع اسے پہنچتی تھی اور وہ مناسب وقت احکام بھیجتا رہتا تھا۔ ان ہندوستانی صوبوں کے مختصر حالات آئندہ ہماری نظر سے گزریں گے۔ لیکن اس فصل کو ختم کرنے سے پہلے بعض واقعات لکھنے ضروری ہیں جن میں پہلا یہ ہے کہ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۳ء میں سلطان غیاث الدین نے انتقال کیا اور معزالدین باضابطہ سلطان اعظم کے لقب سے ملقب ہوا۔ مگر اُس نے پائے تخت نہیں بدلا بلکہ غور میں اپنے ایک بھتیجے کو حاکم بنا کے خود غزنی میں رہا اور یہیں سے وہ جنگی مہم خوارزم لے گیا جس کے آخر میں سخت شکست ہوی اور وہ رنجیدہ و ناکام واپس آیا۔ شاہِ خوارزم سے مصالحت ہوگئی تھی لیکن سلطان فوج کی از سرِ نو تنظیم کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں سرحدِ ہند کے کھوکھروں کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ یہ سرکش و جنگجو قوم پشاور سے لاہور کے قریب تک شمال مغربی پنجاب کے پہاڑی علاقے میں پھیلی ہوی تھی اور سلطان کی پچھلی شکست نے اسے اتنا دلیر کردیا تھا کہ ان کی قزاقی کے خوف سے لاہور کا صوبہ دار سالانہ محاصل کی رقم غزنی نہ بھیج سکا اور معزالدین کو ان سرکشوں کی تادیب کے واسطے خود ہندوستان آنا پڑا۔ حکم کے مطابق غالباً خود قطب الدین ایبک دہلی سے کمک لے کر پہنچ گیا تھا اور ان بادشاہی فوجوں نے گھیر گھیر کر باغیوں کو کئی شکستیں دیں اور

آخر اُن کے سرداروں نے ہتیار ڈال دئے پھر مالگزاری کی باقیات لے کر انہیں معافی دے دی گئی ۔ (۶۰۲ھ)

سلطان کا قتل

اس مہم کے بعد سلطان واپس جارہا تھا اور جہلم کو عبور کرچکا تھا کہ چند باطنی فدائیوں نے اُسے خیمہ میں گھس کر دوپہر کو سوتے میں، یا دوسری روایت کے بموجب، مغرب کی نماز پڑھتے میں قتل کردیا (۶۰۲ھ) اور خود بچ کر نکل گئے[1] بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس جُرم کا ارتکاب کھوکھروں کی ایک جماعت نے کیا جس کے رشتہ دار پچھلی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ لیکن اس عہد کی قریبی تاریخوں اور دیگر شہادتوں سے یہ امر یقینی نظر آتا ہے کہ قاتل فرقۂ ملاحدہ کے چند فدائی تھے اور انہی نے بعد میں یہ بے بنیاد افواہ مشہور کردی تھی کہ اس قتل کے بانی امام فخرالدین رازی[2]

[1] فدائیوں کی جماعت کا خاص کام یہ تھا کہ وہ اپنے سرگروہ یا امام کے حکم کی بموجب ہر ایسے سلطان بادشاہ یا عالم کا جو اس فرقۂ ملاحدہ کا مخالف ہو، کام تمام کردیں۔ سلطان معزالدین سے اِن کی عداوت کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ اُس نے سندھ میں قرامطہ کا استیصال کیا اور خود کہستان (ایران) میں باطنیوں کو سخت شکستیں دیں بلکہ معلوم ہوتا ہے اِس کی سرپرستی میں جو علما اس فرقے کے عقائد کی تردید و تکذیب کررہے تھے، اُس نے اخلاقی اور مذہبی طور پر باطنیوں کو سخت نقصان پہنچایا اور بہت سے لوگ اُن کے عقائد سے تائب ہوکر پھر جمہور اہل اسلام سے آملے۔

[2] امام ممدوح جنہوں نے تفسیر، علم کلام، اصول فقہ اور نیز طب میں نہایت

ہیں جن کے شاہ خوارزم کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے ؎

۲۔ "ملوکِ معزیہ" (ہند میں)

معزی غلام اہل ہند کو سلطان معزالدین سام کے صرف اوصاف سپہ سالاری دیکھنے کا موقع ملا اور اسی لئے بخوفِ طوالت ہم نے اس کے ذاتی اوصاف بیان کرنے سے پہلو تہی کی ورنہ اس کے سوانح پر تفصیلاً غور کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ہم عصر مصنفین نے اس کی مدح میں جو کچھ لکھا وہ محض مبالغہ یا بادشاہ سرائی نہیں بلکہ سچی تعریف ہے جس کا وہ قرار واقعی مستحق تھا۔ اور یہ مصنف متفق ہیں کہ علاء الدین جہاں سوز جیسے خونخوار چچا کا یہ مسکین بھتیجا نہایت "خدا ترس، عادل، رعایا پرور و فیاض بادشاہ تھا"[ا] غلاموں پر اس کی شفقت ضرب المثل ہے کہ اس بے بس گروہ کے صدہا افراد کو کمال توجہ سے بہترین تعلیم وتربیت دلاتا اور اولاد کی مثل عزیز رکھتا تھا۔ خود اس کے نرینہ اولاد نہ تھی اور اسی بنا پر جب کسی مصاحب نے متاسفانہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳- ضخیم اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں ہرات کے رہنے والے تھے۔ زندگی میں تصنیف سے بڑھکر اُن کے وعظ کی دھوم تھی اور خود سلطان معزالدین کے لشکر میں عرصے تک اُنہوں نے باقاعدہ ہر ہفتے وعظ کہا ہے؛ ۶۰۶ھ میں انتقال ہوا؎ (منتخب التواریخ جلد اول ص ۵۳- نیز دیکھو الفوائد البہیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) [ا] راورٹی حاشیہ صفحہ ۴۸۷۔

یہ تمنّا ظاہر کی کہ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند عطا فرماتا کہ اس وسیع سلطنت کے وارث ہوتے اور آپ کا نام روشن کرتے۔ تو سلطان نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ بادشاہوں کے صرف چند بیٹے ہوا کرتے ہیں مگر مجھے خدا نے ہزاروں فرزند عطا فرمائے ہیں جو میرے بعد سلطنت کے وارث اور میرا نام قائم رکھنے والے ہوں گے یہ اور یہ محض قول نہ تھا بلکہ امیرانہ تربیت اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے غلاموں کو دے کر اُس نے عملی طور پر اس بات کی تصدیق کردی تھی کہ وہ اپنا آئندہ وارث انہی غلاموں کو بنانا چاہتا ہے جو حسب قابلیت ترقی کر کے منصبِ امارت تک پہنچ جاتے تھے ؎

سلطان تاج الدین یلدُز

ان میں چار یا پانچ وہ خوش نصیب غلام تھے جنہوں نے اپنے شریف آقا کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے حصّوں پر ایک عرصے تک مستقل فرماں روائی کی۔ باقی وہ جو امارت یا سپہ سالاری کے منصب تک پہنچے شمار سے باہر ہیں ؎ مگر بیان کرتے ہیں کہ ان میں سلطان مُعز الدین کو تاج الدین یلدُز (ایلدوز) سب سے زیادہ عزیز تھا اور کم سے کم خاص غزنی میں وہ اپنا جانشین اسی کو بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اِس وصیت کے مطابق سلطان کے بھتیجے (فرماں روائے غور) نے بھی یلدُز کی بادشاہی تسلیم کرلی تھی اور وہ بیرونِ ہند،

علاقے کا با ضابطہ فرماں روا ہوگیا تھا۔ لیکن جب اُس نے دریائے سندھ کے مشرق میں ملک پنجاب پر تصرّف کرنا چاہا تو قطب الدّین ایبک نے جو ممالک ہند میں خود اپنی بادشاہی کا اعلان کرچکا تھا، مقابلہ کیا اور تاج الدّین کو شکست کھاکر کرمان میں پناہ لینی پڑی۔ سلطان قطب الدّین کا خاص پائے تخت غزنی پر قبضہ ہوگیا تھا لیکن وہ فتح کی خوشیاں منانے ہی میں رہا اور اس کا حریف یک بہ یک دوبارہ غزنی آپہنچا۔ قطب الدّین کو بدقت بھاگ کر ہندوستان واپس آنا پڑا اور شہر پھر سلطان تاج الدّین کے قبضے میں آگیا۔ یہ غالباً ۶۰۵ھ کا واقعہ ہے اور اس کے سات برس بعد تاج الدّین نے پھر ایک مرتبہ ہندوستان کا رُخ کیا تھا لیکن سلطان شمس الدّین کے ہاتھ سے شکست کھائی اور گرفتار ہوکر بداوں لایا گیا اور وہیں وفات پائی۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانے تک وہاں اس کی قبر "زیارت گاہِ مردم" تھی[1]۔

قباجہ اور طغرل

سلطان کا ایک اور غلام ناصر الدّین قباجہ (یا قُباچہ[2]) تھا

---

[1] منتخب التواریخ۔ صفحہ ۵۶۔

[2] قیاسِ عام کی بموجب عربی لفظ "قبا" پر فارسی حرف تصغیر کا پیوند لگاکر یہ مرکب بنایا ہے جس کے معنی "چھوٹی قبا" کے ہوں گے۔ اس کا معرّب قباجہ ہوا لیکن بعض فارسی مصنف فارسی "چ" کو قائم رکھتے ہیں اور قباچہ ہی لکھتے ہیں۔

جس نے اپنے آقا کی وفات کے بعد سندھ میں بادشاہی کا اعلان کیا اور بائیس برس بڑی سطوت کے ساتھ وہاں حکومت کرتا رہا۔ سلطان تاج الدّین اور قطب الدّین سے بارہا اس کی لڑائیاں ہوئیں اور یہ تینوں حریف شمالی پنجاب پر دعوئ ملکیّت کرتے رہے لیکن سلطان شمس الدّین کے زمانے میں دہلی کی سلطنت اس قدر قوی ہوگئی کہ کوئی حریف اس کا ہم پلّہ نہ رہا اور آخر میں افواجِ دہلی نے خود سندھ پر پیش قدمی کی۔ ۶۲۴ھ میں یہ مُلک فتح ہوگیا اور قباچہ نے دریا میں ڈوب کر اپنی جان دے دی۔

قطب الدّین ایبک کا ایک اور حریف بہاؤالدّین طغرل سلطان معزالدّین کا بہت قدیم اور محبوب غلام تھا جسے (غالباً ۵۹۱ھ میں) سلطان تھنگر (بیانہ) کا والی مقرر کرتے وقت وعدہ کرگیا تھا کہ اگر اُس کی کوششوں سے قلعۂ گوالیار فتح ہوا تو وہ علاقہ بھی طغرل کے سپرد کردیا جائے گا۔ طغرل کی فیاضیاں مشہور تھیں اور دُور دُور سے لوگ آکر اس کی سرکار میں ملازمت کرتے تھے۔ رہنے کے واسطے اُس نے ایک نیا قلعہ "سلطان کوٹ" تعمیر کیا تھا اور خاص گوالیار کے قریب اس قسم کے مورچے تیار کرادیئے تھے کہ فوجیں اطمینان کے ساتھ مقیم رہ کر اہلِ قلعہ کو پیہم حملوں سے تنگ کرسکیں۔ اس تدبیر نے گوالیار والوں کو بالکل عاجز کردیا اور جب طغرل کے مقابلے میں

کسی طرح مدافعت نہ کرسکے تو اُنھوں نے ایک اور چال چلی کہ خفیہ طور پر اپنے آدمی بھیج کر قطب الدین ایبک سے مصالحت کرلی اور قلعہ اس کے فرستادہ اشخاص کے حوالہ کردیا۔

طغرل کو یہ اطلاع ہوی تو نہایت ناراض ہوا اور عجب نہ تھا کہ اُس کی ایبک سے جنگ چھڑ جائے لیکن یہ نوبت آنے سے پہلے اُس نے وفات پائی اور تقدیر نے قطب الدین کا ایک خطرناک حریف کم کردیا۔ (۶۰۲ھ ؟)

محمد بن بختیار خلجی۔

ہندوستان میں سلطان مُعزالدین کا ایک اور مشہور سردار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی ہے جس کے نام، قومیت اور حالات لکھنے میں انگریزی موّرخوں نے عجیب عجیب غلطیاں کی ہیں۔ اختصار کے لئے بعض فارسی تاریخوں میں اس کا نام "محمد بختیار" لکھا ہے اور درحقیقت یہاں اضافت محذوف، اور "محمد بن بختیار" مراد ہے۔ لیکن دوسری غلطی، یعنی محمد بن بختیار کو قوم کا افغان اور مُعزالدین یا قطب الدین کا غلام بنانا، بعض انگریز "موّرخوں" کی ذاتی اختراع ہے جس کا کسی ماخذ سے ثبوت نہیں مل سکتا۔ راورٹی نے "انگریزی اہل تحقیق" کی جن مضحکہ انگیز اغلاط کی سختی سے تردید کی ہے، ان میں سے ایک یہ بات بھی ہے۔ میجر موصوف لکھتے ہیں کہ "خلج" خالص ترکی قبیلہ ہے اور اس قوم کی ہر تاریخ میں ان کا حال موجود ہے۔ اس قبیلے کے بعض گروہ زیر نظر عہد سے کچھ مدت پہلے

افغانستان کے جنوب مغربی علاقے میں آبسے تھے اور پھر غور و غزنی کی فوجوں کے ساتھ ہندوستان میں آئے؛[1]
غرض، اختیار الدین یا محمد بختیار خلجی اسی ترکی قبیلے کا سپاہی تھا اور اسے خدا نے فراست و شجاعت کے ساتھ غیر معمولی جسمانی قوت عطا کی تھی۔ مگر اس کی قد قامت اور صورت کچھ ایسی غیر متناسب تھی کہ غزنی اور دہلی دونوں جگہ کے بھرتی کرنے والے عہدہ دار نے اسے فوج میں کوئی عمدہ خدمت دینے سے انکار کردیا اور وہ بداؤں ہوکر اودھ کے صوبہ دار ملک حسام الدین کی سرکار میں آیا جہاں جنگی خدمات کے صلے میں اسے بہت جلد پرگنۂ بھگوت اور بھیولی جاگیر میں عطا ہوے جو موجودہ مرزاپور و بنارس کے اضلاع میں واقع تھے؛ یہ سہارا پاکر محمد بختیار نے منیر و بہار کے قریبی اضلاع پر حملے کرنے شروع کئے اور تھوڑے ہی دن میں اس کی شہرت نے بہت سے خلجی سپاہیوں کو اس کے گرد جمع کردیا؛

فتح بہار و بنگالہ

واضح رہے کہ اس وقت، یعنی چھٹی صدی ہجری یا بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم سے کم ملک بہار کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی۔ رام پال کے بعد جس کا سنہ وفات اتفاقاً (۱۱۳۰ء یعنی) ۵۲۴ھ کو قرار دیا گیا ہے پال خاندان کی حکومت میں زوال آگیا تھا اور سین خاندان کے راجہ

[1] راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۴۸۔

صرف مشرقی بنگالے کے حاکم تھے۔ غربی بنگالے اور بہار میں کوئی مرکزی سلطنت ایسی نہ تھی کہ محمدؐ بن بختیار خلجی کی یورشوں کا خاطر خواہ انسداد کرسکتی۔ حتیٰ کہ مشہور وقایع نویس تارناتھ اور بعض بنگالی مصنفوں نے رام پال کے ساتھ اس خاندان کی حکومت کو ختم کردیا ہے حالانکہ اس کے بعد پانچ راجہ گدی پر بیٹھے[1] اگرچہ ان کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی اور قیاس چاہتا ہے کہ دستور کے موافق یہاں بھی ہر علاقے کا زمیندار خود مختار رئیس بن گیا ہوگا۔

اوّل اوّل محمدؐ بن بختیار خلجی کی سہل فتوحات کا بڑا سبب یہی طوائف الملوکی تھی جس کی انگریزی تاریخوں میں صراحت نہ ہونے کی وجہ سے سخت غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہ تاریخ نویس فاتح کو معمولی جاگیردار کی بجائے مسلمانوں کی شاہی افواج کا سپہ سالار اور سلطان معزالدین یا قطب الدین کا فرستادہ سردار بتاتے ہیں جو سراسر غلط ہے[2] بے شبہ

---

[1] ارلی ہسٹری آوف انڈیا صفحہ ۴۰۱۔

[2] "کرانکلز اوف دی پٹھان کنگز" صفحہ ۱۱۰ جس میں محمدؐ بن بختیار کو اودھ کا "سپہ سالار" بتایا گیا ہے۔ مارش مین اور دیگر درسی تاریخوں کو چھوڑ کر جن میں بالکل بے سروپا روایات درج ہیں، ہندوستان کی تازہ ترین انگریزی تاریخ بھی محمدؐ کو قطب الدین ایبک کا سپہ سالار کیا گیا جنرل، بتاتی ہے۔ (آکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۲۲۱) اور یہ محض نگاہ کی غلطی یا سرسری چوک نہیں ہے

قلعہ بہار و منیر کی تسخیر[۱] کے بعد وہ بہت سے تحائف لے کر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱ ۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے صورت حال کو مطلق نہیں سمجھے اور اسی وجہ سے فتح بہار و بنگالہ کے متعلق ان کی تمام تحریر ایک ناواقف شخص کی فرضی گفتگو نظر آتی ہے؛

[۱] اس تسخیر کے سن میں بہت اختلاف ہے مگر اکثر مورخ ۵۹۹ھ لکھتے ہیں جسے راورٹی صحیح نہیں سمجھتا۔ اس فتح کے متعلق ایک اور روایت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ قلعۂ بہار فتح ہوا تو وہاں ہندوؤں کی بہت سی کتابیں نکلیں اور چونکہ بقول صاحب طبقات ناصری، وہاں کے تمام برہمن لڑائی میں قتل کرا دئے گئے تھے، لہذا ان کا پڑھنے والا کوئی نہ ملا۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب اس پر یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ "ضرور وہ سب جلا دی گئی ہوں گی" (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۲۲۱) اسمتھ صاحب کی "تحقیقات" کے متعلق تو کچھ کہنا سننا فضول ہے جنہوں نے طبقات ناصری کا وہ انگریزی ترجمہ پڑھنے پر بھی جو راورٹی نے کیا ہے اپنی رائے نہ بدلی۔ حالانکہ اس میں سرے سے اس روایت ہی کی تغلیط موجود ہے کہ ان کتابوں کا کوئی پڑھنے والا زندہ نہیں رہا تھا (حاشیہ ۵۵۲) لیکن اس موقع پر یہ صراحت کرنی ضروری ہے کہ درحقیقت یہ کتب خانہ بودھ مت والوں کا تھا اور قصبۂ بہار ابتدا میں انہی کے درویشوں کی ایک خانقاہ تھی۔ بعد میں جب بودھ مت کی صورت اور تعلیم بدلی اور یہ مقام بھی ایک جنگی قلعہ بن گیا تو یہاں کی قدیم خانقاہ اور کتب خانہ محض بزرگوں کی یادگار رہ گیا اور اگر وہاں درویشوں کا کوئی گروہ موجود بھی ہوگا تو یقیناً وہ ان قدیم علوم سے بہت کم واقف ہوگا، جنہیں برہمنو الیا تحلا دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بہار کی تسخیر کے وقت اس کی مختصر آبادی میں زیادہ تر سپاہی پیشہ لوگ تھے جو مسلمانوں کے

قطب الدین سے ملنے آیا، (جو اس وقت غالباً تمام ہندوستان کا اعلیٰ صوبہ دار مقرر کردیا گیا تھا) اور اس کی بہت کچھ تعریف و مدارات کی گئی لیکن یہ ملاقات محض ایک نیم آزاد والی کی حیثیت سے تھی ورنہ قطب الدین کی طرف سے پہلے یا بعد میں اُسے کوئی فوجی امداد نہیں ملی اور اُس نے ان مشرقی صوبوں میں جو کچھ کیا، اپنی قوّت بازو سے کیا۔ الغرض بہار میں اپنی قوّت کو مستحکم کرنے کے بعد محمد بختیار خلجی نے مشرقی بنگالے پر فوج کشی کی۔ وہاں اُن دنوں لکشمن سین کی حکومت تھی (جسے مسلمان مورخ رائے لکھمنیہ لکھتے ہیں) اور اس کا پائے تخت «نوبودیپ» یا نُودِیہ (ندیا) تھا جو کلکتے سے کوئی ساٹھ میل شمال میں واقع ہے۔ سین خاندان کے اس راجہ کی قوت بھی پہلے سے کمزور ہوچکی تھی لیکن محمد بختیار نے اس کے شہر کو جس طرح فتح کیا وہ اس کی دلیری کی حیرت انگیز مثال ہے۔ کیونکہ جب دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتا ہوا وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰۔ ہاتھ سے مارے گئے یا بھاگ گئے اور غالباً انہیں کسی دوسرے قصبے کے ہندوؤں کو بلاکر یہ کتابیں پڑھوانی پڑیں جیساکہ طبقات ناصری میں مجملاً اور زبدۃ التواریخ میں صراحتاً مذکور ہے (ملاخطہ ہو راورٹی کا مذکورۂ بالا حاشیہ) غرض گو تفصیلی حالات موجود نہیں لیکن جو شہادت محفوظ ہے اُسی سے یہ ثابت کرنا دشوار نہیں کہ انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اور جس سے فاتحین کی خونخواری اور وحشیانہ سفاکی دکھانی مقصود ہے، وہ خود لکھنے والوں کی ناواقفیت یا تعصب پر دال ہے۔

شہر کے قریب پہنچا تو اس کی ساری فوج پیچھے رہ گئی تھی اور صرف اٹھارہ سوار ساتھ دے سکے تھے۔ مگر اس اولوالعزم سردار نے کچھ پروا نہ کی اور اُنہی چند سواروں کو لئے ہوئے شہر کے بازاروں سے چپ چاپ گزر کے شاہی قلعے یا محل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ بازاروں کے لوگ یہی سمجھتے رہے کہ وہ کوئی سوداگر ہے اور اپنے گھوڑے دکھانے راجہ کے پاس آیا ہے کہ محل کے پھاٹک پر پہنچ کر اس نے یکایک تلوار کھینچ لی اور دربانوں کو مارتا کاٹتا اندر داخل ہوگیا۔ اس اچانک حملے سے محل بھر میں شور مچ گیا۔ راجہ کھانا کھانے بیٹھا تھا کہ چیخ پکار کی آوازیں آئیں اور وہ ایسا بے حواس ہوا کہ ننگے پاؤں محل کے چور دروازے سے نکل کے بھاگا اور محل یا اندرونی قلعہ پر محمد کا قبضہ ہوگیا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ نڈر سردار اپنے اٹھارہ سپاہیوں کے ساتھ کتنے دن تک محل کی مدافعت کرتا رہا یا یہ کہ خوف زدہ شہر والوں کو اس پر حملہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی؟

بہرحال اُس کی فوج بہت جلد نودیہ آپہنچی اور شہر و مضافات مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔

اس واقعے سے حملہ آوروں کی شجاعت و دلیری کے ساتھ اہل بنگالہ کی بزدلی بھی ثابت ہوتی ہے۔ اِن مرطوب ممالک میں بہت کم جانباز اور جری سپاہی پیدا ہوتے ہیں اور خود مسلمان فاتحین کی نسلیں چند صدی میں کمزور

وضعیف ہوگئیں۔ لیکن جانبازی کے علاوہ معلوم ہوتا ہے محمد بن بختیار کو اپنی جسمانی قوت پر ناز تھا اور وہ جو تنہا ہاتھی سے لڑچکا تھا[1]، پست قامت بنگالیوں کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتا تھا۔

راجہ لکشمن سین نودیہ سے بھاگ کر بکرم پور چلا آیا تھا جو ڈھاکے سے چند میل جنوب مشرق میں واقع ہے، اور وہاں وہ اور اس کی اولاد غالباً مسلمانوں کی باج گزار بن کر عرصے تک حکومت کرتی رہی۔ کم سے کم فاتح کو اب ملک میں کسی حریف کا خوف نہ تھا اور اس نے بہار و بنگالہ میں جابجا اسلامی مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ اسلامی خطبہ، سکہ[2] اور دیگر آئین کو رواج دیا اور اپنا پائے تخت

[1] یہ قطب الدین ایبک سے مذکورۂ بالا ملاقات کے وقت کا واقعہ ہے کہ بعض حاسد امیروں نے محمد بن بختیار کی تعریفیں کرکے تجویز کی کہ اسے ہاتھی سے لڑایا جائے۔ محمد نے کچھ شرم حضور اور کچھ قوتِ خداداد کے بھروسے پر یہ مقابلہ منظور کرلیا اور میدان میں جب ہاتھی (سونڈ اٹھاکے) اس کی طرف بڑھا تو آہنی گرز کی ایک دودستی ضرب اس زور سے اُس کے منہ پر لگائی کہ ہاتھی کو چکر آگیا اور مقابلے سے بھاگ گیا۔ یہ روایت مستند طریق پر منقول ہے اور درایۃً بھی اس کے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ اس واقعے سے چند سال پہلے غور کے دو اور پہلوان بھی جنگی ہاتھیوں سے تنہا مقابلہ کرچکے تھے اور جیساکہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ایک تو ہاتھی کے ساتھ خود بھی ہلاک ہوگیا اور دوسرا اُس کا پیٹ چیر کے سلامت نکل آیا تھا (طبقات ناصری۔ ۱۴۸ و ۵۵)

[2] اس بارے میں طبقات ناصری کی عبارت صاف نہیں ہے لیکن راورٹی اور

لکھنوتی یا گور (گوڑ)، کو بنایا جو نودیہ سے سوسوا سو میل شمال میں گنگا کے دوسری جانب واقع ہے۔ یہ اُس وقت چھوٹی سی بستی تھی۔ محمد بن بختیار نے صوبے کا مستقر اور نئی عمارات بنا کے اُسے بڑی رونق دی اور اسی وجہ سے بعض مورخوں نے اس شہر کی بنا کو اس سے منسوب کردیا ہے۔

تبت کی ناکام مہم۔

لیکن ایسے منچلے سپاہی سے نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ نئے مقبوضات کے انتظام کے بعد اب اُسے بالکل فرصت اور بنگالے کی تازہ دولت قبضے میں تھی۔ یہ سُن کرکہ لکھنوتی سے تبت و ترکستان زیادہ دُور نہیں ہیں، اسے ان ممالک کی فتح کا شوق چرّایا۔ سکھم کے ایک نومسلم سردار نے رہبری کا ذمہ لیا اور محمد بن بختیار دس ہزار سوار لےکر تبت کے ارادے سے روانہ ہوگیا۔ اپنی سرحد سے آگے چند منزل پر اس نے وہ ندی (بنگ متی) پار کی جس پر بہت قدیم محراب دار پُل بنا ہوا تھا۔ اس ندی کا نام فارسی تاریخوں میں نئی نئی طرح سے لکھا ہے اور مُلا عبدالقادر بدایونی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳۔ اوڈورڈ ٹامس کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ خطبہ و سکہ سلطان معزالدین کے نام کا جاری کیا گیا تھا اور بعض فارسی اور انگریزی تاریخوں کا یہ قول غلط ہے کہ اُس نے خود اپنے نام کا سکہ جاری کرایا جو خود مختاری کی علامت سمجھا جاتا تھا (راورٹی حاشیہ ۵۵۹ - نیز دیکھو "کرانکلز آف دی پٹھان کنگز" حاشیہ صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱)

اسے برہم پتر لکھکر تصحیح کرتے ہیں کہ یہی دریا "برہم کدی" کے نام سے مشہور ہے! حال میں اس دریا اور پُل کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ وہ برہم پتر نہ تھا تو اس کا کونسا معاون تھا اور نہ یقینی طور پر اُس مقام کا تعین کیا جاسکتا ہے جہاں تک محمد بن بختیار خلجی کی فوج پہنچی۔ بعض انگریز تاریخ نویسوں کا قیاس ہے کہ وہ سکھم کے علاقے میں موجودہ دارجیلنگ سے کچھ بہت آگے نہیں جاسکا اور یہیں کے قبائل سے جو لڑائی ہوی اس میں فتح پانے کے باوجود بہت سے مسلمان سوار کام آئے۔ اور اُنہیں معلوم ہوا کہ آئندہ اور بھی زیادہ تعداد سے سخت لڑائیاں لڑنی پڑیں گی! غرض محمد بن بختیار نے سرداروں سے مشورہ کیا اور یہ رائے قرار پائی کہ اس وقت مراجعت اور آئندہ سال زیادہ وسیع پیمانے پر فوج کشی کی جائے!

واپسی پر وہ پُل جس سے دریا عبور کیا تھا، ٹوٹا ہوا ملا۔ اِس علاقے کے باشندوں کو مسلمانوں کی ناکام مراجعت کی خبر مل گئی تھی اور اب وہ ہزاروں کی تعداد میں اُن کا یہیں خاتمہ کردینے پر آمادہ تھے۔ میدانی مقابلے میں مسلمان کامیاب ہوئے لیکن اس غیر علاقے میں زیادہ قیام ناممکن تھا۔ کشتیاں میسّر نہ تھیں۔ ناچار اُنہوں نے دریا میں گھوڑے ڈالدئے کہ جس طرح ممکن ہو دوسرے کنارہ

پر پہنچ جائیں جہاں اُن کے حلیف یا باج گزاروں کا علاقہ تھا۔ عبور کی اس خطرناک کوشش میں ہزاروں سپاہی ڈوب گئے۔ محمد بن بختیار خلجی اپنی سرحد میں پہنچا ہے تو اس کے ہمراہیوں میں سے دسواں حصہ بھی بچ کر سلامت نہیں آیا تھا۔ اس ناکامی کے رنج اور صعوبات سفر نے اُسے ایسا بیمار ڈالا کہ پھر وہ اپنے مستقر لکھنوتی تک بھی نہ پہنچ سکا اور چند روز بعد دیوکوٹ ہی میں جو اس کا سرحدی ضلع تھا، وفات پائی (۱۲۰۶ء)۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ایک سردار علی بن مردان خلجی نے اسی بیماری میں اسے قتل کردیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ محض شبہ تھا جس کی بنا پر علی کو گرفتار کیا گیا اور شاید ثبوت فراہم نہ ہونے ہی کے باعث کسی قصاص کی نوبت نہیں آئی۔ یہ پھر قید سے نکل کر وہ سلطان قطب الدین ایبک کے پاس دہلی پہنچ گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے ولایت بنگالہ کی سند لے کر لکھنوتی آیا۔ جب سلطان قطب الدین کا انتقال ہوا تو اُس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا اور اس اعتبار سے بنگالے کا پہلا مسلمان بادشاہ یہی علی بن مردان خلجی ہے۔ اگرچہ، جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے، بنگالے کے مسلمان حاکموں کی یہ خودمختاری کچھ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکی اور علی مردان کے جانشین کو سلطان شمس الدین ایل تتمش نے شکست دے کر

بنگالے میں اپنے نام کا خطبہ و سکہ رائج کرایا اور بہار کو جداگانہ صوبہ قرار دے کے وہاں ایک علیحدہ والی مقرر کیا تاکہ لکھنوتی یا بنگال خاص کے صوبہ داروں کی قوت حد سے زیادہ بڑھنے نہ پائے جن کا دارالسلطنت سے دُور ہونا ہمیشہ اُنہیں خود مختاری کی ترغیب دلاتا رہتا تھا۔

۳۔ سلطان قُطب الدّین ایبک

سلطان قُطب الدین ایبک

مگر ان "مُلوکِ مُعزّیہ" میں سب سے زیادہ اقبال مند، سلطان مُعزالدّین کا ایک بد صورت غلام **قُطب الدین** ہے، جسے چھنگلیا کے ٹُوٹ جانے کی وجہ سے "**ایبک شِل**" یعنی خستہ **انگشت** کہتے تھے۔ اور یہ ہنسی کا عُرف ایسا زباں زد ہوا کہ اس کا پہلا حصّہ بادشاہ ہونے کے بعد بھی قطب الدین کے نام کا جزو بنا رہا حالانکہ اس کے لفظی معنی صرف "**انگشت**" ہیں۔

ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد کہرام و سمانہ میں اس کے والی مقرر کئے جانے کا حال ہم گزشتہ فصل میں پڑھ چکے ہیں۔ جنوب مشرقی پنجاب کے یہ علاقے سلاطین غزنی کے عہد میں بار بار فتح ہو چکے تھے لیکن راقم الحروف کا قیاس ہے کہ سلطان مُعزالدّین غُوری انہیں مستقل طور پر ایک علیحدہ صوبہ بناکر اپنی سلطنت میں

شامل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی پہلی تدبیر، یعنی صرف قلعۂ بھٹنڈہ کو سرحد کی ایک جنگی چوکی بنانا، ناکافی اور ناکام ثابت ہوئی تھی۔ دہلی اور شمالی راجپوتانے کی ریاستوں پر دباؤ رکھنے کے واسطے زیادہ فوج کی ضرورت تھی خاص کر اب، جب کہ اجمیر و دہلی کی قبولِ اطاعت کے ضمن میں ان ریاستوں کے اور چھوٹے چھوٹے راجہ بھی اصولاً مسلمانوں کے باج گزار ہو گئے تھے۔ نظر بریں، فوج کے مصارف نیز دیگر انتظامات کے لئے جنوب مشرقی پنجاب کے اُس علاقہ پر مستقل قبضہ کرلیا گیا، جس میں موجودہ ریاست ہائے اِیں رُوئے ستلج اور قسمت انبالہ کے شمالی اضلاع شامل تھے۔ اس نئے صوبہ کی سب سے جنوبی چھاؤنی ہانسی میں تھی۔

لڑائیاں اور نئی فتوحات

یہ انتظام کرنے کے بعد سلطان معزالدین غزنی چلا گیا تھا لیکن اُس کے نئے صوبہ دار کو بہت جلد میرٹھ اور پھر دہلی پر فوج کشی کرنی پڑی۔ تاج المآثر کی عبارت سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کا راجہ جو کھانڈے رائے (یا گوبند رائے) کا عزیز تھا اور سلطان سے اطاعت کا عہد کرچکا تھا، اب منحرف ہوگیا تھا، لیکن میرٹھ کے متعلق اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ وہاں کے راجہ سے بھی قطب الدین باضابطہ باج گزاری کا اقرار لینا چاہتا تھا اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی

تو اس نے حملہ کرکے یہ قلعہ فتح کرلیا۔ دہلی کی تسخیر میں کسی قدر زیادہ محنت اور دیر لگی لیکن فتح کے بعد اس پر قطب الدین نے قبضہ کرلیا اور کچھ عرصے بعد اسی شہر کو اپنا مستقر قرار دیا جس کے معنی یہ تھے کہ سلطان معزالدین کے نئے صوبے میں اب اضلاع میرٹھ و دہلی بھی شامل ہو گئے[1]

اس اثنا میں پرتھی راج کے بھائی نے اجمیر پر حملہ کیا۔ یہ ریاست پرتھی راج کے بیٹے گولہ (یا گولہ) کے حوالے کردی گئی تھی اور وہ اطاعت و خراج گزاری کے عہد پر قائم تھا۔ روایت میں اس کا نسب مشتبہ بتایا گیا ہے اور شاید راجپوتوں کے اس پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اسے پرتھی راج کا جائز وارث نہیں سمجھتے تھے۔ غرض انہوں نے پرتھی راج کے بھائی بھراج یا ہیم راج کی ماتحتی میں اجمیر کا محاصرہ کرلیا۔ غالباً ریاست اجمیر پر دباؤ رکھنے کی غرض سے مسلمانوں کی ایک جمعیت رنتھنبور میں پہلے سے متعین تھی اور اس موقع پر اس کی سلامتی بھی خطرے میں نظر آتی تھی۔ لہذا خود قطب الدین کو دہلی سے مدد کے واسطے آنا پڑا۔ مگر بھراج اس مرتبہ لڑے بھڑے بغیر میدان سے ہٹ گیا اور قطب الدین راجہ گولہ کو وفاداری کے صلے میں خلعت

[1] تاج المآثر، زیر عنوان "استخلاص میرٹھ و دہلی"، نیز ملاحظہ ہو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۱۶

دے کر واپس چلا آیا (۵۸۹ھ) ظاہر ہے کہ ان فتوحات نے معزالدین کے پہلے انتظامات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کردی تھی اس لئے خود قطب الدین نے غزنی جاکر تمام واقعات اور صورت حال کی اطلاع دی اور اپنے آقا کی مزید خوشنودی اور اعتماد حاصل کر کے دہلی آیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد قلعۂ کول (علی گڑھ) کی تسخیر اور قنوج کے راجہ کی جنگی تیاریاں سن کر معزالدین کا آنا اور دوآب کی فتح کا ذکر اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کردینا مناسب ہوگا کہ گو ان علاقوں میں تین یا کم سے کم دو صوبے علیحدہ بنادئے گئے تھے لیکن غالباً اسی زمانے میں قطب الدین کو صدر صوبہ داری یا اپنے آقا کی نیابت عطا کی گئی جس کے معنی صرف یہ تھے کہ ہندوستان کے دیگر صوبہ دار اپنے محاصل اور سالانہ اطلاعیں قطب الدین کی وساطت سے غزنی بھیجتے رہیں ورنہ اپنی اپنی جگہ پر ان کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی۔ ۵۹۱ھ میں قطب الدین کو پھر بھراج سے لڑنا پڑا جس نے اپنے بھتیجے گولہ کو اجمیر سے نکال کر شہر پر قبضہ کرلیا تھا اور خود دلی کی طرف فوج روانہ کی تھی۔ اس راجپوتی فوج کو شکست ہوئی اور مسلمان اسکا تعاقب کرتے ہوئے اجمیر تک بڑھ آئے۔ بھراج نے باہر نکل کر مقابلہ کیا مگر ہزیمت پائی اور خودکشی کر کے

اپنی جان دی۔ اجمیر پر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا اور اب کے اُنہوں نے اجمیر میں مسلمان والی مقرر کیا کہ گرد و نواح کے سرکش راجپوتوں پر نظر رکھے۔ اسی سلسلے میں قطب الدین نے نہر والہ تک بڑھکر ملک کو دشمنوں سے صاف کرنے کی کوشش کی اور وہاں کے راجہ بھیم دیو کو شکست دیکے بہت دُور تک بھگا دیا؎ (۱۱۹۵ء)

فتح نہروالہ واضح رہے کہ شمالی ہندوستان میں اب یہی ایک بڑی ہندو ریاست باقی رہ گئی تھی اور اگرچہ وہ تا امکان پہلے سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں کو مدد دیتی رہتی تھی لیکن مذکورۂ بالا واقعے نے وہاں کے راجہ کو سخت اندیشہ مند کردیا اوراسی لئے جب آئندہ سال راجپوتانے میں پھر بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ مسلمانوں سے لڑنے پر کمربستہ ہوئے تو نہروالہ کے راجہ نے اُن کی مدد کے واسطے بہت بڑی فوج آراستہ کی کیونکہ درحقیقت اب اُسے خود اپنی ریاست خطرے میں نظر آنے لگی تھی؎

قطب الدین کو دہلی آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ راجپوتوں کے اس نئے جتھے کی اطلاع ملی اور اگرچہ سخت گرمی کا موسم تھا لیکن اُس نے کوشش کی کہ نہروالہ کی فوج کے پہنچنے سے پہلے راجپوتانے کے سرکشوں کا قلع قمع کردے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دن

پہلے ان کے مقابلے میں آپہنچا تھا لیکن اُس دن لڑائی میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مسلمان مارا مار صدہا کوس چل کر آئے تھے اور سفر ختم نہ ہونے پایا تھا کہ لڑائی شروع ہوگئی اور سخت گرمی میں، جو ان کے مزاج و عادت کے بالکل خلاف تھی، وہ راجپوتوں سے معروفِ جنگ ہو گئے[1]۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح ہوتے ہی نہروالہ کی فوج آپہنچی اور مزید کثرت نے دشمن کی ہمّت مضبوط اور مسلمانوں کے حوصلے پست کردئے[1]۔ بایں ہمہ قطب الدّین تھوڑی دیر تک اپنی بے دل فوجوں کو لڑاتا اور ذاتی بہادری سے اپنے سپاہیوں کو جوش دلاتا رہا۔ لیکن جب کامیابی کی کوئی امید باقی نہ رہی، اِدھر زخم کھا کے اُس کے گھوڑے نے اُسے زمین پر گرادیا اور لوگوں نے بہ مشکل اُسے دوسرے گھوڑے پر سوار کیا تو وہ مجبوراً اجمیر کی طرف پسپا ہوا[1]۔

اس کامیابی نے ہندوؤں کو اور بھی دلیر کردیا۔ وہ

[1] عام انگریزی تاریخوں کا ذکر کیا، خود فرشتہ نے اس واقعے کے بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا وہ راورٹی کی تحریر پر مبنی ہے، جس نے اس واقعے کے لکھنے میں بھی حسبِ عادت بڑی تحقیقات اور احتیاط سے کام لیا ہے[1]۔ (دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۲۰)

مسلمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے خاص اجمیر تک پہنچ گئے اور شہر سے کچھ فاصلے پر مقیم ہوکر کئی مہینے تک معمولی لڑائیاں لڑتے رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ مسلمانوں کا پوری طرح محاصرہ نہیں کرسکے اور جب غزنی سے تازہ کمک آنے کی اطلاع ملی تو جلد ہٹ کر منتشر ہو گئے؟

اب قطب الدین نے راجہ نہروالہ سے انتقام لینے کا تہیّہ کیا اور ۵۹۳ھ میں گجرات پر پیش قدمی کی۔ کوہِ آبو کے دامن میں راجہ کی فوج سے نہایت خونریز جنگ ہوی جس میں ایک روایت کے بموجب تقریباً پندرہ ہزار ہندو مارے گئے۔ خود راجہ بچ کر نکل گیا تھا لیکن اس کے پائے تخت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا (ماہِ ربیع الاول ۵۹۳ھ) اور انہوں نے مستقل طور پر اس شہر میں اپنا والی مقرر کردیا۔ بایں ہمہ یہ شہر جزیرہ نمائے گجرات سے باہر واقع تھا اور اس کی فتح سے مسلمان صرف ریاست نہروالہ کے شمال مشرقی حصّے پر قابض ہوسکے۔ خاص جزیرہ نما ابتک ان کے اقتدار سے باہر رہا۔ البتہ اس راجپوت ریاست کی قوت ٹوٹ گئی اور اب وہ مسلمانوں کی ایسی خطرناک حریف نہ رہی جیسی کہ اس جنگ سے پہلے تھی؟

اس نمایاں کامیابی کے بعد معلوم ہوتا ہے قطب الدین کئی سال تک سلطنت کے اندرونی نظم ونسق کی اصلاح

کرتا رہا اور ۵۹۹ھ سے قبل اُسے کسی فوجی مہم کی ضرورت نہ پیش آئی۔ سنہ مذکور میں اُس نے بُندھیل کھنڈ کی ریاستوں پر لشکر کشی کی۔ لڑائی کا ظاہری حیلہ تو یہ تھا کہ یہ راجہ سلطان محمود کے وقت سے خراج گزاری کا جو عہد کر چکے ہیں اس کی تجدید کرائی جائے لیکن قرینہ کہتا ہے کہ درحقیقت وہ دوآب کی حفاظت کے واسطے ان جنوبی ہمسائیوں کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ بُندھیل کھنڈ کے زیر نگیں آنے سے اسلامی سلطنت کی جنوبی حدود کوہستان بندھیاچل تک پہنچ گئیں اور تمام شمالی علاقے پہلے کی نسبت زیادہ محفوظ ہو گئے کیونکہ ان پہاڑوں کے دوسری جانب (یعنی وسط ہند میں)، ابھی کوئی ایسا جنگ جو ہمسایہ نہ تھا جس کی قوّت خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

"آزادی" اور تخت نشینی۔

ان کامیابیوں کے باوجود، جن کے تمام اسلامی ملکوں میں چرچے ہونے لگے تھے، قطب الدین ابھی تک اپنے آقا کا "غلام" تھا اگرچہ نیکدل سلطان اس پر نہایت شفقت کرتا اور اُسے اپنا "پسرِ خواندہ" بنا چکا تھا لیکن اُسے غلامی سے باضابطہ آزادی اپنے آقا کی وفات کے بعد اُس وقت ملی جبکہ سلطان کے شرعی وارث اور غور کے فرماں روا نے اُسے "چتر و امارت پادشاہی و خطاب سلطانی و خطِ آزادی" دیگر ہندوستان بھیجا اور "ملک"

قطب الدّین کی بجائے وہ "سلطان" قطب الدّین ایبک کے لقب سے لاہور میں تخت نشین ہوا - طبقات ناصری میں اس تخت نشینی کی تاریخ ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ درج ہے لیکن بعض تاریخوں میں اسے چند ماہ بعد ربیع الاول ۶۰۳ھ کا واقعہ لکھا ہے[1]

اس کی حکمت عملی۔

بہرحال، اُس کا دہلی سے تخت نشینی کے لئے لاہور آنا خاص مصلحت پر مبنی تھا۔ تعجب ہے کہ اسلامی مورّخ اس واقعے پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے اور نہ انہوں نے قطب الدین کے دوسرے اوصاف بیان کرنے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ فنِ سیاست کا مشاق شاطر تھا؛ کہرام کی معمولی صوبہ داری سے اس کا اتنی جلد بڑھکر تمام ہندوستان کا اعلیٰ صوبہ دار ہوجانا محض سلطان معزالدّین کی عنایتِ خاص کی دلیل نہیں بلکہ درحقیقت اس ترقی میں قطب الدّین کے سپاہیانہ اوصاف کے ساتھ سیاسی قابلیّت کا بھی دخل تھا اور جیسا کہ ہم تحویل گوالیار کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں، وہ ازدیاد قوّت کے لئے شاید اپنے ہم چشموں کے خلاف چالاکی کرنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبہ داروں سے اس کا سلوک نہایت لطف آمیز رہا۔ لیکن اس نرمی اور آشتی کے باوجود اُس نے ان کے دل میں اپنی

---

[1] طبقات۔ صفحہ ۱۴۰۔ نیز ملاخطہ ہو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۲۴ وغیرہ

بالا دستی اور ان کی ماتحتی کا خیال اس طرح جما دیا تھا کہ اس کی تخت نشینی پر لکھنوتی سے نہروالہ تک کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوئی۔

مگر لاہور کا معاملہ دوسرا تھا۔ واضح رہے کہ شمالی پنجاب کا یہ صوبہ سلطان محمود کے زمانے سے خاص غزنی کے ساتھ الحاق کرلیا گیا تھا اور اب تک اسی کے ساتھ کا ایک صوبہ شمار ہوتا تھا۔ پس تاج الدین یلدز کو غزنی کی وراثت کے ساتھ صوبۂ لاہور کا دعویٰ ہوا تو یہ بالکل قدرتی بات تھی لیکن قطب الدین کی پیش دستی اور قوت کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ لاہور میں اس کی تخت نشینی کے صاف معنی یہ تھے کہ اس علاقے کو وہ اپنی سلطنت کا جزوِ لاینفک سمجھتا ہے۔ تلوار نے بھی اس دعوے کی تصدیق کی۔ تاج الدین اور کچھ عرصے بعد قباچہ دونوں شکست کھاکر پسپا ہوئے۔ شمالی پنجاب مستقل طور پر "سلطنت دہلی" کا صوبہ بن گیا۔

بایں ہمہ ہندوستان میں قطب الدین کو آخر تک اگر کسی کا خوف رہا تو وہ یہی شمالی حریف تھا اور جیسا کہ ایک تاریخ میں صراحتاً مرقوم ہے، وہ اپنی وفات تک، اسی یلدز کی فوج کشی کے خوف سے لاہور میں مقیم رہا۔[1]

وفات اور اس کی سخاوت

قطب الدین چوگان کھیلتے ہیں گھوڑے سمیت میدان میں گرا

[1] راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۰۳

اور اُسی صدمہ سے وفات پائی۔ سنہ وفات (۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء) قریب قریب مسلّمہ ہے اور اس کے اوصافِ ذاتی میں بھی ایک وصف ایسا ہے جس کا ہر موّرخ نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ اُس کی سخاوت تھی جس کی بدولت "لک بخش" خطاب پایا اور فرشتہ لکھتا ہے کہ آج تک کسی کی سخاوت کی بہت زیادہ تعریف کرنی منظور ہو تو اہلِ ہند اُسے "قطب الدّین کل" یعنی اپنے زمانے کا قطب الدّین، کہتے ہیں[1] اور سچ پوچھئے تو اس سے بڑھکر شہرت کسی کو کیا حاصل ہوگی کہ چار سو برس تک اس کا نام سخاوت میں ضرب المثل رہے! مگر قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے پہلے اسلامی فرماں روا کی یہ سخاوت اپنے ہم قوموں سے مخصوص نہ تھی بلکہ اس سے ہندو رعایا بھی اسی طرح مستفیض ہوتی تھی جس طرح اس کے ہمراہی مسلمان۔

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۶۳۔

تتمۂ باب سوم

اس عہد کی تاریخیں

آیندہ واقعات تاریخی کو بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ یہاں ہم اس عہد کے تاریخی ماخذوں پر ایک سرسری نظر ڈال جائیں۔ ہر مسلمان کشورکشا کے ساتھ اس کے مورّخ کا ہونا قریب قریب لازمی بات تھی اور اسی لئے فارسی تواریخ میں تمام اسلامی بادشاہوں کے تاریخی حالات خاصی تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں خاص کر جو بادشاہ زیادہ عرصے تک حکمراں رہے یا اپنے وقت کے اقبالمند فاتح گزرے ہیں اُن کے حالات بھی زیادہ مشرّح موجود ہیں لیکن اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخیں بالعموم بادشاہوں کے "جنگی وقایع" کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بیشتر اُن کے رزمیہ کارنامے درج ہیں خاص خاص رفاہی کام، دربار کے جلسے، اور دیگر مشاغل شاہی کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ غیر معمولی حادثے وبا، قحط، زلزلے یا اور بعض واقعات جن کا اثر ہمہ گیر ہو، ضمناً مذکور ہیں ورنہ مجموعی طور پر مورّخ کو بادشاہ کے صرف شخصی سوانح سے بحث ہوتی ہے اور عام اہل مُلک کے متعلق وہ کچھ بھی تحریر نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ سلطنت کے نظم و نسق اور آئین و مناصب یا مُلکی تجارت

و مصنوعات پر بھی اِن کتابوں سے بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ زمانۂ حال کے مؤرخ کی ضروریات ان تاریخوں سے پوری نہیں ہوتیں کیونکہ آج کل تاریخ لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ گذشتہ عہد کے آئین و قوانین، تمدّن و معاشرت اور عام افکار و خیالات کی تصویر دکھانے کی کوشش کرے جس سے حال و مستقبل کے بہتر بنانے میں ہمارے خیال کو راہ ملے اور ہم اپنے اسلاف کے حالات سے کوئی مفید سبق حاصل کرسکیں۔

ان جدید ضروریات کے لحاظ سے بہت کم فارسی تاریخیں ایسی ہیں جو کسی حدتک ہمیں تاریخ ہند لکھنے میں مدد دے سکتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ حال میں ہندوستان کی جو انگریزی تاریخیں لکھی گئیں اور مدارس کے نصاب میں داخل ہیں، اُن میں کُشت و خُون کی بے لطف داستانوں کے سوا کوئی کام کی بات نہیں نظر آتی۔ مگر اس کا الزام خود تاریخ لکھنے والوں کی ناواقفیت اور بے پروائی کو دینا چاہیئے کہ انہوں نے اُس عہد کے حالات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور دو چار فارسی تاریخیں سامنے رکھکر اپنی کتاب تالیف کرلی۔ حالانکہ ان تشنہ تاریخوں کے علاوہ ہمارے پاس دوسری کتابوں کا بھی ذخیرہ موجود ہے جن سے اُس زمانے کے ٹھیک ٹھیک حالات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہم عصر علما کی تصانیف، صوفیہ کے ملفوظات، مکتوبات، سوانح۔ شعرا کے تذکرے، دواوین، عام ادبی تصانیف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ جتنا زیادہ مطالعہ وسیع ہوگا اسی قدر ہم اُس عہد کے لوگوں کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کرسکیں گے۔ مگر اتنی

بوسعتِ نظر کے ساتھ افسوس ہے کہ ہندوستان کے اسلامی بادشاہوں کی کوئی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اور انگریز مؤلفوں نے تو یہ غضب کیا ہے کہ جن ماخذوں پر اپنی کتابیں لکھی ہیں اُن کو پڑھنے میں بھی غور و فکر یا صحّت و تحقیقات سے کام نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف جا بہ جا واقعات و سنین کی بے شمار غلطیاں رہ گئی ہیں بلکہ انگریزی تاریخیں سرتاپا کسی ایسے اجنبی سیّاح کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں جو ملک سے واقف ہے نہ اہلِ ملک سے اور صرف چند روز اِدھر اُدھر کی باتیں سن کر اس نے اپنی کتاب مرتّب کردی ہے۔

واضح رہے کہ سو دوسو برس پہلے جب کہ چھاپے کا رواج نہیں تھا، کسی کتاب کے قلمی نسخوں کا محفوظ رہنا کچھ معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ صدہا کتابیں جن کے نام اور حوالے موجود ہیں، اب بے نشان ہوگئیں اور اسے یہی محض اپنے اسلاف کے علمی شوق کی دلیل سمجھنا چاہیئے کہ ہزاروں آج تک محفوظ رہیں اور ہمیں ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ بایں ہمہ جو کتابیں موجود ہیں اُن کے قلمی نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کا رہ جانا گویا ناگزیر ہے اور جب تک بڑی احتیاط کے ساتھ ان کی تصحیح نہ کی جائے وہ اکثر ناقابل اعتبار نکلتے ہیں۔ زیرِ نظر عہد کی مشہور تاریخ **طبقات ناصری** اس کی مثال ہے جسے چند سال ہوئے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تھا جو چھاپنے میں تصحیح کا اہتمام کیا گیا پھر بھی مطبوعہ نسخہ جا بہ جا غلط چھپا۔ اور کہیں کہیں سے معلوم ہوتا ہے عبارت ہی اڑ گئی جس سے مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے مترجم میجر

طبقات ناصری اور اس کا انگریزی ترجمہ

ایچ ، جی ، راورٹی کو جس قدر داد دی جائے کم ہے کہ اُنھوں نے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت نہ صرف بہت سے قلمی نسخوں کا بہ احتیاط مقابلہ کیا بلکہ قریب قریب ساٹھ[۱] دوسری تاریخیں سامنے رکھکر نہایت مفصّل اور محققانہ حواشی لکھے ہیں ۔ اور اصل کتاب میں اختصار کی وجہ سے جو ابہام ہیں یا کہیں کہیں غلطی اور کمی رہ گئی ہے اُسے بڑی محنت سے دُور کیا ہے ۔ حتّٰی کہ ان کے حواشی متن کتاب سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں اور یہ انگریزی ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں چھپا ہے ! اس فاضل مترجم کی سعی و تحقیق کو دیکھکر قدرتی طور پر خیال آتا ہے کہ اگر ایسے چار پانچ اور محقق بھی ہندوستان کی فارسی تاریخوں پر توجہ کریں تو یقیناً بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں رفع ہو جائیں اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ اپنی اصلی شکل میں ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکے ۔ غرض سلطان ناصر الدین کے زمانے تک میجر موصوف کا ترجمہ تاریخی معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے اور ہم نے اس کتاب کے یہ ابواب لکھنے میں اس سے جا بجا مدد لی ہے ۔ حاشیۂ زیریں پر جہاں کہیں صرف "راورٹی" کا حوالہ دیا ہے اس سے بھی میجر موصوف کا یہی ترجمہ طبقات ناصری مراد ہے ۔

حالات مولف

اصل کتاب اور اس کے مولف قاضی منہاج الدین "جوزجانی" کے متعلق چند فقرے ایزاد کرنے ضروری ہیں کہ یہ بزرگ اس عہد کے

۱؎ ان تاریخوں کے نام مترجم صاحب موصوف نے دیباچے میں اور نیز صفحہ ۸۶۹ (جلد دوم) پر تحریر کئے ہیں ۔

نہایت مشہور علما و قضاۃ کے خاندان سے ہے سلاطین یمینیہ کے آخری عہد میں یہ لوگ ہرات کے ایک شمالی ضلع "گوزگان" یا "جوزجان" میں رہتے تھے اور سلاطین غور سے اُن کے قریبی تعلقات تھے۔ چنانچہ جب لاہور پر سلطان مُعزالدین کا قبضہ ہوا تو ہمارے مولف ہی کے باپ کو وہاں کی غُوری افواج کا قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ بعض موّرخوں نے اسی بنا پر یہ قیاس کیا ہے کہ وہ (یعنی مولّفِ طبقات) لاہور میں پیدا ہوا لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ خود اس کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ اُس نے ہندوستان کی سرزمین اس وقت دیکھی جب کہ اُس کی عمر تیس سال سے متجاوز تھی اور اس وقت بھی اوّل اوّل وہ اُچھ (سندھ) میں آیا (۶۲۴ھ) جہاں ابھی تک ناصرالدین قباچہ کی حکومت تھی۔ یہاں اس کی بہت عزت کی گئی اور اُچھ کی مشہور درس گاہ مدرسۂ فیروزی کا وہ نگراں یا صدر معلّم مقرر ہوا[1]

تھوڑے دن بعد جب سلطان شمس الدین اِلتُتمش نے قباچہ کو شکست دی اور اُچھ فتح کر کے دہلی گیا تو مولّفِ موصوف اس کے ہمراہ تھا اور چند سال بعد گوالیار کا قاضی اور خطیب مقرر ہوا۔ پھر سلطانہ رضیہ کے زمانے میں وہ دہلی کے سب سے بڑے مدرسے ناصریہ کا صدر بنایا گیا اور اس عہدے سے ترقی کر کے خاص دارالسلطنت کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا (۶۳۹ھ) لیکن سال آیندہ ایک جھگڑے کی وجہ سے اس کو یہ منصب اور دہلی کی سکونت چھوڑ کر

---

[1] طبقات ناصری - صفحہ ۱۴۴ -

لکھنوتی آنا پڑا اور یہاں چند سال رہ کر اس نے بنگالے اور وہاں کے حکام کے حالات سے واقفیت حاصل کی۔ آخر میں غیاث الدین بلبن کی وساطت اور سلطان ناصرالدین کی مہربانی سے وہ پھر دہلی کا قاضی القضاۃ اور نیز خطاب "صدر جہاں" سے ملقب ہوا اور تاریخ "طبقات ناصری" لکھنے کے علاوہ ایک اور مثنوی "ناصر نامہ" بھی اُس نے اسی فیاض وحلیم بادشاہ کے نام پر نظم کی ہے[1]

علوم ظاہری کے ساتھ مولف موصوف علم باطنی یعنی تصوف میں بھی خاص درجہ رکھتا ہے[2] اور مجموعی طور پر اس کے معزز اور ثقہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے تاریخی واقعات جمع کرنے کا نہایت عمدہ موقع حاصل تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گو وہ تاریخ کا عمدہ نقاد نہیں اور نہ اس کی کتاب عربی تاریخوں کی طرح مفصل اور جامع ہے، بایں ہمہ اول سے اس کو نہایت وقیع ومعتبر مانا جاتا ہے اور اسی شہرت کی بناپر بعد میں ضیاءالدین برنی کو ہندوستان کی آیندہ تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صاحب طبقات ناصری فارسی زبان کے سب سے قدیم نثرنگاروں میں داخل ہے اور پروفسر براؤن نے اس کی تاریخ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے[3] تاج

---

[1] طبقات ناصری۔ صفحہ ۲۱۰

[2] اخبار الاخیار ۸، فوائد الفواد صفحہ ۱۹۱ نیز دیکھو راورٹی کا "تذکرۂ مولف" صفحہ ۳۰ و ۳۱

[3] لٹریری ہسٹری اوف پرشیا۔ جلد دوم صفحہ ۴۷۰۔

کیونکہ درحقیقت طبقات ناصری کی تکمیل، یعنی ۶۵۸ھ تک فارسی علم ادب میں نثر کی بہت کم کتابیں نظر آتی ہیں مگر اس اعتبار سے ہندوستان کا ایک اور فارسی ادیب بھی قابل تذکرہ ہے جس کا پروفیسر براؤن نے ذکر نہیں کیا[1]۔ ہماری مراد تاج المآثر کے مصنف صدر الدین محمد بن حسن نظامی سے ہے جو چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان چلا آیا تھا اور اس کی کتاب بھی طبقات ناصری سے تیس بتیس برس پہلے مکمل ہوگئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر وہ ہندوستان کا سب سے پہلا مسلمان مورخ ہے جس کی اصل کتاب فارسی میں اب تک محفوظ ہے اور کتاب کے ایک قدیم نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ترائن کی دوسری جنگ (۵۸۸ھ) سے ۶۲۶ھ یا کچھ آگے تک کے حالات جمع کیے تھے[1] مگر مصنف کا خاص ممدوح قطب الدین ایبک ہے اور عام نسخوں میں زیادہ تر اسی کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے[1]۔

مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب جو نہایت عمدہ ہم عصر تاریخ ہوسکتی تھی مصنف کے شوق انشا پردازی کی بدولت محض شاعرانہ نثر کا ایک دلچسپ نمونہ رہ گئی ہے۔ جنگ کے اسلحہ، بزم کے لوازم، قدرتی مناظر اور موسموں کے بیان میں اس نے ورق کے ورق رنگ دئے ہیں۔ تحریر میں طرح طرح کی رنگینیاں اور صنعتیں دکھائی ہیں لیکن تاریخی واقعات و حالات کی تفصیل پر مطلق توجہ نہیں کرتا اور اسی لئے یہ کتاب مورخ کے لئے چنداں کارآمد نہیں۔ البتہ اس کی مرصع تحریر سے ایک حد تک اُس عہد کے ادبی ذوق اور علمی

[1] ایلیٹ۔ جلد دوم صفحہ ۲۱۰

خیالات کا پتہ چلتا ہے اور کبھی کبھی خراسان و غور کے جنگ آزما شہسواروں کی تصویر بھی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔

جامع الحکایات

ایک اور قدیم کتاب جو پائے تخت دہلی میں تکمیل کو پہنچی، جامع الحکایات[1] ہے۔ اس کا مؤلف نورالدین عوفی ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے مشہور فضلا میں شمار کیا جاتا تھا اور گو اس کا تذکرۂ شعرا "لباب الالباب" بھی نہایت کارآمد مجموعہ ہے لیکن اسے کبھی "جامع الحکایات" کی سی شہرت حاصل نہیں ہوئی جو اوّل سے فارسی علم ادب کی نہایت مقبول اور چیدہ کتاب مانی جاتی ہے۔ عوفی کا وطن بخارا تھا لیکن کفارِ مغل کی یورشوں نے جب اُن علاقوں میں تباہی پھیلائی تو بہت سے اہلِ علم کی طرح وہ بھی پھرتا پھراتا سندھ آیا اور قباچہ کی سرکار میں "جامع الحکایات" لکھنے پہ مامور ہوا۔ کتاب پوری نہیں ہوئی تھی کہ قباچہ اور اس کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا اور قاضی منہاج الدین سراج کی طرح عوفی بھی سلطان شمس الدین کے دربار میں دہلی آگیا۔ یہیں اُس نے ۶۳۰ھ کے قریب یہ کتاب پوری کی اور اسے اپنے فیاض مربی نظام الملک جنیدی کے نام سے معنون کیا جو اُس زمانے میں سلطنت دہلی کا وزیر تھا۔ کتاب میں انبیا، اولیا اور بادشاہوں کے قصے اور محاضرات جمع کئے ہیں اور ان میں بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو مؤرخ کے لئے نہایت کام کی چیز ہیں اور خود عوفی نے انہیں ایسے مستند ماخذوں سے جمع کیا ہے کہ ان کی صحت میں چنداں شبہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ

---

[1] کتاب کا پورا نام "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ہے۔

روایتیں مختلف ابواب کے تحت میں کچھ اس طرح متفرق ہیں کہ پوری کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ تھوڑے دن ہوئے پروفیسر براؤن اس مفید کتاب کو چھاپنے کا انتظام کر رہے تھے اور اُن کے زیر نگرانی یہ کام ہوا تو امید ہے کہ یہ دقتیں بھی ایک حد تک حل ہوجائیں گی۔[1]

بعد کی تاریخیں

اِن مشہور تاریخوں کے علاوہ اس موضوع پر اور کتابیں بھی اُس زمانے میں لکھی گئی ہوں گی جو مفقود و بے نشان ہوگئیں اور بعض کے صرف نام دوسری کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ لیکن اس نقصان کی ایک حد تک تلافی اس طرح ہوگئی ہے کہ بعد کے مؤرخوں نے ان قدیم ماخذوں سے نہ صرف مدد لی بلکہ جا بجا اُن کی اصلی عبارتیں نقل کردی ہیں۔ اس قسم کی تالیفات میں زیادہ مشہور وہ ہیں جو اکبر بادشاہ کے زمانے میں مرتب ہوئی تھیں۔ واضح ہو کہ اِس بادشاہ کے حکم سے قدیم کتابوں کا نہایت عمدہ ذخیرہ جمع کیا گیا تھا اور بہت سے ادیب تصنیف و تالیف کے کام پر مامور تھے۔ سلطنت کے امن و استحکام اور تیموری خون کی تازہ آمیزش نے مسلمانانِ ہند کے دل میں نئے ولولے اور علمی شوق پیدا کردئے تھے غرض عہد اکبری میں چند تاریخیں ایسی تالیف ہوئیں جو درحقیقت بہت سی قدیم اور مستند تاریخوں کا لُبِّ لباب تھیں اور اب تک ہمارے

[1] جامع الحکایات اور عوفی کے حالات کو تذکرہ لباب الالباب کے دیباچے میں کافی تفصیل و تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو الیٹ جلد دوم صفحہ ۱۵۵

پاس محفوظ ہیں۔ ان میں طبقات اکبری، منتخب التواریخ (بدایونی) اور تاریخ فرشتہ زیادہ مشہور ہیں کہ ان کے مولفوں نے اپنے عہد سے چند صدی پہلے تک کے حالات اس خوبی سے جمع کیے ہیں کہ قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت خاص اس زمانے کی لکھی ہوئی کتابوں کے ساتھ، ان بعد کی تالیفات کو بھی سامنے رکھنا ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

باب چہارم

سلطنت دہلی کی بنا و استحکام

۱۔ شمالی ہندوستان کی شیرازہ بندی

شمالی ہندوستان کی جس فتح کا ذکر پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزرا وہ دنیا کی سیاسی اور جنگی تاریخ میں ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ بھٹنڈے سے لکھنوتی قریب قریب ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس علاقے کا عرض بھی جسے سلطان معزالدین غوری یا اس کے ماتحتوں نے فتح کیا چار سو تا پانسو میل سے کم نہیں۔ بہ الفاظ دیگر صرف بارہ تیرہ برس میں مسلمان حملہ آوروں کا تخمیناً ساڑھے چار لاکھ مربع میل کے ایسے رقبے پر قبضہ ہوگیا جس میں براعظم ایشیا کے نہایت سرسبز و زرخیز خطے شامل تھے۔ کوئی تحریری ماخذ ایسا نہیں جس کی بنا پر ہم اس علاقے کی آبادی کا

ٹھیک ٹھیک اندازہ کرسکیں، لیکن جہاں کی ریاستوں میں کئی کئی لاکھ جنگجو سپاہی موجود ہوں وہاں کی کُل مردم شماری یقیناً کئی کرور ہوگی۔ اس کے مقابلے میں، حملہ آوروں کی مجموعی تعداد غالباً ڈیڑھ لاکھ بھی نہ تھی کیونکہ قطب الدّین ایبک کے انتقال تک، جن لڑائیوں کا حال ہم پڑھتے ہیں، اِن میں تعداد سپاہ کے اعتبار سے سب سے بڑی وہی ترائن کی دوسری لڑائی ہے جس میں خود سلطان مُعزّالدّین غوری نے ایک لاکھ بیس ہزار سوار کی جمعیت سے جنگ کی تھی۔

اسلامی فتح
وقت
سیاسی حال

فتح کے وجوہ بیان کرنے میں بالعموم سب تاریخ نویس متفق ہیں کہ اہل ہند کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں متفرّق ہونے اور باہمی نفاق نے انہیں تباہ کیا۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف جانبازی اور دلیری میں بلکہ جسمانی قوت، اور استقلال اورجفاکشی کے اعتبار سے بھی مسلمان حملہ آور ہندوؤں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کا فوجی نظم اپنے ہندو حریفوں کی نسبت کہیں بہتر تھا اور اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ اُنھوں نے کھلے میدانوں میں لڑکر اپنی سپاہیانہ برتری ثابت کردی تھی۔ اہل ہند پر غلبہ پانے کی ایک اور وجہ اُس مذہبی جوش اور باہمی اتّحاد کو قرار دے سکتے ہیں جو اہل ہند کے مقابلے میں اُس زمانے کے مسلمان سپاہیوں میں پایا جاتا تھا۔ لیکن فتح کی اِن عام وجوہ کی تہ میں ہمیں اہل ہند کی اندرونی حالت اور اُس بدامنی کا سُراغ ملتا ہے جو مذکورۂ بالا سیاسی

انتشار کا لازمی نتیجہ تھی۔ کیونکہ چند مشہور اور بڑی ریاستوں کے علاوہ، جن کا اس تاریخ کی کتاب اوّل میں ذکر آچکا ہے مسلمانوں کی آمد کے وقت بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسی موجود تھیں جو برائے نام کسی بڑے راجہ کے ماتحت ورنہ اندرونی طور پر قریب قریب خود مختار اور موروثی حکومتیں بن گئی تھیں۔ مثال کے طور پر اگر کرنل ٹاڈ کی روایت صحیح ہے تو، صرف ریاست دہلی میں، جس کا رقبہ اس زمانے کی دو قسمتوں یا کمشنریوں سے زیادہ نہ ہوگا، ایک سو اٹھارہ ایسی جاگیریں اور ریاستیں موجود تھیں جن کے اکثر رئیس یا ٹھاکر موروثی حکمراں تھے[1]! پھر یہ کہ پرتھی راج یا جے چندر جیسے کسی راجہ کی بھی بڑی کامیابی یہی تھی کہ اپنے ان برائے نام باج گزاروں سے جنگ کے وقت فوجی امداد حاصل کر لے۔ کسی دربار یا شادی بیاہ کے موقعہ پر وہ جمع ہوکر اُسے نذریں دکھا دیتے ہوں گے جو گویا باج گزار ہونے کا اقرار تھا۔ بہت ممکن ہے کہ خراج یا مالگزاری کے طریق پر اُنھیں سالانہ بھی کوئی مقررہ رقم راجہ کو ادا کرنی پڑتی ہو۔ لیکن ان پابندیوں کے علاوہ اپنی اپنی جگہ پر وہ خود مختار ہوتے تھے کہ رعایا کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ برابر والے ہمسایوں کے ساتھ اُن کی آئے دن لڑائی ٹھنی رہتی ہوگی کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو آمادہ ہو جانا راجپوت

[1] اینلز۔ جلد دوم صفحہ ۷۔

سرداروں کے قومی خصائص میں داخل تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی خانہ جنگیوں میں ملکی یا سیاسی ترقی کرنا درکنار، غریب رعایا آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی بھی نہیں بسر کرسکتی تھی؛ لوگوں کے اخلاق پر اس بد امنی کے جو اثر پڑتے ہیں ان پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی سیاسی انتشار اور بدنظمی کی وجہ سے شمالی ہند میں رہزنی بہت سے گروہوں کا پیشہ بن گئی تھی اور اس نے نہ صرف تجارت بلکہ معمولی سفر و سیاحت کو بھی نہایت مخدوش بنادیا تھا۔ خود ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں آمد و رفت، میل جول اور مبادلۂ خیالات کے ذرایع قریب قریب مسدود ہوگئے تھے ؛

الغرض، جیساکہ قدیم تاریخ ہند کے مشہور محقق ونسنٹ اسمتھ نے جتایا ہے[۱]، گوہونوں کی شکست کے بعد تقریباً پانچ صدی تک اہل ہندوستان بیرونی حملوں سے محفوظ رہے لیکن اس طویل مدت میں نہ تو وہ کوئی مفید جمہوری قسم کا سیاسی نظام قایم کرسکے تھے اور نہ اُن میں کوئی ایسا اولو العزم بادشاہ پیدا ہوا تھا جو اشوک یا چندر گپت (موریا) کی مثل تمام شمالی ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت متحد کرتا اور لوگوں کو اندرونی بدامنی اور بیرونی حملوں سے بچالیتا؛ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر زمانہ گزرتا گیا ہندوستان کی

---

[۱] ارلی ہسٹری، ۳۰۵

سیاسی حالت بدتر ہوتی گئی۔ اور کہنا چاہئے کہ جب یہ امید بھی باقی نہ رہی کہ خود ہندوستان اپنی اصلاح کرسکتا تو قضا وقدر نے بیرونی ہند سے اُن مسلمان فاتحین کو بلایا جو ہندی حکمرانوں سے زیادہ عالی حوصلہ تھے اور اس خدمت کو انجام دینے کی زیادہ اہلیت یا کم سے کم زیادہ آرزو رکھتے تھے۔

قُطب الدین کا منصوبہ

حقیقت میں یہ بات کچھ کم سبق آموز نہیں ہے کہ ایک افغانی (یا غوری) بادشاہ کے غلام کے دل میں وہ وسیع سلطنت ہند قایم کرنے کے ولولے پیدا ہوئے جن سے دہلی کے عالی نسب چوہانوں اور قنوج کے ذی ثروت گھرانوں کے دل و دماغ عاری تھے! تاریخ ہند میں راجہ ہرش کے بعد قُطب الدین ایبک ہی وہ شخص ہے جس کا تمام ہندوستان کو "ایک چھتر کے نیچے" لانے کی آرزو کرنا بجا تھا۔ صدیوں کے بعد لکھنوتی سے تہروالہ تک، تمام اہل ہند اُسی کے زمانے میں ایک سلطنت کے باشندے کہلائے اور جیساکہ ہم پچھلے باب میں اشارہ کرچکے ہیں، بچھڑے ہوئے پنجاب کو اسی کی تدبیر و شمشیر نے غزنی سے علیحدہ کرکے دوبارہ ہندوستان کے ساتھ ملایا۔ پس یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ قُطب الدین کی لاہور میں تخت نشینی ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے اور ولولہ انگیز دور کا آغاز ہے (۶۰۲ھ-۱۲۰۶ء)

یقینی طور پر یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ قطب الدّین چند سال اور زندہ رہتا تو اُس کا آیندہ لائحہ عمل کیا ہوتا۔ بے شک غزنی کی بادشاہی اور مرحوم آقا کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کی آرزو، اُس کو بیرونِ ہند کی جانب کھینچتی اور اپنے ہم چشم وہم نشین اُمرائے ترک میں امتیاز حاصل کرنے کا الجھ دلاتی ہوگی۔ لیکن اگر اس کے تربیت یافتہ غلام اور لائق جانشین کی آیندہ حکمت عملی دیکھکر قطب الدّین کے دلی منصوبوں کا اندازہ کرنا جائز ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اُس کے ساتھ بہت سے تُرک سردار غالباً یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کا "مستقبل" ہندوستان میں ہے!

قطب الدّین کی جانشینی کا مسئلہ جس طرح طے ہوا اس سے بھی مذکورۂ بالا قول کی تائید ہوتی ہے۔ پچھلے باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ تسخیر دہلی کے بعد اسی شہر کو نائب سلطان کی حیثیت سے قطب الدّین ایبک نے اپنا مستقر قرار دیا تھا (۵۸۹ھ) لیکن ظاہرا اُس کی یہ نیابت صرف "ہندوستان خاص" کے لئے تھی اور پنجاب مَلِک تاج الدین یلدُز کی میراث میں داخل تھا۔ لیکن جب کھوکھروں نے بغاوت کی (۶۰۲ھ) اور سلطان مُعزالدّین کی امداد کے لئے قطب الدّین دہلی سے بہت بڑی فوج لے کر گیا اور زیادہ تر اسی کی

مدد سے یہ خوفناک فساد فرو ہوا، تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسی وقت سے قطب الدین پنجاب کا دعوے دار اور اُس ملک کو سلطنتِ ہند میں شامل کرنے کا آرزومند ہوگیا تھا۔ یہی سبب ہواکہ سلطان مُعزالدّین کی وفات کا حال سنتے ہی اُس نے بڑھکر لاہور پر قبضہ کرلیا اور جیساکہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، اُس کی "بادشاہی" کا زیادہ تر زمانہ اپنے مغربی رقیبوں کی لڑائیوں میں یا حملے کے اندیشے کی بدولت اسی شہر میں بسر ہوا۔ مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ شمالی ہندوستان کے جدید اور قدرتی پائے تخت دہلی کی بجائے پھر لاہور کو اپنا دارالملک بنانا چاہتا ہے جو ابھی تک صوبۂ غزنی کا ایک شہر سمجھا جاتا تھا اور اسے وہی بادشاہ اپنا پائے تخت بنا سکتے تھے جنہیں شمالی ہند کی وسعت کا علم نہ ہو اور یا دوآب و بنگال کے شاداب صوبے چھوڑ کے وہ صرف پنجاب و سندھ کی حکومت پر قناعت کریں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قطب الدّین کی وفات کے بعد جب بعض فوجی سرداروں نے اس کے دلے پالک[1]

[1] طبقات ناصری کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید قطب الدین کے صرف تین لڑکیاں تھیں اور بعض اور مؤرخ بھی لکھتے ہیں کہ اُس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس صورت میں آرام شاہ جسے سکوں میں اور اکثر تاریخوں میں "ابن قطب الدین" لکھا ہے، غالباً اس کا متبنّیٰ ہوگا۔ راورٹی کی تحقیقات بھی یہی ہے۔ دیکھو اس کا ترجمہ صفحہ ۵۲۹

بیٹے آرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کیا تو ہندوستان خاص کے صوبہ داروں نے اس کی حکومت تسلیم نہ کی۔ سلطنت کے اکثر بڑے بڑے عہدہ دار دہلی میں تھے انہوں نے مل کر سپہ سالار علی اسمعیل کی تحریک سے شمس الدین ایل تتمش یا اِلتمِش کو بادشاہ منتخب کیا جو اُن دنوں

ع۱ اس ترکی نام یا عرف کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ غالباً صرف مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں اِس کے معنی لکھے ہیں کہ چاند گہن یا اس رات جو بچہ پیدا ہو اُسے ترک اس نام سے پکارتے ہیں۔ (منتخب التواریخ ۶۲) اس قول کو پیش نظر رکھکے ایک ترکی دان انگریز لکھتے ہیں کہ ترکی میں "آئی" بمعنی چاند اور "تُوت مش" یا "تتمش" بمعنی گہن درست ہے لیکن اس میں "ل" کا کچھ دخل نہیں ہوسکتا۔ صاحب موصوف کے نزدیک اگر وجہ تسمیہ واقعی وہی ہے جو ملّا عبدالقادرؒ نے لکھی ہے تو اصلی لفظ "آئی تتل مش" ہوسکتا ہے جس کا "لام" اصلی جگہ سے ہٹ کر "آئی" کے بعد آگیا اور کثرت استعمال سے یہ نام "اِل تتمش" ہوگیا۔ (کرانیکل آف دی پٹھان کنگز۔ صفحہ ۴۴) جرمن مستشرقوں کی تازہ تحقیقات سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحیح لفظ "ایل تتمش" ہے (ملاحظہ ہو انگوریکا، جلد دوم صفحہ ۵۰ وغیرہ) لیکن راورٹی کے نزدیک یہ لفظ "اَیل تِمِش" ہے جو اور ترکی ناموں سے مشابہ ہے اگرچہ اس کے ٹھیک معنی معلوم نہیں۔ (راورٹی۔ ۵۹۷) فارسی کتابوں میں عام طور پر اس لفظ کو ملا کر بغیر اعراب کے "التمش" لکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے اس لفظ کو صرف دو جگہ شعر میں پڑھا اور دونوں جگہ وہ "آرائش" کے وزن پر ہے۔ پس میرے نزدیک اگر بقول راورٹی اس لفظ کا دوسرا حرف "ی" ہے

اقطاع بداون کا حاکم اور قُطب الدین کا عزیز غلام تھا؛ بنگالے کے خلجی امرا نے بھی آرام شاہ کی بادشاہی نہ مانی اور **علی مردان خلجی** نے سلطان علاء الدین کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا؛ سندھ جسے آج کل ہم اپنے ملک کا چھوٹا سا حصّہ جانتے ہیں؛ اُن دنوں رقبے میں قریب قریب پنجاب کے برابر، اور پہلے ہی "ہندوستان" سے علیحدہ ملک سمجھا جاتا تھا۔ اوّل ہندوؤں کی اور پھر عرب فاتحین اور مسلمانوں کی جو ریاستیں یہاں قایم ہوئیں اُن کا ہندوستان خاص کے ساتھ مدّتوں سے کوئی سیاسی تعلق نہ رہا تھا اور قُطب الدین ایبک نے بھی اپنے ہمعصر ناصر الدین (قباچہ) کے ساتھ جو لڑائیاں لڑیں وہ سندھ کو لینے کے لئے نہ تھیں بلکہ پنجاب کو بچانے کے واسطے تھیں کیونکہ یلدز کی طرح قباچہ اس صوبے کو اپنی "سلطنت سندھ" کا جزو بنانا چاہتا تھا؛

الغرض قطب الدین کا منصوبۂ شاہنشاہی بگڑ جانے کے آثار نظر آ رہے تھے کہ "مَلِک" شمس الدین پائے تخت دہلی میں داخل ہوا اور چند ہی سال کی مدّت میں، ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کے اہل الرائے اس سے بہتر فرماں روا کا انتخاب

سلطان شمس الدین ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ ۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۵ء

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۶۔ تو وہ متحرک نہیں بلکہ الف کے ساتھ مل کر ان دونوں کی آواز ہمزۂ مکسور کی سی رہ گئی ہے۔ اور جائز ہوگا کہ ہم اسے "ایل تُتمش" لکھیں اور "اِل تتمش" پڑھیں۔ اور اگر غلط العام کی پیروی کی جائے تو بھی ت اور م دونوں کو مکسور "اِل تِمِش" پڑھنا چاہئے؛

نہ کر سکتے تھے۔

روایت عام کی بموجب، یہ نامور بادشاہ جس نے مہاراجہ اشوک (یعنی تقریباً پندرہ صدی) کے بعد ہندوستان میں سب سے وسیع رقبے پر بادشاہی کی[۱]، ایک تُرک امیر زادہ تھا جسے، برادرانِ یوسف علیہ السّلام کی طرح، حاسد بھائیوں نے والدین سے جدا کر کے بیچدیا اور وہ بخارا کے کسی قاضی کے ہاں پل کر جوان ہوا۔ حُسن سیرت اور فراست کے ساتھ خدا نے اسے زیور جمال سے بھی آراستہ کیا تھا اور جب دوبارہ کوئی سوداگر خریدکر اسے غزنی لایا تو اُس کی شُہرت سلطان مُعِزالدین سام کے دربار تک پہنچی۔ مگر سوداگر نے اُس کی قیمت اتنی زیادہ طلب کی کہ بادشاہ ناراض ہوگیا اور اُس نے دوسروں کو بھی اس غلام کے خریدنے سے روک دیا۔ آخر سال بھر بعد جب قُطب الدّین ایبک دہلی سے غزنی گیا تو اُس نے بادشاہ سے بطورِ خاص شمس الدّین کے خریدنے کی اجازت لی اور یہ سودا غزنی کی بجائے دہلی میں طے ہوا۔ گویا خود ہندوستان والوں نے اپنے آیندہ فرماں روا کو ایک لاکھ پیسوں[۲] میں خرید لیا!

[۱] عہد شمس الدّین کے تاریخی نقشے کا "موریا" اور "گپت" سلطنتوں کے قیاسی نقشے سے مقابلہ کرنا ہو تو دیکھو ہسٹوری کل ایٹلس آوف انڈیا۔ نقشہ نمبر ۵، ۷ و ۱۱۔ نیز ارلی ہسٹری نقشہ مقابل صفحہ ۱۶۲ و ۲۸۲۔

[۲] یعنی تانبے کا سکہ جو اُن دنوں "جیتل" کے نام سے ہندوستان میں رائج تھا۔

اُس کی آیندہ خدمات اور درجہ بدرجہ ترقی کے تفصیلی حالات لکھنا، سوانح نگار کا کام ہے۔ یہاں اس قدر کافی ہوگا کہ ابتدا سے قُطب الدّین کی اُس پر عنایتِ خاص تھی۔ وہ شمس الدّین کو اپنا بیٹا کہتا اور بڑے سے بڑے عہدے کا اس کو اہل سمجھتا تھا چنانچہ چندہی سال میں یہ نوجوان غلام اقطاع بداؤں کا حاکم بنادیا گیا جو ان دنوں سلطنت دہلی کا سب سے باوقعت صوبہ سمجھا جاتا تھا۔

مغربی تیغیوں پر تغلبہ

لیکن، فن مُلک داری سے کافی آگہی ہونے کے باوجود ممالک ہند کی مطلق العنان بادشاہی حاصل کرنی کچھ آسان بات نہ تھی۔ خود پائے تخت میں بعض اُمرا اس کے انتخاب سے اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو ظاہر کرنے کا موقع اس لیئے موجود تھا کہ لاہور میں ایک اور دعویدار سلطنت، ایل تتمش کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ پس یہ مخالف سردار دہلی سے نکل کے آرام شاہ کے ساتھیوں میں جا ملے۔

معلوم ہوتا ہے اب شمس الدّین اور اُس کا لاہوری حریف دونوں اس نکتے کو سمجھ گئے تھے کہ پائے تخت دہلی پر قابض رہنا ہی شمس الدّین کی اصلی قوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخت نشین ہوکر وہ خود شہر سے باہر نہ نکلا اور وہیں اپنی جنگی تیاریاں اور حریف کے ادھر بڑھنے کا انتظار کرتا رہا۔ غالباً اِسی زمانے میں اُس نے سلطان محمد قطب الدّین

کی بیٹی سے اپنی شادی کی[1] جس کی سیاسی مصلحت ظاہر ہے کہ وہ سلطان مرحوم کا داماد بن کر اپنی جانشینی کے دعاوی کو تقویت پہنچانی چاہتا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسے مقابلوں میں اصلی جیت ذاتی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اور اس میزان میں شمس الدین کا رقیب سلطنت بہت ہلکا تھا۔ فوج کشی کے وقت جو امرا اس کے ہمراہ لاہور سے دہلی تک آئے تھے وہ بھی کچھ جم کر نہ لڑے اور شہر کے قریب ہی شکست کھاکر بہت جلد منتشر ہوگئے۔ خود آرام شاہ اور اس کے خاص خاص رفیق لڑائی میں، یا گرفتار ہوکر بعد میں مارے گئے (۱۲۱۱ء) اور آہستہ آہستہ بنارس، اودھ، بداؤں، شمالی وسطی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب کے تمام سرداروں نے سلطان شمس الدین کے آگے گردن جھکادی۔ بنگالے کے سرکش خلجیوں کو زیر کرنے کے لئے زیادہ فرصت و اہتمام کی ضرورت تھی۔ لیکن اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے سلطان کو سلطنت دہلی کے قدیم تر دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ ان میں غزنی کے فرماں روا تاج الدین یلدز کے ساتھ وہ عہدنامہ کرچکا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے

[1] یہ مسلم ہے کہ شمس الدین، قطب الدین کا داماد تھا۔ لیکن یہ کہیں صاف صاف تحریر نہیں کہ یہ شادی کب ہوئی۔ تاہم طبقات ناصری کی عبارت سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ شمس الدین کے دہلی میں تخت نشین ہونے کے بعد ہی یہ رسم ادا ہوئی تھی (طبقات صفحہ ۱۸۱)

جب کہ شمالی پنجاب پر یلدز کا حقِ بادشاہی تسلیم کرلیا تھا۔ درحقیقت آرام شاہ کی زندگی میں اور کچھ عرصے بعد تک اقتضا ئے مصلحت یہی تھا کہ شمالی پنجاب سے قطع نظر کرلی جاسکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ سلطنت دہلی کی فوج کا بہتر و بیشتر حصہ لاہور میں آرام شاہ کے ساتھ مل گیا یا سرکش اُمرا کے ساتھ مل کر متفرق ہوگیا تھا اور خاص ہندوستان کے علاقوں میں جو فتنے اُٹھ رہے تھے، انہیں فرو کرنے کے لئے کافی سپاہ اور مصارف درکار تھے، شمس الدین دہلی سے دور جاکر یلدُز کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جس کی قوت ان دنوں عروج پر تھی کے دوسرے پنجاب کا ایک اور قدیم دعویٰ دار ناصر الدین قباچہ تھا جس نے سمندر تک تمام سندھ پر تسلط کرکے اپنی قوت بڑھالی تھی اور ملتان کو مستقر بنا کے جب موقع ملتا، اضلاع پنجاب پر قابض ہوجاتا تھا۔ مختصر یہ کہ اوّل اوّل سلطان شمس الدین کا فائدہ اسی میں تھا کہ ملک پنجاب سے دست بردار ہوکر یلدُز کو اپنا دوست بنالے۔

اس موقع پر جو عہدنامہ ہوا تھا اس کی تفصیلی شرائط کسی تاریخ میں نہیں ملتیں لیکن طبقات ناصری کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاج الدین یلدُز نے پنجاب لے کر شمس الدین ایل تتمش کی بادشاہی اس طرح تسلیم کی تھی کہ گویا حکومت دہلی ابھی تک غزنی کی باج گزار ہے[۱] اور شمس الدین التمش نے

---

[۱] طبقات۔ صفحہ ۱۷۰۔ نیز دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۶۰۷

بھی اُس وقت اس بارے میں خاموشی اختیار کرلی تھی لیکن اس واقعے کو چندہی سال گزرے تھے کہ سلطان محمد خوارزم شاہ نے غزنی پر قبضہ کرلیا اور تاج الدین یلدز کو وہاں سے ہٹ کر پنجاب میں آنا پڑا۔ پھر اس ملک کو قباچہ کی فوجوں سے خالی کرانے کے بعد اُس نے اپنے شہنشاہی حقوق کی بنا پر حکومت دہلی سے بھی بعض مطالبات کئے جنہیں التمش نے رد کردیا۔ اس وقت یلدزؔ نے خاص دہلی پر لشکرکشی کی۔ (دسمبر ۱۲۱۵ء)

فریقین کا مقابلہ ترائن کے قریب اسی میدان میں ہوا جہاں کئی بار تلوار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرچکی ہے اور اہل ہند نے شمالی حملہ آوروں کو شکست دی (دسمبر ۱۲۱۵ء)۔ تاج الدین زخم کھا کے گرفتار ہوا اور بدآوں میں نظر بند کردیا گیا اور جیسا کہ پچھلے باب میں بیان ہوچکا ہے اسی قید میں اُس نے وفات پائی۔ با ایں ہمہ قبضۂ پنجاب کے متعلق قباچہ کے ساتھ عمّالِ شمسی کا بہت دن تک جھگڑا ہوتا رہا حتّٰی کہ خود سلطان شمس الدین نے لاہور پر پیش قدمی کی اور دریائے بیاس کے کنارے سندھی فوج کو شکست دے کر مستقل طور پر پنجاب کو دوبارہ سلطنت دہلی کا صوبہ بنالیا (۱۲۱۷ء)۔ یہ گویا سلطان قُطب الدین کے نہایت عزیز منصوبے کی تکمیل تھی اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جہلم کے پار ابھی تک سلطان کا حکم نہ چلتا تھا اور اس صوبے کی جنوب مشرقی حدود بھی موجودہ منٹگمری کے

ضلع سے آگے نہ تھیں۔

فتوحات

لیکن سلطان کا اپنے سندھی رقیب کے تعاقب میں آگے نہ بڑھنا اس کی بیدار مغزی اور اصابت رائے کی دلیل ہے۔ درحقیقت سلطنتِ دہلی کے لئے سندھ کی فتح قبضۂ بنگال سے مقدم نہ تھی۔ شمس الدّین، خالص ہندی فرماں روا بننا چاہتا تھا اور ممالک ہند کی سیاسی شیرازہ بندی کے واسطے، جو اس کا نصب العین تھی، سندھ کی نسبت بنگالے کا سلطنت میں شامل ہونا زیادہ ضروری تھا۔ نظر برایں، گو اُس نے لاہور میں کچھ دن ٹھہر کر صوبۂ پنجاب کے نظم ونسق کو درست کیا جو پچھلی بدامنی کی بدولت یقیناً سخت ابتر ہوگیا ہوگا۔ نیز اپنے بڑے بیٹے ناصرالدّین محمود کو یہاں کا حاکم بناکر، گویا قباجہ کے دعاوی کا خاتمہ اور اس ملک پر آئندہ حملوں کا معقول سدِ باب کردیا اور چار سال کے بعد جب ۶۱۸ھ میں محمد خوارزم شاہ کے بیٹے سلطان جلال الدّین کو چنگیزخان کے سامنے سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈنی پڑی تو شمس الدین اُسے پنجاب کی چپہ بھر زمین دینے کا بھی روادار نہ ہوا۔ بایں ہمہ اُس نے صوبۂ لاہور کی حدود کو جنوب کی طرف یا مغرب میں جہلم سے آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی اور سندھ پر فوج کشی کا ارادہ تھا بھی تو بنگال و رنتھنبور کی فتح تک اسے ملتوی کردیا۔

بنگالے کے متعلق ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ سلطان قطب الدین ایبک نے علی مردان خلجی کو ولایت لکھنوتی کی سند اور خلعتِ حکومت عنایت کردیا تھا لیکن جب سلطان موصوف نے لاہور میں وفات پائی تو علی مردان خود مختار ہوگیا اور اس اعتبار سے بنگالے کا پہلا مسلمان بادشاہ وہی تھا۔ مگر مطلق العنان ہوکر وہ نہایت ظالم و خود پسند فرماں روا ثابت ہوا اور تین چار سال ہی میں اہل ملک اُس کی حکومت سے عاجز آگئے۔ آخر خلجی امیروں نے ایکا کرکے اُسے قتل کردیا اور حسام الدین بن حسین خلجی کو بادشاہ بنایا جو سلطان غیاث الدین کے لقب سے مشہور ہے (۶۱۱ھ)[1]

یہ بادشاہ سخاوت و جواں مردی، عدل و رعایا پروری میں اپنے پیش رو کا نعم البدل تھا۔ اِس کے زمانے میں ملکِ بنگال نے بڑی رونق پائی اور شہر لکھنوتی اہل علم و فن کا مرجع بن گیا۔ اُس کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد جب صاحبِ طبقاتِ ناصری اِن علاقوں میں آیا، تو اُس کے انتظام اور رفاہِ عام کے بہت سے آثار ملک میں موجود اور اُس کی خوبیوں کے قصّے زبان زد خلائق تھے۔ خود

[1] ان بنگالی بادشاہوں کی تخت نشینی اور مدت حکومت کے سنین میں اختلاف ہے لیکن مختلف شواہد و قرائن سے راقم الحروف کی رائے میں ۶۱۱ھ ہی غیاث الدین کا سالِ جلوس ہے۔

سلطانِ دہلی اِس بنگالی فرماں روا کے اوصاف کا دل سے معترف تھا[۱] اور عجب نہیں کہ غیاث الدین کی یہ ہردلعزیزی بھی ان بادشاہوں کی پہلی مصالحت کا ایک سبب ہوگئی ہو۔ کیونکہ گو بہار کو سلطان شمس الدین بنگالے سے جدا کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دینا چاہتا تھا لیکن بنگال خاص کے علاقے میں اُس نے غیاث الدین کو ایک باج گزار امیر کی حیثیت سے بخوشی بحال رہنے دیا۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اودھ میں اپنی قوت مستحکم کرنے کے بعد اِلتتمش نے بعض اُمرا کو بہار پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ آیندہ بنگالے پر پیش قدمی کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ جب یہاں کے با موقع مقامات پر اُمرائے سلطانی کا قبضہ ہوگیا تو خود سلطان نے وسیع پیمانے پر فوج کشی کی اور ۶۲۲ھ میں شہر لکھنوتی کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ فریقین میں صلح ہوگئی۔ غیاث الدین خلجی نے خراج کے طریق پر بہت سا روپیہ اور اَٹھتیس ہاتھی نذر کئے اور عہد کیا کہ آیندہ ملک میں سکّہ اور خطبہ سلطان شمس الدین کے نام کا رائج ہوگا۔ جس نے اپنی طرف سے غیاث الدین کو حکومت بنگالہ پر بحال کر دیا۔

معلوم نہیں اس معاہدے میں صوبۂ بہار کے متعلق بھی کوئی قرارداد ہوئی تھی یا نہیں۔ سلطان شمس الدین کا ارادہ

۱۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۶۳۔

صاف طور پر ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ اسے سلطنت دہلی کا ایک علیحدہ صوبہ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ واپسی میں اس نے اپنے ایک امیر ملک عزالدّین کو یہاں کا حاکم مقرر کردیا تھا۔ لیکن غیاث الدین کو یہ نقصان گوارا نہ ہوا اور جس وقت سلطان راجپوتانے میں مصروفِ جنگ تھا، غیاث الدین خلجی نے بہار پر فوج کشی کی (۶۲۳ھ)۔ عزالدین کو بھاگ کر اودھ میں پناہ لینی پڑی جہاں اب ناصرالدّین محمود باپ کی طرف سے صوبہ کا حکمران تھا۔ وہ پنجاب میں اپنی انتظامی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا مگر اس موقع پر اُس کی سپہ سالاری کا کمال ظاہر ہوا کہ سلطان کی طرف سے اجازت اور کمک ملتے ہی اُس نے لکھنوتی پر یلغار کی اور اس سے قبل کہ غیاث الدّین سرحد آسام سے واپس آئے وہ اُس کے پائے تخت پر قابض ہوگیا۔ پھر جب غیاث الدّین خلجی اپنی سرحدی لڑائیاں چھوڑ کر جس قدر جلد ممکن تھا، لکھنوتی آیا تو ناصرالدّین محمود نے اُس کو شہر کے باہر سخت شکست دی اور وہ اور اُس کے بہت سے اُمرا گرفتار ہو گئے۱ (۶۲۴ھ)

اس معرکہ آرا فتح نے بنگالے کی نیم آزاد بادشاہی کا بھی خاتمہ کردیا۔ اور دریائے برہم پتر یا سرحد آسام تک یہ مشرقی علاقے سلطنتِ دہلی کا صوبہ بن گئے۔ دو بغاوتوں کے

۱ ان میں پہلی بغاوت وہ تھی جو شہزادۂ ناصرالدّین محمود کی وفات (۶۲۶ھ) پر غیاث الدین کے بیٹے اختیارالدّین بلکا خلجی نے بپا کی اور خود

سوا آئندہ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک یہاں کے صوبہ دار سلاطینِ دہلی کے فرماں بردار رہے اور اسی سیاسی تعلق نے رفتہ رفتہ تمام شمالی ہندوستان کے باشندوں میں ہم ملک ہونے کا وہ احساس پیدا کیا جسے "اتحادِ اہلِ ہند" کی موجودہ آرزو کا پہلا تخم کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے اور ملکوں میں بھی مطلق العنان بادشاہوں نے بالواسطہ یہ خدمت انجام دی ہے لیکن سلاطینِ دہلی کی ممتاز خصوصیت اور عظمت کا اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی انتظامی قابلیت اور منصوبۂ شاہنشاہی نے اتنے وسیع براعظم کی شیرازہ بندی کی ؛ اور اس منصوبہ کا اظہار آگے چل کر ہم خود اُلغ خان بلبن کی زبانی سنیں گے ؛

۲۔ فتح رنتھنبور (مشرقی راجپوتانہ)

✓ ادھر اس دو سال کے عرصے میں خود سلطان ایلتمش نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵۔ سلطان شمس الدین التمش نے لکھنوتی جاکر اسے فرو کیا (۱۲۲۹ء) باغی سردار گرفتار کرلیا گیا اور بنگالے کی صوبہ داری ملک عز الدین کو عنایت ہوئی جو پہلے بہار کا صوبہ دار تھا ؛ ان تمام واقعات کو الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہند (صفحہ ۳۶۶) میں عجیب طرح لکھا ہے اور اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بنگال کا پہلا فاتح محمد بن بختیار خلجی ابھی تک زندہ تھا اور ایلتمش کی یہ لڑائیاں اسی کے ساتھ ہو رہی تھیں ! طرفہ تر یہ کہ بعد کے تمام انگریز محقق بھی اسی قول کو نقل کردیتے ہیں اور اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ محمد بختیار خلجی مذکورۂ بالا واقعات سے ۲۴ برس پہلے فوت ہو چکا تھا ؛

راجپوتانے کے دو مشہور و مستحکم قلعے فتح کیے جنھیں جنگجو راجپوتوں نے اپنا مرکز بنالیا تھا واضح رہے کہ گو ہند کے باشندے اسلامی فتوحات کے سیلاب کو ہندوستان میں پھیلنے سے نہ روک سکے تھے لیکن اُن کے بہت سے غیرتمند شرفا کو پردیسی فاتحین کے آگے سرجھکانا گوارا نہ تھا۔ آزادی کی بیش بہا دولت کے سامنے زرو زمین، کسی شے کی وہ پروا نہ کرتے تھے اور ہندوستان کے زرخیز علاقے چھوڑ چھوڑ کر اُس ریگستانی خطّے میں آبسے تھے جسے آج کل ہم راجپوتانہ یا راجستان کہتے ہیں۔ اس نقل مکانی کی بدولت، نہ صرف اس ملک کی آبادی بڑھتی رہی بلکہ وہ ہندو قوم کے بہترین سپاہیوں کا مسکن بن گیا تھا اور اُس پر تسلّط حاصل کرنا کچھ آسان بات نہ تھی۔ گرمی کی شدّت اور زمین کے دشوارگزار وکم حاصل ہونے کی وجہ سے بھی مسلمان حملہ آوروں کو یہاں کے صحرا وکوہستان فتح کرنے کا شوق نہ ہو سکتا تھا لیکن ریت کے ٹیلوں اور کوہِ اراولی کی چوٹیوں کے پار گجرات ومالوے کے سرسبز میدان تھے اور دہلی سے وہاں پہنچنے میں مشرقی اور جنوبی راجپوتانے سے گزرے بغیر چارہ نہ تھا۔ پس یہی وہ حصّے تھے جن پر سلاطین دہلی کو بار بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور بار بار قلعہ رنتھنبور و چتوڑ کی زمین بہادروں کے خون سے رنگین ہوئی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں کسی بڑے اور

مرکزی قلعے کو فتح کرنے کے معنی یہ تھے کہ ساری ریاست پر فاتح کا قبضہ ہوگیا۔ کیونکہ ضرورت کے وقت انہیں سنگین حصاروں میں اُس علاقے کی تمام جنگی قوت جمع ہوجاتی تھی اور اسی لئے اُن کے بنانے میں دفاعی جنگ کی ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ رنتھنبور اسی قسم کا مستحکم قلعہ تھا جس کے آثار دیکھکر آج بھی اس کی تسخیر کی دشواریوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مشرقی راجپوتانے کے میدانی قطعات میں بھی جا بجا پہاڑیاں اُبھری ہوی ہیں۔ ایسی ہی ایک بلند پہاڑی پر یہ سنگین قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اور خود اس کا قدیم نام "رن استھمبا پور" یعنی جنگی ستون کا مقام[1] گواہی دیتا ہے کہ صاحب طبقات ناصری نے اس کی سنگینی کے متعلق جو روایت لکھی ہے وہ بے بنیاد نہ ہوگی۔[2] پرتھی راج کے عہد میں یہ قلعہ ریاست اجمیر کے توابع میں داخل ہوگیا تھا[3] اور اسی لئے جب یہ ریاست سلطان معزالدین

۱؎ گزیٹیر۔ جلد ۲۱ صفحہ ۲۳۵۔

۲؎ صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ ہندی تاریخوں کا بیان ہے کہ اس قلعہ پر ازمنۂ گزشتہ میں ستر سے زیادہ بادشاہوں نے فوج کشی کی مگر کوئی بھی اسے فتح نہ کرسکا ؎ صفحہ ۱۷۲۔

۳؎ گزیٹیر۔ جلد ۲۱، صفحہ ۲۳۵۔ سلطان معزالدین کے زمانے میں رنتھنبور پر مسلمانوں کا قبضہ ہونا، تاج المآثر کی عبارتوں سے ثابت ہے۔ راورٹی اس بارہ میں کچھ شبہ ظاہر کرتا ہے (حاشیہ صفحہ ۶۱۱) لیکن گزیٹیر کی مذکورۂ بالا اطلاع، صاحب تاج المآثر کے قول کی بالواسطہ توجیہ و تصدیق کے لئے کافی ہے ؎ ۱۲

کی باج گزار ہوئی تو رنتھنبور بھی، غالباً جنگ کئے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ لیکن جب اجمیر پر مسلمانوں کا بلا واسطہ تصرّف ہُوا اور آزادی پسند راجپوت کسی طرح انہیں وہاں سے نہ نکال سکے تو قرینہ کہتا ہے کہ اُس وقت اُنہوں نے رنتھنبور کو اپنا جنگی مستقر منتخب کیا اور مسلمانوں کی مختصر فوج کو جو یہاں مقیم تھی نکال کر کسی نہ کسی طرح قلعے پر قابض ہوگئے۔ اسی وقت سے یہ قلعہ گویا تمام مشرقی راجپوتانے کے آزاد و جنگجو قبائل کا مامن بن گیا اور چونکہ اس کے قریب ہی جنوب میں اروَلی پربت کی ایک شاخ پھیلی ہوئی ہے لہٰذا رنتھنبور کو نہایت عمدہ جنگی مورچہ کہہ سکتے ہیں۔ جسے عقب سے بہ آسانی کمک پہنچائی جاسکتی تھی اور مدافعت کے ناکام رہنے کی صورت میں بھی انہی پہاڑیوں میں پناہ لے سکتے تھے جہاں دشمن کی رسائی بہت دشوار تھی۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اگر اوّل اوّل اس قلعے کو دوبارہ لینے میں بے پروائی برتی گئی تو اس کا ایک سبب تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ راجپوتوں کو جبراً محکوم بنانا بہت سی قیمتی جانیں دے کر ایک کم حاصل زمین کو خریدنا ہے اور جب تک ہندوستان کے زیادہ زرخیز علاقے موجود تھے، انہیں یہ پُرخطر سودا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ جوشِ سپہ گری کا مقتضیٰ یہ تھا کہ راجپوتانے کے سرکش منچلوں کو

مسلمانوں [illegible] منصوبہ [illegible] ہیں۔

اپنی تلوار کا جوہر دکھا دیا جائے کہ مطیع نہ ہوں تو بھی کم سے کم مسلمانوں کی جنگی برتری کا اِن کے دل پر رُعب بیٹھ جائے۔ اور اس شوکت نمائی اور اظہارِ شجاعت کی تہ میں دو اہم سیاسی مصلحتیں بھی مرکوز تھیں۔ ایک تو یہ کہ گجرات و مالوے کا راستہ ایک حد تک صاف رہے اور دوسرے یہ کہ راجپوتوں میں نہ کبھی اتنی قوّت آسکے نہ یہ جُرأت کہ کسی وقت میں خود مسلمانوں کو اُن کے حملے کا اندیشہ پیدا ہوجائے۔ عہد اکبری تک، راجپوتانے کے متعلّق، مسلمان بادشاہوں کا اصولِ عمل یہی تھا اور باج گزاری کا اقرار لینے کے سوا اُنھوں نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا استیصال کر دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اُن کے اعلیٰ تدبّر اور موقع شناسی کی اس سے بہتر شہادت کیا ہوگی کہ راجپوتانے کے ساتھ جو طریق عمل انھوں نے اختیار کیا تھا، صدہا سال گزرنے کے باوجود، ہندوستان کے موجودہ فرماں روا بھی اصولاً اُسی پر کاربند ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ جنگی ضروریات کے لئے راجپوتانے میں افواج شاہی کا جو سب سے بڑا مرکز سلطان قُطب الدّین ایبک نے قرار دیا تھا (یعنی اجمیر) آج بھی سرکار انگریزی نے اس پر براہِ راست اپنا قبضہ رکھا ہے اور حقیقت میں راجپوتانے کی یہی وہ کُنجی تھی جس کے ہاتھ میں آجانے کی بدولت مسلمانوں کو نہ رنتھنبور کے فوجی اجتماعات کی چنداں پروا ہوتی تھی نہ منڈور و چتوڑ کے استحکامات کی

اور جب دوسری طرف سے فرصت ملتی تو اسی مرکزِ جنگ سے وہ اپنی فوجیں ہر گوشۂ ملک میں پھیلا دیتے تھے۔ اِلتتمش نے بھی رنتھنبور کے دوبارہ لینے کی خاطر اپنی مُہم بنگال کو ملتوی کرنا پسند نہیں کیا تھا مگر اُدھر سے فرصت ہوی تو وہ اِدھر بڑھا اور چند مہینے کے محاصرے کے بعد یہ مستحکم قلعہ مسخّر ہوگیا۔ (۶۲۳ھ)

۲۔ فتح منڈور

اسی سلسلے میں افواجِ شمسی نے مغربی راجپوتانے پر چڑھائی کی اور ۶۲۴ھ میں یہاں کا سب سے مشہور و مستحکم قلعہ منڈور فتح کرلیا۔ یہ قلعہ، یا قلعوں کا مجموعہ ریاست مارواڑ کا قدیم صدر مقام اور پریہار قوم کے راجپوتوں کا مرکز تھا۔ اجمیر سے تقریباً سومیل مغرب میں موجودہ جودھپور کے قریب اس کے کھنڈر آج بھی گزشتہ وسعت وسنگینی کی گواہی دیتے ہیں اور شمالی ہند کے مشہور آثار قدیمہ میں اُن کا شمار ہے[1]؛ افسوس ہے کہ "غنائمِ بسیار" کا ذکر کرنے کے سوا صاحبِ طبقات ناصری یا اور کسی فارسی مؤرخ نے اس فتح کے اسباب و واقعات کی تفصیل نہیں لکھی۔ اور تاریخ فرشتہ کے مؤلف یا کاتب نے

[1] گزٹیر۔ جلد ۱۷ صفحہ ۱۷۱ بحوالہ "آرکیولوجکل سروے اوف نورذرن انڈیا"
کرنل ٹاڈ نے بھی ۱۸۱۹ء یعنی سیاحت راجپوتانہ کے دوران میں منڈور کی مشہور "ہری مونگ کی دال" کھائی اور یہاں کے کھنڈرات کی سیر کی تھی دیکھو اینلز۔ جلد اول، صفحات ۵۶۲ تا ۵۷۰۔

تو غلطی سے منڈور کی بجائے اسے "منڈو" یا مانڈو) بنا دیا ہے جو مالوے میں واقع تھا؛ تاہم طبقات اور مراۃ جہاں کی مختصر عبارت سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ ان فتوحات سے "جنوبی سوالک" یا راجپوتانے کے اُن سرحدی اقطاع کو محفوظ کرنا پیشِ نظر تھا جو براہِ راست سلاطینِ دہلی کی عملداری میں داخل ہو گئے تھے اور ناگور و اجمیر اِن کے مشہور مستقر تھے۔

۳۔ فتوحات سندھ۔

راجپوتانے کی مذکورۂ بالا کامیابیوں نے سلطنتِ دہلی کے اندرونی علاقوں کو اتنا محفوظ کر دیا تھا کہ بظاہر اقطاع شاہی پر اب کسی بیرونی حملے کا اندیشہ نہ رہا اور اقبالمند سلطان کو سندھ پر فوج کشی کی فرصت مل گئی؛ بعض فارسی تاریخوں میں اس حملے کا قریبی سبب یہ بنایا گیا ہے کہ چنگیز خانیوں سے شکست کھا کر خوارزمی فوج کے ایک حصّے نے سندھ کے شمال مغربی اضلاع میں پناہ لی تھی ناصرالدین قباجہ نے وہاں بھی انہیں چین نہ لینے دیا اور شکست دے کر اپنے ملک سے نکال دیا۔ ان شکست خوردہ اور مظلوم سپاہیوں نے سلطان دہلی سے فریاد کی اور وہ قباجہ سے اِن کا انتقام لینے پر آمادہ ہوگیا۔

لیکن درحقیقت یہ محض حیلہ تھا اور لڑائی کی اصلی وجہ اسی قدیم رقابت کو سمجھنا چاہیئے جس کی بدولت

ع۱۔ طبقات ناصری، صفحہ ۱۷۲۔ راورٹی، حاشیہ ۶۱۱۔

پہلے قطب الدّین اور پھر شمس الدّین کے ساتھ قباچہ کی بار بار لڑائیاں ہوئیں ؛ ۶۱۴ھ کی جنگ کے بعد سے قباچہ نے ملک پنجاب پر کوئی پیش قدمی نہ کی تو اس کا ایک سبب تو ظاہر ہے کہ اب اُسے شمسی افواج پر عہدہ برآ ہونے کی امید نہ تھی اور سلطان شمس الدّین کے عمدہ انتظام نے حملوں کا سدّ باب کردیا تھا ۔ مگر اس کے علاوہ، تھوڑے ہی عرصے بعد جماعت ہائے مغل نے بھی جنکی حیثیت اب تک لٹیروں کی سی تھی ممالک سندھ کا راستہ دیکھ لیا تھا اور اُن خوفناک دشمنوں سے قباچہ کو خود اپنا ملک بچانے کی پڑی تھی ؛ غرض سلطنتِ دہلی کے اِس پرانے حریف کی طرف سے اب ہندوستان پر حملے کا خطرہ نہیں تھا البتّہ خود سلطان شمس الدّین کی جنگی قوّت اور اسی کے ساتھ ہوسِ کشورکشائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ مُلکِ سندھ کو فتح کرنے کا آرزومند تھا اور اُس "منصوبۂ بادشاہی" کو، جو اُسے قطب الدّین سے ترکے میں ملا تھا، ترقی دے کر سلطنتِ دہلی کا نیا نقشہ بنانا چاہتا تھا جس میں وادیٔ سندھ سے وادیٔ برہم پتر تک ایک ہی بادشاہ کی عملداری نظر آئے !

۶۲۵ھ کے اوائل میں افواجِ دہلی نے حرکت کی اور بھٹنڈے سے مغرب کی طرف رُخ کیا ۔ یہاں سے اُچھ کوئی دو سو میل

وہ دریائے ستلج پر واقع تھا اور شہر سے باہر نکل کر اسی دریا کے کنارے ناصر الدین قباچہ نے حملہ آوروں کو روکنے کی تیاریاں کی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے دریا کے پیچ وخم نے اُس کے پڑاؤ کو نہایت محفوظ بنا دیا تھا اور خیمہ گاہ کے سامنے بہت سی کشتیاں موجود تھیں کہ ضرورت کے وقت دریا کی نزدیکی سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے؛ لیکن اقبالِ شمسی نے مدافعت کی تمام تدابیر کو درہم برہم کردیا۔ اہلِ سندھ جُمعہ[۱] کی نماز پڑھ کر خیموں کو آرہے تھے کہ تیز پا ہرکاروں نے آکر خبر دی کہ لاہور کے حاکم ملک نصیر الدین ایتم کی فوج ملتان کے قریب پہنچ چکی ہے! شمالی سندھ کا یہ پایۂ تخت اور سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اُچھ سے صرف پچاس پچپن میل شمال میں واقع ہے اور اس کے گھر جانے کے معنی یہ تھے کہ قباچہ کو اُدھر سے کوئی کمک نہ مل سکے گی اور دشمن جس وقت چاہے گا تیز کُوچ کرکے خاص اُچھ پر شمال مغرب کی طرف سے

۱؎ یہ غالباً ماہِ صفر ۶۲۵ھ کے پہلے ہفتے کا ذکر ہے۔ (دیکھو طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۴۲۔ نیز راورٹی، حواشی صفحات ۶۱۲، ۶۱۳ وغیرہا) تاج المآثر نے سندھ کی اس لشکرکشی کو ۶۲۴ھ کا واقعہ لکھا ہے۔ بعد کی تاریخوں میں بھی مختلف سنین درج ہیں لیکن صاحبِ طبقاتِ ناصری اُس وقت خود اُچھ میں موجود تھا اور اسی فتح کے بعد سلطان شمس الدین کے ہمراہ دہلی آیا۔ لہذا اُس کی تاریخیں زیادہ قابلِ اعتبار ہیں۔

حملہ کردے گا۔ چونکہ سندھی فوج کا بڑا حصہ شہر سے دور مشرق میں خیمہ زن تھا اور اُدھر سے افواجِ شاہی منزل بہ منزل بڑھی چلی آتی تھیں، لہذا انہیں روکنا اور اسی کے ساتھ اُچھ کے شمال مغربی پہلو کی حفاظت کرنا دشوار ہوگیا تھا خاص کر اس وجہ سے، کہ ان دنوں دریائے ستلج اُچھ کے مغرب میں بہتا تھا اور ملتان سے پیش قدمی کرنے والے کے راستے میں کوئی دشوار گزار مقام نہیں تھا؛ خلاصہ یہ کہ ملک اے یتیم کی پیش قدمی نے مدافعین کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا اور قباچہ کو سلامتی اسی میں نظر آئی کہ جس قدر جلد ممکن ہوا اس دو طرفہ زد سے بچ کر، بہت دور جنوب میں بھکر ہٹ آیا۔

مگر اس ہل چل میں اُس کا فوجی نظام اس قدر بگڑ گیا تھا کہ آیندہ بھی کسی میدانی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ تین مہینے کے محاصرے کے بعد اِدھر اُچھ کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے (جمادی الاول ۶۲۵ھ)، اور اُدھر وہ خود کشتی میں بیٹھکر بھکر سے بھی فرار ہونا چاہتا تھا کہ کشتی دریائے سندھ میں ڈوب گئی ایک روایت یہ ہے کہ اس نے خود ہی دریا میں کود کر اپنی جان دے دی؛ غرض مملکتِ سندھ پر سلطانِ دہلی کا تسلّط ہوگیا اور سمندر تک سندھ کے جنوبی، اور مکران تک مغربی، اضلاع میں حکومت دہلی کی عملداری قائم کرنے کے لئے اپنے مشہور وزیر نظام الدین جنیدی اور لائق غلام

ملک تاج الدین کزلک کو یہاں چھوڑ کر، فاتح بادشاہ نے دارالملک دہلی کو مراجعت کی ؎

شاہانِ دریا کے بعد، جن کی حدود سلطنت ایک حدتک ملتی ہیں، یہ پہلا موقع تھا کہ سندھ "شمالی ہندوستان" میں داخل ہوا۔ لیکن اہل دہلی نے ان سندھی فتوحات کی خاص طور پر جو خوشی منائی اس کا بڑا سبب دوسرا تھا وہ یہ کہ ہندوستان بھر میں صرف دولت سندھ کو سلطنتِ دہلی کی ہمسری کا دعویٰ رہ گیا تھا اور کم سے کم پنجاب کے بادشاہی عمّال ہمیشہ اس مغربی رقیب کی جانب سے اندیشہ مند رہتے تھے۔ قباچہ کی موت اور سندھ کی خود مختار قوّت کے خاتمے سے یہ خلش ہٹ گئی اور اب کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک وہ جدھر نظر ڈالتے تھے، باواسطہ یا بلا واسطہ دہلی کی عملداری نظر آتی تھی۔ اور جو رئیس و راجہ آزادی کا دم بھرتے تھے اُن میں بھی ظاہرا کوئی اتنا قوی نہ تھا کہ شمالی ہندوستان کی اِس نوخیز سلطنت کو اُس کی جانب سے حملے کا خوف ہوتا؎ اِدھر اُسی زمانے میں خلیفۂ بغداد کے سفیر کشورِ ہند کی بادشاہی کی سند اور خلعت لے کر دہلی آئے جس نے جشن فتح کی دھوم دھام کو دوبالا کردیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ خلافت بغداد نے یا بہ الفاظ دیگر، دنیائے اسلام نے ہندوستان کی مستقل اور جداگانہ بادشاہی تسلیم کی وہ نہ کچھ عرصے

خلیفۂ بغداد کی سند

پہلے تک وہ سلطنتِ غزنی کی تابع سمجھی جاتی تھی۔

واضح رہے کہ گو صحیح معنی میں صرف قریب کے چند صوبوں پر خلیفۂ بغداد کی حکومت رہ گئی تھی۔ تاہم ابھی تک مسلمانوں میں اس کا رسمی احترام باقی تھا اور نہ صرف ممالکِ ایشیا بلکہ خلافتِ فاطمیہ کے زوال کے بعد (۵۶۷ھ) اکثر افریقی ممالک میں بھی (جہاں پہلے اسمٰعیلیوں کا دَور دَورہ تھا)، خطبوں میں اوّل خلیفۂ بغداد کا اور اس کے بعد مقامی فرماں روا کا نام لے کر دعائے خیر مانگی جاتی تھی۔ نیز جو نیا مُلک مسلمان فتح کرتے یا کوئی نیا بادشاہ کہیں تخت نشین ہوتا اور خلافتِ بغداد کی جانب سے بھی اُسے سندِ بادشاہی اور خلعتِ حکمرانی مل جاتا تو وہ اس کو اپنی عزّت تصوّر کرتا تھا۔ یہی رسم تھی جو ۶۲۶ھ میں بغداد کے سفیروں نے پایۂ تخت دہلی میں ادا کی۔ دوسرے اس سفارت نے ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں سلسلۂ ارتباط کو قوی کردیا اور ایران و عراق کے اہلِ علم اور تاجر کثرت سے ہندوستان میں آنے لگے۔ تیس برس بعد جب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے دارالخلافت بغداد کو تاراج و خراب کیا تو اس وقت دہلی بھی اس کے ماتم گساروں میں تھی۔

۲- جانشینانِ التتمش اور مغلوں کی یورشیں

۶۲۸ھ میں بنگالے کی شورش فرو کرنے کے بعد جس کا ذکر

پہلے آچکا ہے، شمس الدّین نے مالوے کی فتح کا ارادہ کیا؛ آج کل یہ ملک "وسطِ ہند" میں شامل ہے اور گو سلطان معز الدّین سام ہی کے زمانے میں اس کے بعض شمالی اور مغربی اقطاع فتح ہو گئے تھے لیکن جنوب میں خاص مالوے تک غزنوی یا دہلوی سپاہ کا قدم نہ آیا تھا اور شمال میں راجہ **گوالیار** بھی، جس نے بہاء الدّین طغرل سے بچنے کے لئے قطب الدین ایبک کی اطاعت قبول کرلی تھی (صفحہ ۱۲۷) خود مختاری کا دم بھرنے لگا تھا۔ لہٰذا افواجِ شمسی نے بڑھکر پہلے اسی قلعے کا محاصرہ کیا اور دس گیارہ مہینے تک اسے گھیرے پڑی رہیں۔ آخر ماہِ صفر ۶۳۰ھ میں راجہ چھپ کر فرار ہوگیا اور باقی ماندہ محصورین نے، جو غالباً فاقہ کشی میں مبتلا تھے، قلعے کے پھاٹک کھول دیئے؛ "مالوہ خاص" یعنی موجودہ وسط ہند کے جنوبی ٹکڑے کی فتح دو سال بعد (۶۳۲ھ میں)، تکمیل کو پہنچی اور **بھیلسا** اور **اُجّین** کی تسخیر سے سلطنت دہلی کی جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئیں؛

بیان کرتے ہیں کہ مالوے کے اِن شہروں میں دو قدیم بُت کدے تھے جنھیں سلطان شمس الدّین نے منہدم کرا دیا اور اُجّین کی بعض برنجی مورتوں کو جن میں راجہ بکرماجیت کا بُت بھی تھا، اٹھوا کر دہلی لے گیا[1]؛ تاریخ ہند میں ایسی بُت شکنی

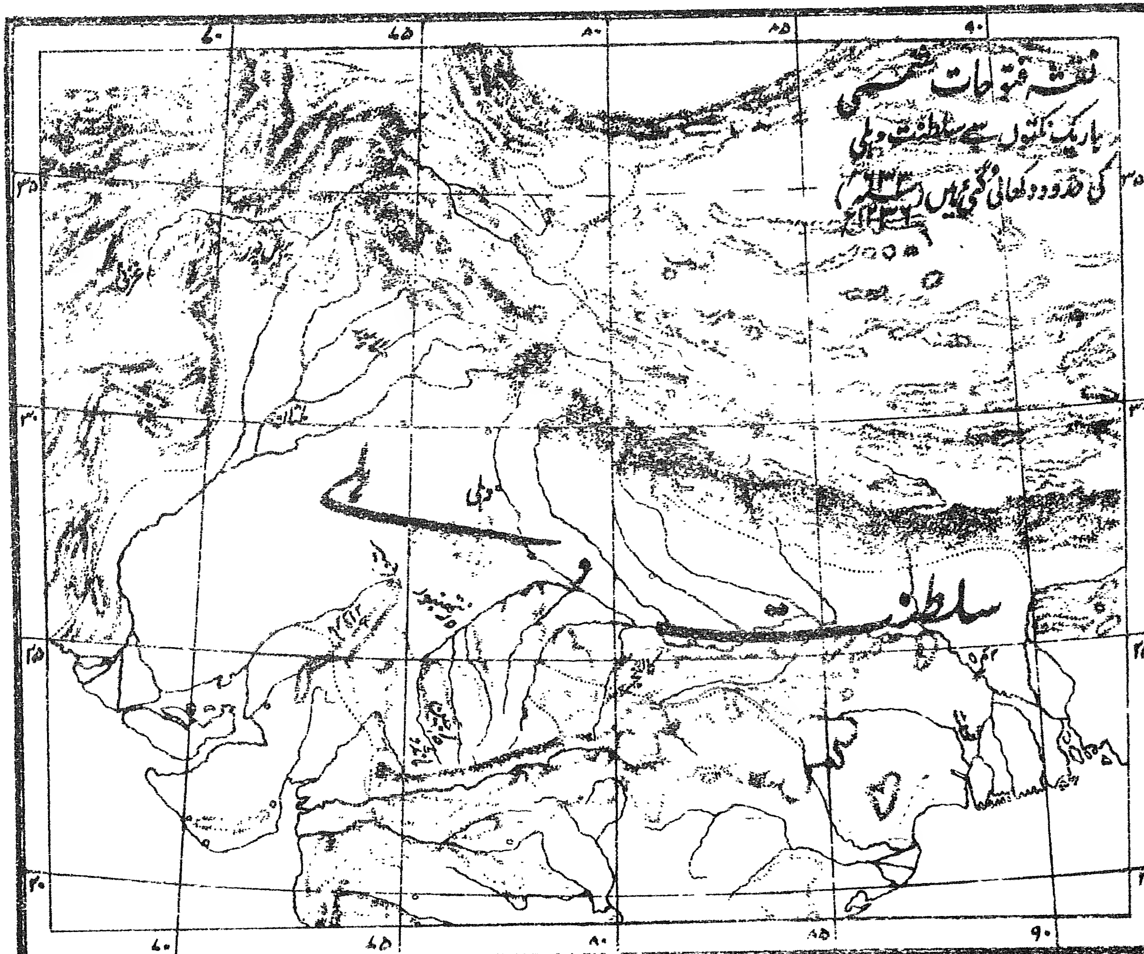
---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۷۶۔ نیز دیکھو منتخب التواریخ صفحہ ۶۷

کی خال خال مثالیں اور بھی موجود ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مذہبی تعصّب ہمیشہ کسی خاص وجہ اشتعال یا مُلکی مصلحت پر مبنی ہوتا تھا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ جب کسی مفرور یا مقتول راجہ کے خالی محلات پر مسلمان قبضہ اور اُن کے بادشاہ یا اُمرا ان میں سکونت اختیار کرتے تو محلات کے اندر راجہ کے جو (خانگی)، منادر یا معابد ہوتے تھے، اُن کو حسب ضرورت تڑواکر اسلامی مساجد کی صورت میں تبدیل کرلیا جاتا تھا؛ ورنہ مذہبی جبر کی اسلامی شریعت نے کبھی بھی اجازت نہیں دی بلکہ ممانعت کی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اپنے مذہب کا سب سے زیادہ جوش رکھنے کے باوجود مسلمانوں نے، دیگر فاتحین کی نسبت غیر قوموں کو سب سے زیادہ مذہبی آزادی دی تھی۔ عرب فاتحین کی مذہبی روا داری کو اب یورپ کے غیر مُسلم محقّق بھی عام طور پر تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا جو طرز عمل رہا اُس پر موقع بہ موقع مختصر طور پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ اجمالاً یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر ہندوستان کے سب یا اکثر فرماں روا مذہبی جبر و تشدد سے کام لیتے رہتے تو چھ سو برس کی اسلامی حکومت کے بعد اس مُلک میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے سہ گنی زیادہ نہ ہوتی؛ خود سلطان شمس الدین کی جن فتوحات کا ذکر ہمارے پیش نظر ہے۔ اُن میں

قلعۂ منڈور کا پرانا مندر[1] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہر مندر کے توڑ دینے کا ایسا شوق نہ تھا جیساکہ اس زمانے کی انگریزی تاریخوں میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھیلسا کے بالکل قریب بھی بودھ مت والوں کے کئی قدیم ٹوپ (گنبد) اور زیارت گاہیں موجود ہیں شمس الدین یا بعد کے کسی اسلامی فرماں روا نے انہیں خواہ مخواہ تڑوا کر مفت کا "ثواب" حاصل نہیں کیا!

[1] اس مندر کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم سنہ ۱۳۱۰ء یا سنہ ۱۲۶۰ء


نقشہ فتوحات شمسی
باریک لکیروں سے سلطنت دہلی
کی حدود دکھائی گئی ہیں
سلطنت
دہلی

ایلتتمش کے جانشین۔

دکن کو چھوڑ کر، جو عرصے تک شمالی ہند سے جداگانہ ملک سمجھا جاتا رہا، اب تقریباً تمام ہندوستان "ایک چھتر کے نیچے" تھا۔ ہر جگہ "اَلکِبریَاءُ لِلّٰہِ" کے پھریرے اُڑ رہے تھے جو رایاتِ شمسی کی توقیع تھی اور جن علاقوں میں براہِ راست سلطان کی عملداری نہ تھی وہاں کے رئیس بھی رسمی طور پر سلطنت دہلی کے باج گزار یا زیر اثر سمجھے جاتے تھے؛ اس شہر نے صرف پچیس تیس برس میں وہ تعجب انگیز مرکزیت حاصل کرلی تھی کہ گو سلطان شمس الدین کی وفات (۶۳۳ھ، ۱۲۳۶ء) کے بعد کئی سال تک کوئی ایسا فرماں روا تخت پر نہ بیٹھا جو اُس کی جانشینی کا حق ادا کرتا اور اپنے نیم آزاد صوبہ داروں کو پوری طرح قابو میں رکھ سکتا، باایں ہمہ دارالملک دہلی کی سیاسی اہمیت میں زیادہ فرق نہ آیا اور طاقتور تُرک امرا کی باہمی آویزش یا بادشاہ سے بغاوت بھی سلطنت کی پیوستگی میں ایسا رخنہ پیدا نہ کرسکی کہ مختلف صوبہ داروں کو دہلی کا تعلق توڑ کر علانیہ خود مختار بن جانے کی جسارت ہوتی؛ مگر اس سے کبیر خان ایاز، حاکم ملتان، مستثنیٰ ہے جس نے مغلوں کی یورش کے زمانے میں وسیع پیمانے پر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱ یعنی سلطان شمس الدین کی تسخیر مندور سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔ گزیٹیئر۔ جلد سترہ صفحہ ۱۷۱؛ بھیلسا کی نواح میں جو بودھ مت کے "ٹوپ" موجود ہیں ان کا ذکر اس تاریخ کی کتابِ اوّل میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ نیز دیکھو گزیٹیئر جلد آٹھ۔ صفحہ ۱۰۷۔

دفاعی جنگ کی تیاریاں کیں اور ساتھ ہی اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کردیا (۶۲۴ھ) دہلی میں اس وقت سلطان شمس الدین کا تیسرا جانشین فرماں روا تھا۔ مگر صرف چھ برس میں تین بادشاہوں کا عزل و نصب ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں اس منصب جلیل کی اہلیت نہ تھی۔ درحقیقت سلطان مرحوم کی اولاد (ایک بیٹی اور آٹھ بیٹوں) میں اگر کوئی حکمرانی کی قابلیت رکھتا تھا تو وہ اس کا بڑا بیٹا ناصرالدین محمود فاتح بنگال تھا۔ اس نے باپ کی زندگی میں وفات پائی اور سلطان کو دوسرے بیٹوں کی طرف سے اتنی بدظنی تھی کہ اس نے اوّل اوّل اپنی بیٹی سلطانہ رضیّہ کی ولی عہدی کا اعلان کردیا تھا[1] لیکن معلوم ہوتا ہے آخری بیماری میں وہ اپنے منجھلے بیٹے **رکن الدین** سے رضامند ہوگیا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اُمرا نے بھی اسی شہزادے کے ہاتھ پر بیعت کرلی (شعبان ۶۳۳ھ)

رکن الدین بالکل لااُبالی مزاج کا امیرزادہ تھا اور بادشاہی ملتے ہی لہو ولعب میں منہمک ہوگیا۔ اُدھر اس کی ماں نے حکومت کے معاملات میں دخل دینا اور محل کی دوسری خواتین کو گزشتہ رقابت کے انتقام میں ستانا شروع کیا غرض چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ رکن الدین کے خلاف ہر طرف شورش بپا ہوگئی اور وہ شہر سے باہر فوج

[1] طبقات ناصری - صفحہ ۱۸۵

لے کے گیا تو خود شہر میں اُمرائے دہلی انحراف کرنے لگے۔ اِسے دفع کرنے کے لئے وہ دوبارہ شہر میں آیا تھا کہ لوگوں نے یورش کر کے اُسے اور اس کی ماں کو محل میں قید کردیا اور سلطانہ رضیّہ کو بادشاہ تسلیم کرلیا جو اس آخری مخالفت میں پیش پیش تھی (ربیع الاوّل ۶۳۴ھ)

یہ لائق شہزادی اُمورِ جہانداری سے بخوبی واقفیت رکھتی تھی۔ اُس کی شجاعت اور فراست میں بھی کسی کو کلام نہ تھا لیکن اسلامی ممالک میں عورتوں کی بادشاہی کو کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ دوسرے رضیّہ کے کئی بھائی موجود تھے اور گو رُکن الدّین اور اُس کی ماں سے پیچھا چھڑانے کے لئے امرائے دہلی نے رضیّہ کی بادشاہی پر اتفاق کرلیا تھا، اور جن صوبہ داروں نے سرکشی کی انہیں اوّل اوّل رضیّہ نے جبراً اپنا مطیع بنالیا، باین ہمہ یہ اُمرا پوری طرح مطمئن نہ ہوئے اور اس کے خلاف کہیں نہ کہیں شورش کی آگ بھڑکتی رہی حتّٰی کہ ۶۳۷ھ میں جب کہ وہ اسی قسم کی ایک شورش فرو کرنے کی غرض سے بھٹنڈے پر فوج کشی کر رہی تھی خود اس کے ہمراہیوں نے سازش کر کے اُسے گرفتار کرلیا اور دہلی میں اس کے ایک اور بھائی سلطان معزالدین بہرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کردیا گیا! رضیّہ نے قید میں بھٹنڈے کے صوبہ دار سے شادی کر کے پھر ایک مرتبہ تختِ دہلی کے لئے قسمت آزمائی کی تھی۔ مگر

بہت کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ اور اُسکا شوہر شکست کھا کے مارے گئے۔

اسی بادشاہ بہرام شاہ کا عہد ہے جس میں مغلوں یا چنگیز خانیوں نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ کو عبور کیا اور حکومت دہلی کو از سرِ نو پنجاب کو بچانے کا فکر پیدا ہوگیا۔

یہ خوفناک حملہ آور، جنھیں اسلامی تاریخوں میں "کفارِ مغل" یا چنگیز خانیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی زمانے میں **مغولستان** (منگولیہ) کے پہاڑی بیابانوں سے اُٹھ کر ٹڈی دل کی طرح ایشیا کے اسلامی ممالک پر پھیل گئے تھے اور کرمان و غزنی پر مستقل قبضہ کرنے کے بعد، اب ہندوستان کے زرخیز علاقوں پر اُن کا دانت تھا۔ شمالی وسطِ ایشیا کے وحشی اقوام کے یہ سیلاب یورپ و ایشیا کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہ تھے۔ قرونِ ماضیہ میں کوہستان التائی کی وادیاں ان قوموں کے فطری گھوارے تھے جہاں چند صدی میں اِن کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ پھر کوئی مُلک ان کا ریلا نہ روک سکتا تھا اور وہ سیلابِ بے پناہ کی طرح ممالک جنوبی میں اُمنڈ آتے تھے! قدیم تاریخ میں اِن یورشوں کا جا بہ جا سراغ ملتا ہے لیکن تفصیلی واقعات میسر آنے کے اعتبار سے وہ "فتنۂ مغول" یہی ہے جس کے صحیح حالات محفوظ ہیں[1]۔

فتنۂ مغول

---

[1] ساتویں صدی ہجری اور بعد کی اکثر بڑی بڑی عربی فارسی تاریخوں میں

واضح رہے کہ یہ وحشی قوم، ترک یا تاتاریوں کی ہم نسل تھی اور آپس کی لڑائیوں میں اکثر تاتاریوں ہی کا پلّہ بھاری رہتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے اخیر تک مغل قبائل کسی حد تک تاتاری بادشاہوں کے ماتحت تھے۔ لیکن اسی زمانے میں ایک مغل بادشاہ **آونگ خاں** (طغرل تگین) نے مغولستان کے صحرائی علاقوں میں بڑی قوّت اور جمعیت بہم پہنچائی اور **تمورچی** یا **تمورچین** بن یسوکا نامی مغل سردار نے بھی اپنے ہمسایوں سے شکست کھاکر اوّل اسی بادشاہ کی پناہ لی تھی۔ یہی تمورچین وہ سردار ہے جو آخر میں **چنگیز خاں** کے مُہیب لقب سے دنیا میں مشہور ہوا۔[1] تمورچین کی پہلی ترقی یہ تھی کہ آونگ خاں سے اُس کی لڑائی چھڑی اور اس میں کامیاب ہوکر وہ اُس کی "سلطنت" کا مالک ہوگیا۔ یہ سلطنت چند ویران و وسیع رقبوں پر مشتمل تھی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵۔ "فتنۂ مغول" کے حالات تحریر ہیں ابنِ اثیر نے خاص کر نہایت عمدہ اور سبق آموز پیرائے میں ان کافروں کے ہاتھ سے بلادِ اسلامی کی تباہی کے واقعات لکھے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے سب سے اچھا ماخذ طبقات ناصری ہے جس کا مؤلف ان یورشوں کے وقت خود بھی بعض لڑائیوں میں شریک تھا اور اسے معلومات کے دیگر مستند ذرائع بھی میسر تھے۔ چنانچہ اس کی تاریخ کا آخری حصہ (طبقہ ۲۳)، "فتنۂ مغول" کے متعلق نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ۱۲

[1] بعض تاریخوں میں اسے تموجین یا تموجین اور چنگیز کی بجائے جنگیز بھی لکھا ہے۔ ۱۲

جن میں صحرائی مغلوں کے خانہ بدوش قبائل اپنے اونٹ اور گھوڑے چراتے پھرتے تھے۔ تمورچین نے اِن میں اتحاد و پیوستگی پیدا کی اور ایک بہت بڑی مجلس منعقد کر کے الوس (یعنی قبائل) مغول میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، اور غالباً بعض ایسی تدابیر بھی اختیار کیں جن سے یہ اوہام پرست وحشی اس کو خدا کا خاص فرستادہ یا اوتار سمجھنے لگے۔

شمالی چین کی فتح اور ترکستان کے تاتاری بادشاہ کو مغلوب کرنے کے بعد تمورچین کو، جواب چنگیز یا چنگیز خاں، یعنی "بڑا سردار" ہوگیا تھا، اسلامی ممالک میں سب سے پہلے خوارزم (خیوا) کے بادشاہ سے سابقہ پڑا جس کی حدودِ سلطنت ترکستان کے علاقے تک پھیلی ہوی تھیں۔ اُن دنوں (۶۱۶ھ میں) یہاں سلطان محمد خوارزم شاہ، جو خود بھی ترک نژاد تھا، فرماں روائی کرتا تھا اور مشہور ہے کہ اُسی کے اشارے سے مغلوں کے سفیر اور مغل سوداگروں کے قافلے کو، جس میں چین و ترکستان کی بیش قیمت اشیا تھیں، سلطان کے ایک عہدہ دار نے لوٹ لیا اور تمام مغل سوداگر و سفیر اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ایک شخص البتّہ بچ کر نکل گیا تھا جس نے چنگیز خاں کو اس واقعے کی اطلاع دی اور اس نے شاہ خوارزم سے انتقام لینے کی تیاریاں کیں۔

بروئے درایت یہ قصّہ کسی قدر مشتبہ نظر آتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ چنگیز خان اس راز کو خوب سمجھتا تھا کہ

اگر ایک پراگندہ قوم کو متحد کرنا ہو تو کسی غیر سلطنت سے جنگ چھیڑ دی جائے اور عجب نہیں کہ اس موقع پر مغلوں کے جنگی جوش کو جذبۂ انتقام سے بڑھکر شوقِ غارتگری نے تقویت پہنچائی ہو۔ بہر حال، مغولستان کے ہر گوشے میں چنگیزی قاصد دوڑ گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں پایۂ تخت قراقرم کے میدانوں میں ۶ سو علم لہراتے نظر آئے اور فی علم ایک ہزار کے حساب سے، ۶ لاکھ جنگجو سواروں کا لشکر جمع ہوگیا۔[1] کوچ کے وقت دس دس سواروں کی ٹولی بنا دی گئی تھی اور ہر ٹولی کے پاس کھانا پکانے اور پانی پینے کے لئے ایک دیگچہ اور مشک تھی اور چونکہ تین مہینے تک ایسے مُلک کا سفر درپیش تھا جہاں رسد ملنے کی اُمّید نہ تھی، لہذا گھوڑوں کے بہت سے گلّے فوج کے ساتھ تھے کہ جب کچھ نہ ملے تو اُن کے گوشت اور گھوڑی کے دودھ سے شکم پُری کی جائے۔[2]

غرض ۶۱۶ھ/۱۲۲۰ء میں یہ ٹڈّی دَل، شاہ خوارزم کی فوجوں کو شکستیں دیتا ہوا، سمرقند و بخارا کے علاقوں میں پھیل گیا۔ راستے میں جو شہر و قریہ ملا وہاں کے زن و مرد تقریباً ہر متنفّس کو مغلوں نے بے دریغ قتل کیا اور بستیوں میں

[1] طبقاتِ ناصری مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی میں آٹھ سو علم اور تین لاکھ گھوڑے (؟) لکھے ہیں مگر یہ غلطی ہے۔ (دیکھو راورٹی صفحہ ۹۶۸)

آگ لگا کر آبادی کا نام و نشان مٹا دیا۔ یہی گت خود اِن شہروں کی ہوی جو علم وہنر کے اعتبار سے اُن دنوں متمدّن دنیا کے سب سے بڑے مرکز شمار ہوتے تھے۔ بہت کم نفوس ایسے تھے جو مغلوں کی بہیمیت کا شکار ہونے سے بچے اور جو مارے نہیں گئے اُنکے ساتھ ایسی بے رحمی اور بے آبروئی کا سلوک کیا گیا کہ اِس ذلّت و تکلیف کے مقابلے میں، موت راحت نظر آتی تھی۔ اُترار، تاشقند، خُجند، نُور اور بلخ سب پر کم و بیش یہی گزری اور اِس خوفناک تاراجی سے نہ وہ شہر محفوظ رہے جنہوں نے مغلوں کا مقابلہ کیا تھا، اور نہ وہ جنہوں نے رحم وکرم کی امید پر مصالحت کرلی تھی۔ سمرقند فتح کرنے کے بعد چنگیز نے اپنی فوج کا ایک حصّہ تو سلطان خوارزم شاہ کے تعاقب میں بحرِ خزر کی جانب روانہ کیا اور ایک فوج اس کے چھوٹے بیٹے تولی خان کی سرکردگی میں عراق و خراسان کے علاقوں میں گھس گئی۔ خوارزم شاہ شکستیں کھاتا ہوا، استرآباد تک ہٹ آیا تھا وہیں سفر کی تکان اور اِن مصائب کے رنج میں اُس نے وفات پائی ۱۲۲۰ء، مگر مغلوں کی وہ فوج جو اس کے تعاقب میں آئی تھی شوق غارت گری میں آذربیجان، قفقازیہ تک بڑھی اور یہاں سے سلطنتِ روس کے یورپی علاقے پامال کرتی ہوی سائبیریا

کے راستے پھر مغولستان پہنچ گئی ہے مرو و خراسان کے شاداب خطّوں کو بے رحم تولی خاں نے غارت کیا اور شہر ہرات کو فتح کرکے بدخشاں میں اپنے باپ سے جا ملا جو خوارزم شاہ کے جانشین **سلطان جلال الدّین** سے لڑنے کے لئے غزنی کی طرف بڑھ رہا تھا ہے

چنگیزی لشکر ہند میں۔

جلال الدّین اپنے باپ کا سب سے بڑا اور لائق بیٹا تھا لیکن اس عرصے میں کہ وہ اپنے باپ کا تابوت لیکر وطن آئے، پائے تخت خوارزم میں چند امرا نے اُس کے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور گو ایک فریق جلال الدّین کا طرفدار تھا لیکن اس نازک وقت میں کہ چنگیز خانی وحشیوں نے تھلکہ مچا رکھا تھا، اُس نے اپنے حق کے واسطے بھائی سے لڑنا پسند نہ کیا اور خاموشی سے جاں نثاروں کا ایک گروہ ساتھ لے کر مغلوں سے بچتا ہوا غزنی آگیا (ذی الحجہ ۶۱۷ھ) جہاں چند سال پہلے خوارزمیوں نے تاج الدّین یلدز کو نکال کر اپنا قبضہ جمالیا تھا (صفحہ ۱۸۱) غزنی میں بہت سے ترک سردار جنھیں مغلوں کی یورشوں نے ہر طرف منتشر کر رکھا تھا، اس کے زیر علم جمع ہوگئے اور اوّل اوّل مغلوں کی جو فوجیں اس طرف بڑھیں انہیں جلال الدّین نے شکست دی۔ لیکن ۶۱۸ھ کے شروع میں جب خود چنگیز خاں اپنے پورے لشکر کو لے کر بڑھا تو جلال الدّین اس ٹڈی دل کا مقابلہ نہ کر سکا

اور غزنی چھوڑ کر ہندوستان کی طرف ہٹ گیا۔ وہ غالباً سلطنت غزنی کی قدیم حدود کی بنا پر پنجاب کی ملکیت کا مدعی تھا اور اسی علاقے میں پہنچ کر از سرنو جنگی تیاریاں کرنی چاہتا تھا۔ مگر ابھی دریائے سندھ کو اُس نے عبور نہیں کیا تھا کہ ناگہاں چنگیز خانی لشکر نے بڑھکر اُسے تین طرف سے گھیر لیا اور دریا کے مغربی کنارے پر وہ خوں ریز لڑائی ہوئی جو شاید اقوام دنیا میں صرف تُرک ہی لڑ سکتے ہیں۔ سلطان کے رفیقوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور مقابلہ کئی لاکھ تیغ زنوں کے لشکر سے تھا جو آج تک کسی غنیم سے مغلوب نہ ہوا تھا۔ جلال الدین اس مقابلے سے بچتا ہوا خوارزم سے غزنی اور غزنی سے ہندوستان آیا تھا لیکن دشمن کے سامنے پہنچ جانے کے بعد اس کی غیرت نے بغیر لڑے میدان سے نکل جانا گوارا نہ کیا جس کا ابھی تک موقع موجود تھا۔ غرض صبح ہوتے ہی مغلوں کی فوج نے حرکت کی اور دوپہر تک سلطانی رفقاء فوق العادت شجاعت سے لڑتے اور کٹ کٹ کے گرتے رہے۔ حتّٰی کہ میمنہ اور میسرہ منتشر ہو گئے اور ان کا کوئی سپاہی زندہ نہ رہا۔ لیکن قلبِ سپاہ کی پیوستگی میں، جسے خود سلطان لڑا رہا تھا، مطلق فرق نہ آیا۔ یہ پوری صف جس میں غالباً دو ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، اُسی طرح

قدم جمائے ہوئے لڑتی رہی اور مغلوں کا سخت سے سخت حملہ بھی اس میں بے ترتیبی نہ پیدا کرسکا۔ حملہ آور سمندر کی موجوں کی طرح ہر طرف سے بڑھے چلے آتے تھے اور اُن کی پیہم یورش نے آدھے سے زیادہ سپاہیوں کو مار کر گرادیا تھا۔ لیکن سلطان جلال الدّین کے متعلق چنگیز کا حکم تھا کہ اُسے زندہ گرفتار کیا جائے اور اب، جب کہ سلطان کے ساتھیوں کی کُل تعداد صرف سات سو رہ گئی تھی، اِس حکم کی تعمیل میں چند ساعت کی محض تاخیر نظر آتی تھی۔ ادھر جلال الدّین کا ناموزاد بھائی اُسے لپٹ گیا کہ جس طرح ہوسکے اب بھی اس لڑائی سے ہٹ کر نکل جائے، جس کا انجام، آغاز ہی کے وقت معلوم ہوچکا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جنگی گھوڑے سے اُتر کر وہ اسپ خاصہ پر سوار ہوا۔ اہل و عیال کو الوداع کہی۔ ایک آخری حملہ کرکے مغلوں کو تھوڑی دور تک ہٹادیا اور پھر رُخ بدل کر گھوڑے کو دوڑاتا ہوا دریا کی طرف لے گیا اور کنارے پر ایک چابک ایسا مارا کہ گھوڑا تڑپ کر دریا میں کود پڑا!

دریا کا کنارہ اُس مقام پر آٹھ دس گز کے قریب بلند تھا۔ اتنی بلندی سے۔ سِندھ جیسے تیز و عمیق دریا میں گھوڑا کُدا دینا ایسا ہوش رُبا کام تھا کہ دوست دشمن سب کے مُنہ سے واہ نکل گئی۔ چنگیز خاں اور اُس کے

مغل جنگ آزما حیرت سے تکتے ہی رہے اور جلال الدین گھوڑا تیرا کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا[1]

جلال الدین کی مراجعت

دریائے سندھ کے اس طرف ابھی تک ناصر الدین قباچہ والئی سندھ کی عملداری تھی یا بعض پہاڑی علاقوں میں کھوکھروں کے آزاد قبائل آباد تھے۔ کچھ عرصے تک جلال الدین کا اسی دوآبے میں، جسے "سندھ ساگر" کہتے ہیں، قیام رہا۔ اُس کے جاں نثار ترک جو مغلوں کے ہاتھ سے زندہ بچ گئے تھے، یہیں آکر اس کے شریک حال ہو گئے اور یہیں سے اُس نے سلطان شمس الدین سے پنجاب کے متعلق وہ خط کتابت کی جس کا مجمل حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے (صفحہ ۱۸۲) شمس الدین، سلطان جلال الدین کو دہلی میں اپنا مہمان بنانے پر آمادہ تھا لیکن یہ بات اُسے گوارا نہ ہوئی کہ ایسے غیر معمولی عزم و ہمّت کے بادشاہ کو اپنے سر پر آزادانہ تسلّط حاصل کرنے کی اجازت دے دیتا۔ اور اُس وقت جلال الدین میں اتنی قوّت نہ تھی کہ جبراً پنجاب کو چھین لیتا۔ بے شبہ اس شکستہ حالی میں بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا

[1] طبقات ناصری نے اِن واقعات کو اجمالی طور پر لکھا ہے (طبقہ شانزدہم) لیکن اس لڑائی کے تفصیلی حالات کے لئے سب سے اچھے ماخذ چنگیز خانیوں کے مدّاح علاء الدین جوینی کی مشہور تاریخ "جہاں کشا" ہے "جامع التواریخ" بھی مغل بادشاہوں کے دربار میں لکھی گئی اور نہایت مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ نیز دیکھو راورٹی۔ حواشی صفحات ۲۸۶ وغیرہ۔ ایلیٹ جلد دوم صفحہ ۵۵۰ وغیرہ۔

اور وہ کھوکھروں کو اپنے ساتھ ملاکر ایک نئی فوج مرتب کررہا تھا۔ لیکن ایک تو حکومت دہلی نے اس کی کوئی اعانت نہ کی، دوسرے قباچہ سے اس کی لڑائی چھڑ گئی اور ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ چنگیز خاں نے یکے بعد دیگرے دو فوجیں روانہ کیں کہ ایسے خطرناک حریف کو دم لینے کی مہلت نہ ملے۔ ان فوجوں کے سامنے سے جلال الدّین کو ہٹ کر جنوبی سندھ کی راہ لینی پڑی اور ملتان و اُچھ سے گزر کر وہ سندوستان پہنچا جسے آج کل سیہوان کہتے ہیں۔ پھر یہاں سے دیبل تک تمام قلعے فتح کرکے وہ ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی تدبیر کررہا تھا کہ عراق عرب سے تُرک اُمرا نے بلانا شروع کیا اور ادھر چنگیز مشرقی ممالک سے واپس مغولستان چلا گیا لہٰذا سلطان جلال الدّین بھی دوبارہ مغلوں سے شمشیر آزمائی کرنے کے لئے صحرائے مکران کے راستے ایران آگیا اور یہیں عراق و آذربیجان میں ایک عرصے تک اپنی شجاعت کے جوہر دکھا کر اس نے جان دی۔ (۶۲۸ھ)[1]

مگر جلال الدین کی وجہ سے مغلوں نے ہندوستان کا جو راستہ دیکھ لیا تھا اُسے وہ پھر کبھی نہ بھولے۔ خود چنگیز خاں اوّل اوّل ہندوستان کے راستے چین جانے کا تہیہ کررہا تھا اور

[1] ایک روایت، جسے راورٹی بھی صحیح تسلیم کرتا ہے یہ ہے کہ آخر میں اس کا دل دنیا سے سرد ہوگیا اور اس نے درویشانہ لباس پہن کر بہت دن تک گمنامی میں زندگی بسر کی۔ (راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۲۹۹)

اس کی غیر معمولی ہمت کے آگے فاصلے کی درازی کوئی قابلِ لحاظ شے نہ تھی۔ لیکن اسی اثناء میں خبر ملی کہ ترکستان و خطا کے بعض رئیسوں نے سرکشی پر کمر باندھی ہے اور مغلوں کی اطاعت سے منحرف ہو گئے یا ہونا چاہتے ہیں۔ پس چنگیز خاں کو مغرب کی طرف مراجعت کرنی پڑی (۶۲۰ھ) اور ہندوستان سے گزرنے کی (یعنی اس شاداب ملک کو تباہ و تاراج کرنے کی) آرزو اس کے دل میں تھی بھی تو پوری نہ ہوسکی اور وہ مغولستان پہنچ کر چار سال کے اندر ہی اندر فوت ہوگیا[1] (رمضان ۶۲۴ھ؁ ۱۲۲۷ء)

اب چنگیز خاں کی وصیّت کے مطابق اس کا تیسرا بیٹا

---

[1] صاحب طبقاتِ ناصری نے اس خونخوار فاتح کی صورت و سیرت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ جس وقت چنگیز خاں خراسان آیا، اس کی عمر پینسٹھ* سال کی تھی۔ وہ نہایت تنومند، طاقتور اور دراز قامت آدمی تھا۔ چھدری ڈاڑھی کے بال سفید ہوگئے تھے اور بلّی کی سی (کنجی) آنکھیں تھیں" "در غایتِ جلادت و زیرکی و عقل و دانائی و ہیبت و قتال، عادل و ضابط و خصم شکن و دلیر و خونریز و خونخوار۔ و ایں معنی بر ہمہ عالمیاں ظاہر است کہ او را چندین معنی عجیب بودہ است۔ اوّل آنکہ سحر دانستہ (یعنی شعبدہ بازی) دانست۔ گویند بعضے از شیاطین با او یار بودند...."

(طبقات۔ صفحہ ۳۷۳۔ * کلکتے کے اس مطبوعہ نسخے میں عمر پچپن سال لکھی ہے مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ نیز دیکھو راورٹی۔ صفحہ ۱۰۷۷)

اُگتائی خاں وارثِ ملک ہوا جسے "قاآن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ شخص اپنے باپ یا بھائی (چغتائی) کی طرح مسلمانوں کا دشمن نہ تھا اور اُس کے عہد میں اسلامی ملکوں میں از سرِنو آبادی اور سرسبزی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن افغانستان پر مغلوں کا پورا تسلط ہونے کے بعد سندھ و پنجاب اُن کی زد میں آ گئے تھے۔ سلطنتِ دہلی سے لڑائی چھیڑنے کے بھی بہت سے حیلے مل سکتے تھے کیونکہ شمس الدین کے زمانے سے یہ سلطنت خراسان و سیستان، مکران وغزنی کے اُن امیرزادوں کا مامن بن گئی تھی جو کسی طرح چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر فرار ہو گئے تھے۔ دوسرے عجب نہیں کہ سلطان شمس الدّین کی وفات کے بعد اُمرائے ہند کی نا اتفاقی نے بھی مغلوں کو جو پہلے سے موقع کی تاک میں تھے، ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت دلائی ہو۔ بہرکیف، ۶۳۹ھ میں غور و ہرات کے مغل سرداروں نے ایک بڑی فوج مرتب کی اور طائر نامی سپہ سالار کے ماتحت دریائے سندھ کو عبور کیا۔ ان علاقوں میں سلطنتِ دہلی کے (ملتان و لاہور) دو صوبے تھے اور اگر یہاں کے صوبہ دار (مقطع) مل کر مدافعت کرتے تو مغلوں کو روک لینا یا کم سے کم اتنے عرصے تک الجھائے رکھنا محال نہ تھا کہ جنوبی اقطاع سے کمک پہنچ جائے جس کا قطب الدّین کے زمانے سے بہت عمدہ

انتظام کردیا گیا تھا لیکن عہد رکن الدین و رضیہ میں جو اختلافات اُمرائے سلطنت کے درمیان پیدا ہوگئے تھے معزالدین بہرام بھی انہیں دور نہ کرسکا تھا۔ ادھر بعض دیگر اسباب ایسے پیش آگئے کہ وہ وقت پر شہر لاہور کو تباہی سے نہ بچا سکا۔

لاہور کی تباہی

واضح رہے کہ حملہ آوروں نے سب سے پہلے ملتان کا رُخ کیا تھا جو سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اور آباد شہر تھا۔ مگر یہ سُن کر کہ کبیر خانِ ایاز والئ ملتان مقابلے کے لئے پوری تیاری کرچکا ہے اُنہوں نے ملتان آتے آتے شمال کی جانب گھوڑے موڑ دیئے اور یکایک لاہور پہنچ گئے۔ کبیر خاں نے جو بہت دن سے حکومت دہلی سے ناراض تھا، اپنی جنگی تیاری کے دوران میں سندھ کی خود مختاری کا بھی اعلان کردیا تھا اور بے شبہ اہل سندھ کو وطن کی مدافعت کا جوش دلانے کے لئے اُس کا یہ فعل مصلحت اور ذاتی فائدے سے خالی نہ تھا۔ لیکن چونکہ مرکزی سلطنت سے علیحدہ ہونا، اِس خود مختاری کا مدّعا تھا لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آوروں کے واسطے لاہور کا راستہ کُھل گیا اور سلطنتِ ہند سے مغلوں کی پہلی لڑائی جہلم کی بجائے راوی کے کناروں پر واقع ہوئی۔

اُن دنوں لاہور نہایت بارونق تجارتی شہر تھا لیکن یلدز وقباچہ کی شکست اور الحاقِ سندھ کے بعد اس کی جنگی

اہمیت کم ہوگئی تھی اور مغلوں کے اچانک حملے کے وقت قلعے میں جنگی اسلحہ اور سازو سامان اس قدر کافی نہ تھا کہ حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا جا سکے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ شہر کے بہت سے ذی اثر باشندوں نے مدافعت کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے اکثر سوداگروں کو جن کے تجارتی قافلے وسط ایشیا کے ممالک تک آتے جاتے رہتے تھے، چنگیزخانی عہدہ داروں سے تجارت کرنے کی اجازت لینی پڑتی تھی (کیونکہ اب وسطِ ایشیا کے بہت سے ملکوں میں انہیں مغلوں کا حکم جاری تھا) اور اسی سلسلے میں انہیں مغل حکّام سے وہ تحریری سندیں مل گئی تھیں جن میں حفظِ جان و مال کا وعدہ درج ہوتا تھا۔ اس قسم کی تحریریں ترکی اصطلاح میں "پائزہ" کہلاتی تھیں۔

یہ رنگ دیکھکر، چند روز ہی کی لڑائی میں لاہور کے صوبہ دار ملک قراقش کو شہر کی مدافعت سے نا امیدی ہوگئی۔ دہلی ایک طرف بھٹنڈے یا سمانہ کی جنگی چھاونیوں سے بھی کوئی فوجی مدد وقت پر نہ پہنچ سکی اور ادھر حملہ آوروں کی منجنیقوں نے پیہم سنگ باری سے فصیلوں میں رخنے ڈالدئے۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل تھا۔ اور یہ پڑھکر کہ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی خاص منجنیق چلانے

پر مقرر تھے۔[1] اندازہ ہوسکتا ہے کہ مغلوں میں قلعہ شکن توپ کی اس پیش رو (یعنی منجنیق) کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی؟

آخر ایک رات قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور جس طرح ممکن ہوا لڑ بھڑ کر نکل گیا۔ اُس کی جرأت قابلِ تعریف تھی لیکن اس واقعے نے اِدھر تو محصورین کو اور بھی شکستہ دل کردیا اور اُدھر محاصرین کے حملوں میں زیادہ شدّت آگئی اور اب وہ فصیل کے رخنوں میں سے حملہ کرکے شہر کے اندر تک آنے لگے۔ اس نازک موقع پر اسلامی فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑا اٹھایا اور کوتوالِ شہر (آق سنقر) اور امیر آخور* (دین دار محمد) کی ماتحتی میں اس وقت تک کہ ان میں کا ایک متنفس بھی زندہ رہا، برابر لڑتے رہے" تا آنگاہ کہ ہر دو طائفہ بعد از جہادِ بسیار بدولتِ شہادت رسیدند"[2]

اُن کی جانبازی رائیگاں نہ گئی۔ طبقاتِ ناصری کی روایت کے لاہور کے ... ؟ -

[1] طبقاتِ ناصری - صفحہ ۳۵۶ -

[2] طبقاتِ ناصری میں لاہور کے اس محاصرے اور تسخیر کا حال الگ الگ تین جگہ لکھا ہے مگر زیادہ تفصیل طبقۂ آخری میں درج ہے (صفحہ ۳۹۳ و ۳۹۴)

* امیر یا میرآخور یعنی داروغۂ اصطبل، جو اس زمانے میں فوج کے بڑے عہدہ داروں میں شامل ہوتا تھا۔

بموجب مغلوں کے تیس چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور ایسا تو شاید کوئی بھی نہ تھا جو بالکل زخمی نہ ہوا ہو۔ پھر یہ کہ گو اُنہوں نے شہر میں گھس کر نہ سوداگروں کے پایزوں کی پروا کی نہ عورتوں اور بچّوں کی آہ و زاری کی بلکہ قتلِ عام کردیا اور جو چند نفوس زندہ بچے اُنہیں قید کرکے اپنے ساتھ لے گئے بایں ہمہ لاہور پر ان کا مستقل قبضہ نہ ہوسکا اور غالباً مذکورۂ بالا نقصانات ہی کی وجہ سے وہ یہاں زیادہ نہ ٹھیرے بلکہ شہر کو تباہ و تاراج کرنے کے بعد بہت جلد واپس غزنی چلے گئے۔

شاید اس واپسی کی ایک وجہ یہ ہو کہ اُسی زمانے میں اُکتائی خاں نے وفات پائی (۶۳۹ھ) لیکن اصل سبب یقیناً یہی ہوگا کہ اُن کی تعداد کم رہ گئی تھی اور پایۂ تخت دہلی سے ایک بڑی فوج پنجاب کی طرف کوچ کر رہی تھی۔ غرض ہندوستان پر اس پہلی یورش میں یہ خوفناک حملہ آور لاہور سے آگے نہ بڑھ سکے؛ بایں ہمہ اُن کے اسی ایک حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا[۱] اور سلاطینِ دہلی کے منصوبۂ کشورکشائی پر اتنا اثر ڈالا کہ آیندہ نصف صدی تک اُنہیں اپنی حدودِ حکومت کو (جنوب میں)

[۱] لاہور کی تاراجی کی خبر نے دہلی میں کُہرام ڈال دیا تھا۔ اور نہ صرف تاریخوں سے بلکہ اُس زمانے کی دیگر تصانیف سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حملہ آوروں کی کس درجہ ہیبت اہلِ ہند کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

نربدا کے آگے بڑھانے کی جرأت یا فرصت نہ ہوی اور تمام برّاعظم ہندوستان کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت سیاسی اتحاد بہت دن کے لئے ملتوی ہوگیا۔ چنانچہ بلبن جیسے بلند حوصلہ اور اقبالمند بادشاہ نے بھی اِنہیں "مغول" سے شمالی ہند کو بچانے کی خاطر مزید فتوحات کا ارادہ ترک کردیا تھا جس کا حال کسی قدر وضاحت سے آگے آتا ہے؛

تسخیر لاہور کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو پنجاب کی ملکیت کا دعوی پیدا ہوگیا اور وہ بار بار اس ملک پر حملے کرتے رہے۔ اِن میں سے اکثر حملے محض معمولی تاخت تھے اور لوٹ مار کے سوا اُن کا اور کوئی "مدعا" نہ ہوتا تھا۔ لیکن تین چار مرتبہ اُنہوں نے زیادہ وسیع پیمانے پر بھی فوج کشی کی جس کا ذکر اپنی اپنی جگہ پر آیندہ ہماری نظر سے گزرے گا۔ اِن بڑے حملوں کا بھی بظاہر کوئی دیرپا سیاسی نتیجہ نہیں نکلا اور ادھر اسلام قبول کرنے کی بدولت مغلوں کی اندرونی حالت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگیا۔ بایں ہمہ وہ پنجاب پر برابر اپنا حقِ بادشاہی جتاتے رہے اور امیر تیمور کے حملے نے اس حق کی وہ تجدید و توثیق کی کہ بابر بادشاہ نے بھی اسی قدیم دعوی کو اپنے حملے کا حیلہ بنایا اور آخرکار ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ گویا ساتویں صدی ہجری میں طائرِ مغل کو جو آرزو

لاہور لائی تھی وہ دسویں صدی ہجری میں پوری ہوگئی!

۳۔ خاندان شمسیہ کے آخری بادشاہ

اس موقع پر مغلوں کا ٹل جانا بہت ہی غنیمت ہوا ورنہ سلطنت دہلی کو ابھی تک اپنے اندرونی تنازعوں سے نجات نہیں ملی تھی۔ بہرام شاہ سے بھی امرائے سلطنت کچھ زیادہ خوش نہ تھے اور خود اس کا چالاک وزیر خواجہ مہذب الدین دشمن ہوگیا تھا۔ بے شبہ مغلوں کی یورش اور لاہور کی تباہی کی اطلاع نے شہر میں ایسا انتشار پیدا کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے لوگ اپنے اختلافات بھول گئے اور قصرِ سفید میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا منہاج الدین (صاحبِ طبقات ناصری) نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ جوش کے عالم میں لوگوں نے ازسرِنو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا اور مغلوں کے مقابلے کے لئے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہوگیا[۱] لیکن یہ فوج ابھی دریائے بیاس تک بڑھی تھی کہ ادھر تو حملہ آور لاہور سے واپس چلے گئے اور ادھر ایک شخص کے کہنے میں آکر بادشاہ نے دہلی کے کسی مشہور فاضل قاضی شمس الدین کو قتل کرادیا جس سے

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۱۹۵۔ واضح رہے کہ صاحبِ طبقات ہندوستان آنے سے پہلے خراسان و ہرات کے علاقوں میں چنگیز خانیوں کی ابتدائی یورشوں کے وقت موجود اور بعض لڑائیوں میں بھی شریک رہ چکا تھا لہذا اس جلسے میں اسی کو تقریر کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔

شہر میں سخت برہمی پیدا ہوگئی ۔ مہذب الدین پہلے سے موقع کی تاک میں تھا۔ اُس نے سردارانِ لشکر کو بادشاہ کی طرف سے بدگمان کردیا اور یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ اسی لشکر نے جو ماہِ جمادی الآخر میں مغلوں سے لڑنے کے لیئے روانہ ہوا تھا ماہِ شعبان میں واپس دہلی آکر شاہی قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مصالحت اور صفائی کر لینے کی ابھی تک گنجایش تھی لیکن احمق مشیروں نے بادشاہ کو راہِ راست پر نہ آنے دیا اور آخرکار وہ قید ہوکر غالباً قتل کردیا گیا۔ (ذی قعدہ ۶۳۹ھ)

اہلِ شورش میں ملک **بلبن کشلو خاں**[۱] بھی پیش پیش تھا۔ اور بہرام شاہ کی معزولی کے ساتھ اوّل اوّل اسی کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا تھا لیکن باقی تین بڑے بڑے سرداروں نے شمس الدین کے مقبرے میں جمع ہوکر فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو بادشاہی اسی مرحوم سلطان کی اولاد میں رہنی چاہیئے، اور گو اس کے دو بیٹے بھی موجود تھے لیکن قانونِ وراثت کے اعتبار سے انہوں نے **علاء الدین مسعود** کا انتخاب کرلیا جو سلطان **رکن الدین** بن التمش کا بیٹا تھا۔ کشلو خاں نے کثرتِ رائے کے

۱؎ بعض فارسی تاریخ نویسوں نے اس بلبن اور غیاث الدین بلبن الملقب بہ "اُلغ خاں" میں کوئی امتیاز نہیں کیا جس سے طرح طرح کی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے حالانکہ یہ دو بالکل علیحدہ شخص ہیں اور پہلے کا پورا نام "عزالدین بلبن کشلو خاں" تھا۔

سامنے سر جھکا دیا اور سلطان مسعود کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ شاید اسی نیک نفسی اور اطاعت گزاری کے صلے میں نئے بادشاہ نے بھی دیگر اُمرا میں سب سے زیادہ اس کا اعزاز و اکرام کیا اور اجمیر و مانڈور و ناگور کے اقطاع عنایت کئے۔[1]

مغلوں کا دوسرا حملہ

مسعود بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح بادشاہی کے اہم فرائض بجالانے کی قابلیت نہ رکھتا تھا لیکن ابتدا میں اُس نے کوئی حرکت ایسی نہ کی کہ لوگوں کو شکایت کا موقع ملتا۔ دوسرے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر جن اُمرا کا انتخاب ہوا وہ نہایت مستعد اور بیدار مغز مُدبّر تھے اور اُن کی نگرانی میں نہ صرف حکومت کی کَل ٹھیک ٹھیک چلتی رہی بلکہ فوج کی ازسرنو تنظیم عمل میں آئی اور سلطنت کے نئے "حاجب" غیاث الدّین اُلغ خاں نے پہلی مرتبہ وہ لشکرِ جرّار مرتب کیا جس کی مستعدی اور قواعد دانی کچھ عرصے بعد دُور دُور کے ملکوں میں مشہور ہوگئی تھی۔

مگر پہلی دفعہ جب یہ فوج مغلوں سے لڑنے کے لئے اُچّہ کی طرف بڑھی تو کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور حملہ آور ڈر کے پسپا ہوگئے (۶۴۳ھ) مغلوں کا ہندوستان پر یہ دوسرا حملہ تھا اور اس مرتبہ وہ سیستان سے آئے اور افغانستان کے جنوب سے نکل کر سیدھے سندھ میں

[1] طبقات - ۲۶۹ وغیرہ

داخل ہوگئے تھے - کبیر خاں ایاز کی وفات (۶۳۹ھ) کے بعد یہاں سلطنت دہلی کی طرف سے جو صوبہ دار مقرر کئے گئے تھے اُن میں اُچھ کا حاکم ہندو خان اس حملے کے وقت اپنے مستقر پر موجود نہ تھا لہٰذا شہر کی مدافعت اُس کے نائب محمد صالح کوتوال کو کرنی پڑی جس نے کمال جواں مردی سے کئی ہفتے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ پایۂ تخت دہلی کی فوج قریب آ پہنچی اور اُس نے شمال کی طرف سے بڑھکر چاہا کہ خود محاصرین کو گھیر لے - لیکن مغل سپہ سالار منگوتہ چنگیز خاں کے خاص رفیقوں میں تھا - وہ اس جال میں نہ آیا اور بروقت اپنی فوج کو ہٹا لے گیا ؎

مگر یہ کامیابی بادشاہ کے حق میں نہایت نامبارک ثابت ہوئی تو اُچھ کا محاصرہ اٹھانے کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا خود وہ اس کے ساتھ آیا تھا - لیکن معلوم ہوتا ہے یہ سپاہیانہ زندگی اُسے راس نہ آئی اور صعوبات سفر کی تلافی اُس نے عیش و عشرت کے ایسے مشاغل سے کرنی چاہی جو اکثر انسان کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں - عیاش بادشاہ عام طور پر بدمزاج، شکّی اور ظالم ہو جایا کرتے ہیں مسعود نے بھی بعض فرومایہ مصاحبوں کی شہ سے احمقانہ حرکات شروع کیں اور مورّخ کے الفاظ میں "اُمرا کو (بلاوجہ) گرفتار یا قتل کرنا اُس کی

سلطان [علاء]الدین محمود

عادت میں داخل ہوگیا اور اس کی تمام طبعی خوبیاں بدل گئیں بیہودہ مشاغل اور شکار کی طرف اس درجہ میلان ہوا کہ ملکی کاروبار میں ابتری اور سلطنت میں خرابی پیدا ہونے لگی" یہاں تک کہ امیروں نے بالاتفاق اُسے معزول ومحبوس کرکے، خاندانِ شمسی کے ایک اور شہزادے ملِک ناصر الدین کو بادشاہی کے لئے منتخب کرلیا۔ (۶۴۴ھ سنہ ۱۲۴۵ء)

شاہانِ دہلی کے اس پیہم عزل و نصب کو دیکھکر قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابھی تک بادشاہ کا انتخاب اُمرائے سلطنت کے اختیار میں تھا اور گو ان اُمرا کے باہمی اختلاف رائے سے بعض اوقات خانہ جنگی کی نوبت پہنچ جاتی تھی، بایں ہمہ کوئی نالایق شخص، محض اس بنا پر کہ وہ سابق بادشاہ کا بیٹا یا بھائی ہے زیادہ عرصے تک بادشاہ نہیں رہ سکتا تھا لہذا اس حکومت کو ایک طور سے "موروثی بادشاہی" کہنا کافی نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے اسلامی سلطنت قائم کی وہ نسلاً تُرک اور شاہانِ غزنوی کے ہم قوم تھے، اور اس کتاب کے دوسرے باب میں سلطنت غزنی کے طرز حکومت پر اسی خیال سے ہم نے ذرا وضاحت سے بحث کی ہے کہ آئندہ سلطنت دہلی کے طرز بادشاہی سمجھنے میں مدد ملے۔ اس بارے میں فن سیاسیات کی جو اصطلاحیں ملتی ہیں، اُن میں سے کوئی بھی ایسی نظر نہیں آتی جو اس قسم کے

طرز حکومت پر چسپاں ہو۔ اسی لئے ہم نے "ترک شاہی" کی نئی اصطلاح وضع کی تھی اور بے شبہ "حکومتِ دہلی" کو ہم اکثر خصوصیات کے لحاظ سے یہی لقب دے سکتے ہیں۔ اور یہ وہ طرز حکومت تھا جس میں جمہوریت، حکومتِ شرفا (یا اُمراء) اور مطلق العنان موروثی بادشاہی کے تینوں عنصر جمع تھے۔ اس اعتبار سے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبے کا سپاہی نہ صرف بڑے سے بڑا عہدہ بلکہ آخر میں تخت سلطنت حاصل کرسکتا تھا، اس ترک شاہی میں جمہوریت کی شان تھی۔ اس لحاظ سے کہ بادشاہ کے انتخاب اور اہم ملکی معاملات میں صرف بڑے بڑے سردار دخل رکھتے تھے، اُسے حکومتِ اُمرا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ بادشاہی کے لئے بادشاہ سابق کی اولاد کا حق مرجّح مانا جاتا تھا نیز یہ کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد وہ کسی کی رائے یا مشورے کا قانوناً پابند نہ ہوتا تھا، لہذا اُسے مطلق العنان موروثی بادشاہی، کہنا بے بنیاد نہ ہوگا۔

مگر اس قسم کی اصطلاحی مُوشگافیوں میں اُلجھنا غیر ضروری ہے۔ طالب علم کے خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں تُرک نژاد بادشاہوں کے زمانے تک منصبِ بادشاہی کبھی عام سطح سے اس قدر بلند نہیں ہوا کہ پھر اُس تک کسی معترض کی رسائی نہ ہو۔ بے شبہ یہ جلیل القدر عہدہ بعض اوقات محض شہزادگی

یا جنگی کامیابی کے طفیل حاصل ہوجاتا تھا لیکن اس کے بعد بھی بادشاہ کو نہ صرف جنگی اور انتظامی قابلیت بلکہ عالی دماغی اور اخلاقی صفات میں اپنی برتری ثابت کرنی پڑتی تھی ورنہ وہ تختِ حکومت پر قائم نہ رہ سکتا تھا اور چند روز کی غفلت کافی ہوجاتی تھی کہ اُسے بزم عیش اور مسندِ جہانداری سے کھینچ کر زندان تاریک میں پہنچادے۔ ہم عصر مؤرخ کے چند ہی جملوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس عہد میں بادشاہی کی اہلیت کا معیار کیا تھا۔ سلطان رکن الدین کی معزولی کے اسباب بیان کرنے میں وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہاں را ہمہ معنی (یعنی ہمہ صفات) جمع باید۔ عدل باید تا رعیت آسودہ ماند۔ احسان باید تا حشم (یعنی ملازمین) آسودہ ماند۔ لہو و طرب و مخالطت با ناجنساں و خسیساں موجب زوالِ سلطنت گردد ..."[1]

ناصرالدین کی کم اہلی۔

نئے بادشاہ کو بھی مذکورۂ بالا معیار کے مطابق اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے نو برس تک جدوجہد کرنی پڑی۔ اور اگر اس میں ناکامی کے باوجود اس کی بادشاہی سلامت رہی تو اس کا سبب محض یہ تھا کہ آخرکار اُس نے اپنی کم اہلی کو گویا تسلیم کرلیا اور سلطنت کی باگ اُس شخص کے ہاتھ میں دے دی جو اپنے زمانے میں

[1] طبقات ناصری۔ صفحہ ۱۸۵ کلکتے کے مطبوعہ نسخے میں کچھ غلطی رہ گئی ہے دیکھو ترجمہ راورٹی صفحہ ۶۳۷۔

اُس کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ واضح رہے کہ ناصرالدّین محمود کی شرافت و فیاضی، اور عدل و رعایا پروری میں کسی کو بھی کلام نہ تھا۔ اس کے ایثار و نفسی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اُس کی دینداری کے بہت سے قصّے آج تک فارسی تاریخوں میں محفوظ و مشہور ہیں۔ اسی ہر دلعزیزی کی بدولت اُس کی تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام سے دہلی میں سنائی گئی[۱] (۲۳۔محرم ۶۴۴ھ) اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اُس نے حرف گیروں کو کسی خاص شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بایں ہمہ اُس میں انتظامی قابلیت کی کمی تھی اور اتنی استعداد و قوّت نہ رکھتا تھا کہ مفسدی یا شورہ پشت طبائع کو فساد اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ اس کی نرمی اور مروّت نے دربار ہی میں اُمرا کے دو فریق کردیے جن میں سے ایک **غیاث الدین بلبن** کے ساتھ تھا اور دوسرا **عمادالدّین ریحانی** سے مل گیا تھا۔

اِن میں غیاث الدین بلبن، بہرام شاہ کے وقت سے حاجب کے عہدے پر ممتاز تھا (جسے اِس زمانے کی اصطلاح میں "چیف سکرٹری" کہنا غلط نہ ہوگا) اور پھر

---

[۱] ہمارے مؤرخ مولانا منہاج الدّین نے بھی اس موقع پر دو نظمیں لکھی تھیں ان میں سے پہلے قصیدہ کا یہ مطلع مشہور ہے:

"آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است ٭ ناصر دُنیا و دیں محمود بن التمش است"

اپنی کارگزاری کے صلے میں "نائب الممالک" کے منصب جلیل اور "الغ خان" یعنی خانِ بزرگ کے لقب سے سرفراز ہوا تھا (۶۴۷ھ) بایں ہمہ چند سال کی ریشہ دوانی سے ریحانی کے ساتھ (جو غالباً خواجہ سرا تھا) بعض عمائدِ سلطنت بھی شریک ہوگئے اور اُن کی مخالفت نے ۶۵۰ھ میں بلبن کو دربار سے خارج کردیا۔ معتوب امیر کو ناگور کا مقطع یا صوبہ دار بناکر دربار سے علیحدہ کیا گیا تھا، لیکن اُس کے ہٹتے ہی ملک میں جا بجا شورش ہونے لگی اور دو ہی سال میں ناصر الدین کو معلوم ہوگیا کہ بلبن کے بغیر بادشاہی کرنا دشوار ہے۔ اسے بادشاہ کی کسر نفسی کہو یا انصاف و ایمان داری کہ پھر اُس نے بہت جلد بلبن سے مصالحت کرلی اور یہ کہہ کر حکومت اُسے سونپ دی کہ "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں اور اُمور سلطنت کا تمام اختیار تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ تو کوئی ایسا کام نہ کیجو کہ کل خدا کے حضور میں اس کا جواب نہ بن پڑے اور مجھے اور تجھے اُس دربار میں خجل ہونا پڑے"[۱]

---

[۱] منتخب التواریخ ۸۹۔ طبقات اکبری ۳۵۔

باب پنجم

سلطنت دہلی کا پہلا عروج

حضرتِ دہلی کنفِ دین و داد — جنتِ عدن است کہ آباد باد

ہست چو ذاتِ ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات !

(قران السعدین)

۱۔ غیاث الدین بلبن۔

آیندہ تیس تینتیس برس تک کشورِ ہند پر الغ خانِ اعظم یا غیاث الدین بلبن کی حکومت رہی۔ لیکن مختارِ کار اور نائب شاہ ہونے کے باوجود، سلطان ناصر الدین کی زندگی تک (یعنی سنہ ۶۵۲ھ ۱۲۵۴ء سے سنہ ۶۶۴ھ ۱۲۶۶ء تک) بلبن سلطنت کے نظم و نسق میں وہ ضبط و باقاعدگی نہ پیدا کر سکا جو اس کے عہدِ بادشاہی کی خصوصیت ہے؛ اس کا ایک سبب تو ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک باآں ہمہ اختیارات بادشاہِ وقت کا ماتحت

عہدہ دار تھا۔ مگر اس کا پورا دخل نہ ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ ابھی سلطنت کے مختلف اقطاع پر اُن "ملوکِ شمسی" کا تسلّط تھا جو بلبن کے ہم قوم و ہم چشم تھے اور پچھلے پندرہ بیس برس میں اس درجہ سرکش ہوگئے تھے کہ انہیں برائے نام مرکزی سلطنت کا مطیع و باج گزار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کی بڑی کارگزاری اور کامیابی نظر آتی تھی۔ یہ ملوکِ شمسی، بلبن کی طرح سلطان شمس الدّین کے تُرک غلام تھے اور انہیں بادشاہ نے تربیت دے کر سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کردیا تھا۔ غالباً اُس کی زندگی ہی میں ان کی وہ جماعت مرتّب ہوی جسے "ترکانِ چہل گانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور اگر مورّخ ضیاالدّین برنی کا قول صحیح ہے تو انہی غلاموں نے بعد میں اُن آزاد اُمرا اور شہزادوں کو بھی امورِ سلطنت سے بے دخل کردیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر بھاگے اور دربارِ دہلی میں بکمال قدردانی کے ساتھ جلیل القدر مناصب پر سرفراز کردئے گئے تھے۔[ع۱]

"ترکانِ چہل گانی"

ع۱ تاریخ فیروز شاہی (مولّفہ ضیاالدّین برنی) صفحہ ۲۶ و ۲۷۔

جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ تاریخ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تالیف ہوی تھی اور مولّف کا دعویٰ ہے کہ اُس نے طبقاتِ ناصری کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا گستہ سلسلہ جوڑدیا ہے۔ لیکن اوّل تو عہدِ ناصرالدّین محمود کے

طبقاتِ ناصری سے بھی بالواسطہ مذکورۂ بالا قول کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس تاریخ کے بائیسویں طبقے میں جن مقتدر اُمرا کے (''ملوک شمسیہ'' کے عنوان سے) حالات لکھے ہیں، وہ سب سلطان شمس الدّین کے تُرکی غُلام اور عمر و اقتدار کے لحاظ سے اکثر بلبن سے بھی بڑے تھے؛ لیکن اوّل تو مَوت اور باہمی ناچاقی نے ان کی جماعت کو کمزور کردیا دوسرے مرکزی حکومت میں کامل دخل پاتے ہی بلبن نے اپنی قوّت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۱ آخری چھ سال کے حالات کا، جنہیں صاحب طبقات تحریر نہ کرسکا تھا، پتہ نہیں چلتا دوسرے بلبن کے متعلق بھی جو کچھ ضیاء الدّین برنی نے لکھا ہے وہ کافی نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ مورّخ اپنی کوتاہی معلومات کو انشا پردازی کے زور سے پورا کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس زمانے کے بعض انگریز اہل تحقیق کی نظر میں اِس کتاب کی طرف سے کسی قدر بدظنی پیدا ہوگئی ہے؛ لیکن ایک تو کسی اور ہم عصر مورّخ کی تحریر موجود نہیں* دوسرے برنی کے شاعرانہ طرز تحریر کو دیکھکر یہ قیاس کرنا کہ وہ صحت و تحقیق کی پروا نہیں کرتا سخت ناقدردانی ہوگی پھر یہ کہ شاہانِ خلجی و تغلق کے متعلّق تو اُسے معلومات بھی کافی حاصل ہوگئی تھی جسے وہ نہایت خوبی کے ساتھ لکھتا اور اس زمانے کے مورّخوں کی طرح کہیں کہیں رائے زنی اور تنقید کرتا جاتا ہے؛

* راورٹی اور بعض دیگر اہل تحقیق کا یہ خیال صحیح نہیں کہ برنی کے علاوہ اس زمانے کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی۔ ایک کتاب ''ملحقاتِ طبقاتِ ناصری'' کا تو فرشتہ ہی خاص طور پر ذکر کرتا ہے (صفوہ،) جو عین الدّین بیجاپوری نے لکھی تھی اور بظاہر اب نایاب ہے؛

عدل اور دبدبہ

اس قدر بڑھا لی کہ کسی صوبہ دار کو علانیہ اکا بعرۂ کی بہ تقلید کرنے کی بہ مشکل جرأت ہوسکتی تھی؛ پھر جب اسلامی تعلیم کے کی وفات کے بعد تخت دہلی نے اس کے لیکن وہ تجّت تو دیگر اسباب قوّت و بالا دستی کے ساتھ اس تبیت درست و جلال بھی اپنی بادشاہی کے لوازم قرار دیئے جبا محض حق کی ساسانی بادشاہوں کا رعب و دبدبہ یاد آجاتا تھا ؛ سے

عہد بلبن کے شاہانہ طرز ماند و بود کی مورّخ نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے اور لکھا ہے کہ جس وقت اس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سرہنگ، اُمرا اور فوجی سردار اس کے گرد وپیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل جوانوں کو خاص اس کام کے لئے بیش قرار تنخواہیں دے کے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور اس شانِ محمودی اور شوکتِ سنجری کے ساتھ جس وقت بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند ہوتی تھی کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور حاضرین کے بدن میں، جو سو سو دو دو سو کوس سے چل کر خاص یہ

۱؎ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نہ صرف ناصرالدین کی اولاد میں بلکہ خاندان شمسی میں بھی کوئی مرد زندہ نہ تھا جو سلطنت کی وراثت کا مدعی ہوتا ؛ (دیکھو راورٹی صفحہ ۷۶۲)۔

طبقاتِ ناصری سے آتے تھے، لرزہ پیدا ہوجاتا تھا۔ بلکہ کیونکہ اس تاریخ کے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے، (" ملوک شمسیہ " کے سفیر ہوں یا ہندوستان ہی کی کسی سلطان شہ جہ یا راج کمار، تو وہ " خاکبوس " یعنی سے اکثر بلبن خوف سے گر پڑتے یا بیہوش ہوجاتے تھے[1]۔ اور باہم یہ باتیں بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر نہ تھیں بلکہ بلبن کے نزدیک بادشاہی کا اصول ہی یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہوجائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ و فساد کی اور ظالموں کو کمزور کے ستانے کی جسارت نہ ہوسکے۔ وہ بارہا کہتا تھا کہ جب تک بادشاہ " حرمت و حشمت خود، در ترتیبِ بار و کوکبۂ سواری و در نشستن و خاستن بہ آداب و رسومِ اکاسرہ، محافظت نہ نماید و در جمیع احوال و اقوال و افعال و حرکات و سکناتِ او حشمت بادشاہی مشاہدہ نہ شود، رعب او در دلِ خصمانِ بلادِ ملک او نہ نشنید۔ و ہیبتِ او و ہیبت اُمرا (یعنی عمّالِ او) در دلِ رعایائے ممالکِ او منقش نہ شود . . . و (دریں صورت) در کار ہائے ملکی خلل افتد و تمرّدِ رعایا بار آرد و از تمرّدِ رعایا شخصِ ملک (یعنی جسم ملک) مریض شود . . "[2]

---

[1] برنی صفحہ ۳۰۔

[2]۔ برنی صفحہ ۳۱ و ۳۲۔

عدل اور دیندار

بلبن کو اس بات کا اقرار تھا کہ ایرانی اکاسرہ کی یہ تقلید اور خود پرستی و عظمت نمائی کے یہ طریق اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف اور شرک میں داخل ہیں - لیکن وہ حجت پیش کرتا تھا کہ بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس قسم کے افعال سے اُس کا مدّعا محض حق کی حمایت اور عدل و امن کا قیام ہو، تو وہ مواخذے سے بری ہے[1] اور واقعات گواہی دیتے ہیں کہ بلبن اس بارے میں جو کچھ کہتا تھا، حقیقت میں ایسا ہی سمجھتا اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا - مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروّت کی اُسے پروا نہ ہوتی تھی چنانچہ منجملہ اور شواہد کے یہ قصہ لائق ذکر ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ کے معتمد علیہ صوبہ دار بداؤں نے غصّے کی حالت میں کسی فرّاش کو اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہوگیا - اتّفاق سے کچھ عرصے بعد خود بلبن بداؤں گیا - اُس وقت فراش کی بیوہ نے حضور میں نالش کی اور جب واقعے کی تصدیق ہوگئی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس عورت کے سامنے کھڑا کر کے مجرم صوبہ دار کے اتنے درّے مارے جائیں کہ وہ ہلاک ہو جائے !
اس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بداؤں کا برید یعنی ڈاک کا عہدہ دار بھی جس نے اس واقعے کی بادشاہ کو

[1] برنی - صفحہ ۴۱ -

ذاتی اوصاف

اطلاع نہ دی تھی، سولی پر لٹکا دیا گیا ہے[1]

بادشاہ کی سخت گیری پر مورّخ نے سخت اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیاسی مجرمین یعنی بغاوت اور شورش کرنے والوں کو وہ نہایت بے رحمی سے سزا دیتا تھا اور اس بارے میں مشروع وناشروع کا بھی چنداں لحاظ نہیں کرتا تھا[2] مگر اُس کو اعتراف ہے کہ اسی کے ساتھ محتاجوں کی امداد اور بے کسوں کی دستگیری، اور ویران علاقوں کو آباد کرنے میں اس کی رعایا پروری ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ضعیفوں اور بیوہ، یتیموں کا اُس سے زیادہ ہمدرد اور خبرگیراں سردار ہندوستان بھر میں کوئی نہ تھا۔ اپنے غریب اور زخمی یا بیمار سپاہیوں کے ساتھ اُس کی مہربانی مشہور تھی کہ سفر کے وقت دشوار گزار مقامات پر بادشاہی سواریاں اُن کے واسطے وقف کردی جاتی تھیں اور جب تک وہ اُس مقام سے بہ آرام نہ گزر جاتے بلبن آگے نہ بڑھتا تھا۔ جوانی میں اپنی فیاضی کی بدولت وہ ایک مُسرف اور عیش دوست امیر زادہ نظر آتا تھا، لیکن تاجِ شاہی سر پہ رکھتے ہی اُس نے تمام لغو مشاغل کو خیرباد کہی اور وہ اعتدال و تقویٰ اختیار کیا جو اس کے آقا سلطان شمس الدین کا امتیازی وصف سمجھا جاتا تھا۔

---

[1] برنی۔ صفحہ ۵۴۔ بعد کی تمام معتبر تاریخوں میں بھی یہ قصہ منقول ہے۔

[2] برنی۔ صفحہ ۴۷۔

ہندوستان میں اُس وقت بڑے بڑے نامور اسلامی علماء اور مشایخ جمع تھے۔ بلبن ان کی نہایت تعظیم و توقیر کرتا تھا اور ہر جمعے کو نماز کے بعد خود اُن کے مکان پر حاضر ہوتا اور اُن کے وعظ و نصائح کو کمال انکسار و ادب سے سُنتا تھا۔ بلکہ، مؤرخ کے الفاظ میں، "باچندان جلالت وحشمت و کوکبۂ سواری، اگر بشنیدی و بدیدی کہ در مسجد خلق جمع است و مذکرانِ (یعنی واعظانِ) صالح تذکیر (وعظ) می گویند، درساعت فرود آمدے، و درمیان خلق بنشستے..."[۱]

ملکی خدمات
(۱) دفاعی۔

اِن عجیب اوصافِ ذاتی کے ساتھ وہ نہایت بیدارمغز خادمِ ملک تھا اور ہندوستان پر اُس نے جو احسانات کئے ہیں، اُن میں سب سے پہلے ہم اُس کے دفاعی انتظامات کا ذکر کریں گے کیونکہ مغلوں کے سرحدی ممالک پر مسلط ہوجانے سے اُن دنوں اس ملک کے واسطے جو مستقل خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ایسا نہ غالباً کبھی پہلے ہوا تھا نہ اس کے بعد۔ اور یہی سبب تھا کہ دور اندیش بلبن نے دفاعِ ہند کی خاطر کشورکشائی اور ملک گیری کی ہوس کو دل سے بھلا دیا تھا اور اس کے اُمرا ہندوستان کی غیر مفتوحہ ریاستوں پر فوج کشی کا مشورہ دیتے تو وہ ہمیشہ یہ جواب دیتا تھا کہ حکومتِ دہلی کا پہلا فرض

[۱] برنی۔ صفحہ ۴۵ و ۴۶۔

اُن علاقوں کو محفوظ رکھنا ہے جو پہلے سے اُس کے قبضے
میں آچکے ہیں اور آج کل جب کہ مغلوں کے گروہ ہماری سرحد
پر منڈلاتے پھرتے ہیں، اگر ہم بیرونی فتوحات کے لئے
اپنی فوجی قوت منتشر کردیں گے تو یہ دفاعی فرض ادا نہ ہوگا۔[1]
یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ
ہندوستان کی قدرتی فصیل یعنی **کوہستان سلیمان** سے
اُن دنوں حکومتِ دہلی کوئی دفاعی فائدہ نہیں اٹھاسکتی تھی۔
سبب یہ کہ دریائے جہلم کو اُترتے ہی مغرب میں جو
پہاڑی علاقہ شروع ہوجاتا ہے وہ بہت کم آباد اور
ناقابلِ زراعت تھا اور سامانِ رسد کی قلت کی وجہ سے
وہاں کسی بڑی فوج کی چھاؤنی نہیں بن سکتی تھی۔ یہاں
کے نیم متمدن اور جنگجو قبایل بھی جو باعتبار قومیت "کھوکھر"
کہلاتے ہیں، ہمیشہ ہندوستان کی دشمنی پر تلے رہتے تھے
اور جب کسی حملہ آور نے دریائے سندھ کو عبور کیا،
یہ لوٹ کی لالچ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوگئے۔

آج کل جب کہ ریل نے رسد رسانی کی مشکلات کا ازالہ
کردیا ہے اور کوہ سفید کے مغرب میں ہمیں دوآبہ "سندھ ساگر"
سے بھی کم آبادی نظر آتی ہے، ہم اگر کوہستانِ سلیمان کو
اپنے ملک کا سب سے مستحکم دفاعی حصار تصور کریں تو

اُس عہد کی دفاعی مشکلات

---

[1] بلبن کی اس حکمت عملی اور اس کے متعلق مباحث و دلائل کے لئے دیکھو برنی صفحہ ۵۰ و ۵۱۔

بالکل حق بجانب ہوں گے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں معاملہ برعکس تھا اور افغانستان کے پہاڑوں میں اتنی کثیر جنگی آبادی پرورش پاتی تھی کہ مثلاً غزنی کو مرکزِ جنگ بناکر شمالی ہند کو فتح کرنے کی تیاریاں کرنا کچھ دشوار نہ تھا اور یہی وہ اہم قدرتی اسباب ہیں جن کی بدولت سلطنت دہلی کی ابتدائی تاریخ اور عہدِ مُغلیہ کی تاریخ میں ایک بڑا فرق پیدا ہوگیا۔ یعنی یہ کہ بابر و اکبر کے عہد سے پہلے، جب تک کہ ملکِ افغانستان کشورِ ہند کا بیرونی مورچہ نہ بنا، ہندوستان خاص کے رہنے والوں کو کبھی بیرونی حملوں کے خوف سے نجات نہ ملی۔

ایک اور وقت یہ تھی کہ سلطنتِ دہلی کی فوج میں ابھی تک غالباً صرف سپاہی پیشہ مسلمان بھرتی ہوتے تھے اور اُن کی کل تعداد ہندوستان میں اتنی زیادہ نہ تھی کہ بلا دِقّت مغل حملہ آوروں کو روک لے۔ خاص کر اس وجہ سے، کہ اِن حملہ کرنے والوں کا مقصود اکثر لُوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا اور وہ قزاقوں کی طرح گروہ در گروہ جدھر سے میدان خالی پاتے، ملک میں گھس آتے اور جب گھرنے کا اندیشہ ہوتا تو اُسی تیز پائی سے فرار ہوجاتے تھے۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ نہایت جری اور خونخوار لڑنے والے تھے۔ شجاعت میں غالباً صرف ایک ہی قوم اُن سے

بازی لے جاسکتی تھی ۔ یعنی ترک ، جنہوں نے اپنی قلّتِ تعداد اور پیہم ناکامیوں کے باوجود مغلوں کے دل پر اپنی شمشیر زنی کا سکہ بٹھا دیا تھا ، اور اسے ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ "فتنۂ مغل" کے زمانے میں یہاں بھی اسی قوم کے افراد حکومت کرتے تھے۔

لاہور کی از سرِ نو تعمیر۔

سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں ان خوفناک حملہ آوروں کو روکنے کی دشوار خدمت ملک شیر خاں سنقر کے سپرد ہوئی تھی جو بلبن کا عمزاد بھائی تھا اور اُس نے یہ خدمت جس مستعدی اور خوبی سے ادا کی اُسکی ہر مورّخ نے تعریف کی ہے[1] لیکن سچ یہ ہے کہ لاہور کے تاراج و مسمار ہونے کے بعد شمالی پنجاب کو مغلوں کے ناگہانی حملوں سے بچانا محال ہوگیا تھا ، اور چناب کے پار تمام علاقے کو پامال کردینے سے مغلوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ سلطنتِ دہلی اس حصے میں کوئی بڑا جنگی مرکز قائم کرنے نہ پائے۔ اس مقصد میں کھوکھروں کی غارت گر قوم بلا منّت ان کی حلیف ہوگئی اور جب تک بلبن نے ان غداروں کو سخت سزائیں نہ دیں ، لاہور کا علاقہ ویران و بے چراغ رہا اور سرحد کا سب سے بڑا دفاعی مرکز جنگ بہت دور جنوب میں ہٹکر

[1] طبقات ناصری صفحہ ۲۷۷ - برنی صفحہ ۶۵ وغیرہ -

دیپالپور میں قائم کرنا پڑا۔ اس واقعے نے بے شبہ دیپالپور کی رونق و منزلت بڑھادی لیکن لاہور کو ایسی خراب حالت میں چھوڑ دینے کے معنی یہ تھے کہ گویا سلطنتِ دہلی شمال مغربی پنجاب کی حفاظت کا ذمہ لینے سے ہچکچاتی ہے۔ چنانچہ گو اقطاعِ لاہور کا مقطع یا والی حکومتِ دہلی کی طرف سے نامزد ہوتا تھا لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اُسے بعض اوقات مغلوں کے ساتھ بطور خود معاملہ کرنا پڑتا تھا اور وہ ایک حد تک اُن کا ماتحت سمجھا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بلبن کو یہ بات گوارا نہ ہوسکتی تھی اور عجب نہیں کہ شیر خاں سے اُس کی ناراضی کا یہی سبب ہو کہ وہ (یعنی شیر خاں)، غالباً مغلوں کے شہنشاہ منگو خاں سے بھی سیاسی تعلقات رکھنے چاہتا تھا[1]۔

الغرض، ملک کے اندرونی انتظامات سے فرصت ہوتے ہی بلبن خود لاہور گیا اور اُس نے ازسرِنو شہر اور قلعے کی تعمیر کی (۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء) نیز سلطنت کیطرف سے بہت سے معمار خاص اس کام پر مقرر کردئے کہ نواحِ لاہور کے دیہات میں رعایا کے مکانات بنائیں۔

۱۔ منگو بن تولی بن چنگیز، ۶۴۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار میں شیر خاں کے حاضر ہونے کا ذکر اجمالی طور پر ہم عصر تاریخ میں موجود ہے۔ (طبقات ناصری۔ صفحہ ۲۷۷)۔

پھر غالباً یہاں کے قدیم باشندوں کو جو متفرق اور نہایت شکستہ حال ہو گئے تھے، لا لا کے بسایا اور ان اضلاع میں نئے سرے سے زندگی پیدا کی کیونکہ اتنے عرصے (یعنی چالیس برس) تک ویران رہنے کے باعث یہاں کے دیہات میں رہنے کے گھر تو درکنار پانی پینے کے لئے کنوئیں تک باقی نہیں رہے تھے![1]

شہزادہ محمد

اقطاع لاہور کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ بلبن نے ممالک سندھ و ملتان پر خاص توجّہ کی جو حقیقت میں ملک پنجاب کے بازو تھے۔ ان اقطاع پر اُس نے سلطنت کے بہترین اشخاص کو حاکم مقرّر کیا اور اُن کا صدر صوبہ دار اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو بنایا جس کی حکومت میں ساحل بحر سے دریائے جہلم تک تمام علاقہ داخل تھا اور مستقر ملتان تھا۔ اس شہزادے کی علم دوستی اور اعلیٰ اخلاق کی مدح و ثنا میں مورّخین اور ہم عصر شعرا نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں لیکن اُس کی انتظامی اور جنگی قابلیت کی شاید بہترین سند یہ ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر و نکتہ چین بادشاہ دل سے اُن کا معترف تھا اور اسی لئے اُس نے شاہزادۂ موصوف کو "قآن ملک" کا خطاب دیکر ان اقطاع پر بھیجا تھا جہاں مخلص و خیر خواہ ہونے کے

[1] برنی۔ صفحہ ۶۱۔

علاوہ نہایت لایق اور مستعد حاکم کی ضرورت تھی ؎
اُس نے بارہ تیرہ سال تک یہ دشوار خدمت جس کامیابی سے انجام دی وہی اِس بات کا ثبوت ہے کہ بلبن کا انتخاب و اعتماد بیجا نہ تھا۔ اس تمام مدت میں مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو شمالی پنجاب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ملتان و سندھ پنجاب سے بھی زیادہ محفوظ ہو گئے۔ یہ شہزادہ علمی مشاغل میں نہایت انہماک رکھنے کے باوجود، صعوبات جنگ برداشت کرنے سے کبھی دل نہ چُراتا تھا اور جب کبھی مغل حملہ آوروں کے سرحدوں کی طرف آنے کی خبر ملتی، اسی وقت وہ مجلس علما کو چھوڑ کر لباس سپاہیانہ پہن لیتا اور خود مقام مخدوش پر پہنچ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مدافعتِ ہندوستان کا یہی فرض ادا کرنے میں اُس کی جان گئی اور وہ مغلوں کے تیسرے بڑے حملے میں شہید ہوا (۶۸۴ھ)۔ بوڑھے باپ کو ایسے لایق اور جوان بیٹے کی موت کا جو کچھ صدمہ ہوا ہوگا اِس کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے لیکن یہاں خاص طور پر جتانے کے قابل یہ بات ہے کہ گو اس مرتبہ مغل بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے پچھلے نقصانات کا انتقام لینے کے لئے ہندوستان آئے تھے اور ان کا سردار تیمور (یا تمر) خاں بھی بڑا بہادر و آزمودہ کار سپہ سالار مانا جاتا تھا لیکن عہد بلبن کے

دفاعی انتظامات کی بدولت اوّل تو وہ کسی بڑے شہر پر حملہ نہ کر سکے دوسرے کھلے میدان کی دونوں لڑائیوں میں اہلِ ہند نے انہیں شکست دی اور یہ محض اتفاق تھا کہ فتحمند شہزادہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ اپنے لشکر سے (جو مفرورین کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا تھا) الگ رہ گیا۔ مغلوں کا ایک دستہ کمیں میں چھپا بیٹھا تھا شہزادۂ محمد کی قلیل جماعت دیکھکر اُس نے حملہ کیا اور گو میدان سے بچ کر نکل جانا دشوار نہ تھا لیکن محمدؔ نے شجاعت کے جوش میں احتیاط کو بُزدلی جانا اور بے شبہ وہ اپنی بہادری سے یہ لڑائی بھی جیت جاتا کہ ناگہاں ایک تیر اُس کے ایسا کاری لگا کہ اُسی وقت روح پرواز کرگئی۔ ساتھیوں میں سے کچھ لوگ بھاگے اور باقی مارے گئے یا مغلوں نے انہیں اسیر کرلیا۔ حضرت امیر خسروؔ رحؔ بھی جو اس شہزادے کے محبوب مصاحبوں میں تھے غالباً اسی مقام پر قید ہوئے اور دو برس تک بلخ میں قید رہنے کے بعد بہ مشکل چھوٹ کر ہندوستان آئے ؏۱

؏۱ اس لڑائی کے واقعات کسی جگہ عمدہ ترتیب و وضاحت کے ساتھ نہیں ملتے۔ ضیاء الدّین برنی نے انہیں بہت مختصر طور پر لکھا ہے (صفحہ ۱۱۰) طبقات اکبری اور منتخب التواریخ نے غالباً یہ حالات حضرت امیر رحؔ کی کسی کتاب سے نقل کئے ہیں۔ جواب نایاب ہے مگر فرشتہ (صفحہ ۸۲) کا

اس واقعے کی یادگار۔

اس اندوہناک سانحے نے ہندوستان میں جا بجا کہرام ڈال دیا اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس واقعے کو دیکھنے والے اور بیان کرنے والے میر حسن اور امیر خسرو رحہ جیسے سحر بیان لوگ تھے جن کے نظم و نثر میں مرثئے پڑھکر آج بھی شہزادہ محمد کی موت کا رنج تازہ ہوجاتا ہے۔ خاص کر حضرت امیر رحہ کا ایک ترکیب بند اس قدر درد انگیز ہے کہ سعدی شیرازی رحہ کے مرثیۂ بغداد کے بعد اس عہد کی فارسی نظم میں، اسکی نظیر ملنی دشوار ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے اسے لکھتے وقت بھی، سعدی کا مذکورۂ بالا مرثیہ شاعر کے پیش نظر تھا[1]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴۔ ماخذ کوئی اور تاریخ ہے۔ نیز دیکھو الفنسٹن صفحہ ۳۷۰ (بحوالہ ہملٹن وغیرہ)۔

[1] صاحب منتخب التواریخ نے اسے امیر خسرو رحہ کے دیوان غرۃ الکمال سے تمام وکمال نقل کیا ہے۔ عام طرز بیان دکھانے اور مرثیۂ سعدی سے اس کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے چند شعر اس جگہ لکھنے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

بند اول:۔ "واقع است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت درجہاں آمد پدید"

بند نہم:۔ مہر و مہ بر روئے آن فرخ لقا بگریستند
روز و شب بر سال آن اندک بقا بگریستند

شہزادہ محمد کی جوانمرگی اور اہل ملتان کے رنج و غم کا ذکر کرتے ہیں۔

[11] خلقِ ملتاں، مرد و زن موبہ کناں و موکناں۔
کو بہ کو و سو بہ سو و جا بہ جا بگریستند۔
از خروش گریہ و بانگِ دُہل شب کس نہ خفت
بس کہ در ہر خانۂ اہلِ عزا بگریستند۔"

(۲) اندرونی امن و انتظام۔ ملکی خدمات

محمد کی ہر دلعزیزی اور جوان مرگی کے علاوہ، اس واقعے کے اتنے رنج کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ بلبن کے انتظام و اقبال کی بدولت بہت دن سے اہل ہند ایسے امن و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ مغلوں کے ساتھ یہ معمولی لڑائی بھی انہیں ایک جنگ عظیم نظر آئی جس نے کچھ عرصے کے لئے ان کے راحت و سکون میں خلل ڈال دیا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوؤں کے آخری زمانے میں طوائف الملوکی نے ملک میں سخت بدنظمی پیدا کر دی تھی اور قومیں کی قومیں رہزنی اور قزاقی کو اپنی جائز وجہ معاش سمجھنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی فتح نے جب اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا تو اسی کے ساتھ رہزنی میں بھی کمی ہوگئی بایں ہمہ اس بلا کا ملک سے استیصال نہیں ہوا۔ گھنے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں وحشی قبائل کے بہت سے گروہ آباد تھے جن کا پیشہ رہزنی تھا۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو آج بھی، جب کہ انتظامِ حکومت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں، ہندوستان سے رہزنی کا کلی استیصال نہیں ہوا ہے اور کم آباد حصوں میں بعض اوقات بڑے بڑے ڈاکوں کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ پس اُن دنوں جبکہ شمالی ہند کی آبادی کم تھی اور بہت سے علاقوں میں

بڑے بڑے جنگل اور خوفناک بن ھوگئے تھے، یہاں کے موروثی قزاقوں کا سدِ باب کرنا کچھ آسان بات نہ تھی؛ کم سے کم شمالی ہند پر بلبن کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ سب سے پہلے اسی نے وسیع پیمانے پر اس کام کا بیڑا اُٹھایا، اور دہلی کے شمال سے ملک اودھ تک، بڑے بڑے جنگل کٹوا کر ہزارہا قزاقوں کو تہ تیغ کیا اور جا بہ جا مستحکم قلعے اور تھانے بنا کے چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں قائم کردیں۔

پایۂ تخت دہلی کے قریب پہاڑی جنگلوں کے علاوہ، اِن قزاقوں کے سب سے بڑے مرکز پٹیالی، کاٹھیر اور کنپل میں تھے۔ ان میں پہلے دونوں مقام بداؤں کے قریب اور کنپل موجودہ فرخ آباد سے چند میل مغرب میں واقع ہے؛ بادشاہ نے ایک ایک کر کے ان تمام علاقوں کو صاف کیا اور بعض جگہ اس قدر بے رحمی سے کام لیا کہ عورتوں اور بچوں کے سوا کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا اور آخرکار چند سال کی پیہم کوشش کے بعد ہندوستان خاص کو رہزنوں سے بالکل پاک کردیا۔

ضیاء الدین برنی شہادت دیتا ہے کہ "ڈاکوؤں کا شر، رہزنی اور راستہ لوٹنے والوں کی بلا ہندوستان کے راستوں سے دُور ہوگئی اور ہمارے زمانے تک کہ (بلبنی) قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گزر چکی ہیں، ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیتہً موقوف

ہوگئی ہے"۔ ہ۱

رہزنی کا یہ استیصال، جس کے بغیر کوئی حکومت اپنے اندرونی انتظامات کو قابلِ تعریف نہیں سمجھ سکتی، بلبن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اُس کے تدبّر اور فرض شناسی کی غالباً سب سے اچھی دلیل یہ ہے کہ وہ ممالک ہندوستان کے سیاسی استحکام کا نہایت سرگرم حامی اور محافظ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شمالی ہند میں ایک مرکزی سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ اُسے ایبک و التتمش سے ترکے میں ملا تھا۔ لیکن جہاں تک تحریری شہادت کا تعلق ہے بلبن پہلا "شہنشاہِ دہلی" ہے جس نے مرکزیت یا شہنشاہی کے اصول کو، جس حد تک کہ وہ اُس زمانے میں سمجھا جاتا تھا، بخوبی سمجھا اور جب موقع ملا، وضاحت سے سمجھایا۔ اور اس کا ثبوت وہ نصیحتیں ہیں جو بنگالے کی بغاوت فرو کرنے کے بعد، وہاں اپنے چھوٹے بیٹے کو صوبہ دار بناتے وقت اُس نے کی تھیں ؛

ملکی خدمات (۲) دہلی کی مرکزیت کا استحکام۔

اِس بغاوت کے متعلق فرشتہ کی یہ روایت قرینِ قیاس نظر آتی ہے کہ ۶۷۸ھ میں بادشاہ اس قدر علیل ہوا کہ مہینہ بھر تک محل سے باہر نہ آسکا اور دُور کے شہروں میں

بنگالے کی بغاوت۔

ہ۱ پہلی رہزنی اور بعد کے بلبنی انتظامات کو اِس مورخ نے کافی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے (دیکھو صفحات ۵۰ تا ۶۰) نیز ملاحظہ ہو گزیٹیر جلد ۱۴ صفحہ ۸-۳۴۳ (حالات کنپل)

اُس کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی ہے[1] لکھنوتی میں اُن دنوں بلبن کا ایک غلام ملک **طُغرل** صوبہ دار تھا اور اُس کی انتظامی قابلیت اور شجاعت، و سخاوت مسلّمہ تھی ۔ اُسی زمانے میں ریاست **جاج نگر** کے ساتھ اُس کی جنگ ہوی جس میں نمایاں فتوحات اور بے شمار مال غنیمت اُسے حاصل ہوا تھا؛ یہاں یہ تصریح کردینی چاہیئے کہ جاج نگر کی ریاست میں اُس وقت مہاندی سے گوداوری تک کا وہ علاقہ شامل تھا جو بعد میں جنوبی گونڈوانہ کہلایا اور اب صوبجات متوسط کا مشرقی حصّہ ہے ۔ اس کے اور مسلمانوں کے مشرقی صوبوں کے درمیان "گڈہہ کٹنکہ" نامی علاقہ حائل تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں ریاست جاج نگر کی حدیں مہاندی کے پار شمال تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس قرب کی وجہ سے لکھنوتی کے اسلامی صوبہ داروں کی بارہا جاج نگر سے لڑائی ہوتی رہتی تھی[2]

[1] فرشتہ ۔ صفحہ ۷۹ ۔

[2] الفنسٹن اور بعد کے اکثر انگریز تاریخ نویسوں نے جاج نگر کے متعلق سخت مغالطہ کھایا ہے اور وہ اسے لکھنوتی کے مشرق میں موجودہ اسام کے قریب کا علاقہ سمجھتے اور طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں ۔ حالانکہ فارسی تواریخ کو غور سے پڑھکر جاج نگر کا ٹھیک ٹھیک علاقہ معلوم کرلینا کچھ دشوار نہیں ہے اور حال میں ڈاکٹر بلوخ مین اور میجر راورٹی نے نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ اس قدیم ریاست کی حدود معین کی ہیں ۔ (راورٹی صفحہ ۵۸۰ وغیرہ)

غرض کچھ جنگ حاجی نگر میں فتح یابی کے غرور اور کچھ لکھنوتی کے بغاوت پسند مصاحبوں کے اغوا سے طغرل بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ بظاہر اُسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بوڑھے بادشاہ کو رہزنوں کے استیصال اور مغلوں کے حملے روکنے کے لئے پنجاب کے دفاعی انتظامات میں اس درجہ انہماک ہے کہ وہ بنگالے پر فوج کشی نہ کرسکیگا یا نہ کرسکے گا۔ کیونکہ بلبن کے ان اقوال کا (جنہیں ہم اجمالاً نقل کرچکے ہیں)، تمام ہندوستان میں چرچا تھا کہ جب تک مغلوں کا غزنی پر تسلط قائم اور اُن میں سرحد ہندوستان پر یورش کرنے کی قوت باقی ہے، حکومت دہلی کو اپنی پوری جنگی قوت اُن کے دفاع کے لئے مجتمع رکھنی چاہیئے اور خود ہندوستان کے ممالک یا ریاستوں کی فتح کا خیال دل سے بھلا دینا چاہیئے۔ لیکن اگر طغرل غور کرتا تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی کہ بلبن کی مذکورۂ بالا حکمت عملی کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اپنے مقبوضات ہند کو زیادہ محفوظ اور منتظم حالت میں رکھنے کا خواہاں تھا اور اندرونی استحکام اور ملکی صیانت پر سے اُس نے شوق کشور کشائی اور ہوس نام آوری کو قربان

۱؎ کم سے کم برنی کے وقت میں اہل بنگالہ اسی قسم کی شہرت رکھتے تھے اور دہلی کے لوگوں نے لکھنوتی کو "بلغاک پور" یعنی "بغاوت پور" کا لقب دے رکھا تھا۔ (برنی صفحہ ۸۲)۔

کردیا تھا۔ پس جب اُسے بنگالے کے سلطنت دہلی سے انقطاعِ تعلّق کرنے کی اطلاع ملی تو رنج و غضب کی حالت میں "خواب و خور براُو تلخ گشت" اور اس کے غصے کو اس واقعے نے اور بڑھا دیا کہ وہ طغرل، جواب مغیث الدین کے لقب سے اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کررہا تھا، خود بلبن کا دست پرورده اور معتمد علیہ غلام تھا!

بلبن کی فوج کشی

ادھر، یکے بعد دیگرے، دو لشکروں کو جو بغاوت فرو کرنے کی غرض سے بھیجے گئے، طغرل نے شکست دی۔ ان کامیابیوں میں اُس کی بہادری اور کثرت فوج کے علاوہ رشوت ستانی کو بھی دخل تھا اور بادشاہی لشکر کے بہت سے سردار روپے کے لالچ میں اُس سے مل جاتے تھے۔ بہرحال، ان خبروں نے بادشاہ کی آتش غضب کو، گویا خجالت کا تیل چھڑک کر، اور بھی بھڑکا دیا اور ستّر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اب کے اُس نے فوج کی سپہ سالاری خود اپنے ہاتھ میں لی اور نہ درازی سفر کی پروا کی نہ صعوبات راہ کی بلکہ دہلی سے جو چلا تو فیض آباد تک منزل بہ منزل برابر کوچ کرتا چلا آیا اور پھر یہاں چند روز ٹھیر کر جو روانہ ہوا، تو سخت بارش کو بھی خاطر میں نہ لایا اور صرف مجبوری سے کہیں کہیں ٹھیرتا ہوا، بہت جلد لکھنوتی پہنچ گیا۔

راستے کے حکّام کو تاکیدی فرمان پہنچ چکے تھے اور

دریائے گنگا میں بار برداری کے لئے بہت سی کشتیاں تیار تھیں۔ لہذا اس لشکر کو، جس میں سپاہی اور بہیر و بنگاہ کے لوگ ملاکر کل دو لاکھ آدمی شمار ہوتے تھے، رسد رسانی کی زحمت اٹھانی نہ پڑی۔ نیز "طغرل" کے فرار ہوجانے کی وجہ سے کوئی مقابلہ پیش نہ آیا اور سلطان کا بلا وقت بلادِ بنگالہ پر قبضہ ہوگیا؛ لیکن وہ عہد کرچکا تھا کہ جب تک زندگی ہے، اور طغرل ہاتھ نہیں آتا، اس وقت تک اس کا تعاقب نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ لکھنوتی میں نئے حکام مقرر کرنے کے بعد اس نے بلا تاخیر جاج نگر کی جانب، جہاں طغرل بھاگ کر چھپا تھا، کوچ کیا اور اس ملک میں داخل ہوتے ہی ہر طرف سراغ رساں دستے پھیلا دیئے کہ جاج نگر کے صحرا و کوہ کا چپہ چپہ چھان ڈالیں۔ آخر کئی مہینے کی تگ و دو اور پیہم جستجو کے بعد فوجِ ہراول کے ایک دستے کو مفرور باغی کا سراغ مل گیا اور چونکہ بادشاہی لشکر کے وہاں آنے تک، اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا، لہذا یہی چھوٹا سا گروہ جان پر کھیل کر طغرل کی لشکرگاہ میں گھس گیا اور "طغرل، طغرل" پکارتا ہوا اس کے شاہی خیمہ تک آپہنچا۔ یہ ناگہانی شور و غوغا سن کر طغرل کے اوسان جاتے رہے اور وہ کمال بے حواسی کے عالم میں گھوڑے پر سوار ہوکر بھاگ رہا تھا

کہ تعاقب کرنے والوں میں سے ایک سوار کے تیر نے اُسے لشکرگاہ سے کچھ دور فاصلے پر مار کے گرا دیا اور دوسرے نے پھرتی سے کود کر سر کاٹ لیا اور دامن میں چھپاکر وہیں ایک ندی کے کنارے منہ ہاتھ دھونے بیٹھ گیا کہ طغرل کے ساتھیوں کو اس واقعے کی اطلاع نہو! کیونکہ یہ چند آدمی اُس کے پورے لشکر کا تھوڑی دیر بھی مقابلہ نہ کرسکتے تھے۔

سیاست بلبنی

اِدھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شاہی ہراول کی فوج اطلاع پاکر، وہاں آپہنچی اور طغرل کے ساتھیوں میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو فرار ہوسکے یا لڑائی میں کام آئے ورنہ سب کے سب گرفتار کرلئے گئے اور بلبن انہیں لئے ہوئے واپس لکھنوتی آیا۔ یہاں پہنچ کر دہلی کے وہ سپاہی یا سردار جو پچھلی لڑائیوں میں طغرل کے ساتھ مل گئے تھے علیحدہ کردئے گئے کہ انہیں دہلی پہنچ کر سزا دی جائیگی۔ لیکن اہل بنگال میں سے جس شخص نے طغرل کے اعلانِ خود مختاری کے بعد، خفیف سی رفاقت بھی ظاہر کی تھی، انہیں بادشاہ نے چن چن کے گرفتار کیا اور سرِعام سولی پر لٹکوا دیا! مؤرخ برنی جس کا دادا اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا، بیان کرتا ہے کہ لکھنوتی کے بڑے بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کردی گئی تھیں اور کئی دن تک روزانہ صدہا آدمی اُن پہ

چڑھا دیئے جاتے تھے! لیکن ہمیں جو بات خاص طور پر یہاں جتانی مقصود تھی، وہ یہ ہے کہ اس سخت سیاست و تادیب کے دوران میں بادشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے **بغراخاں** (محمود) سے، جسے آیندہ لکھنوتی کا صوبہ دار بنانا منظور تھا، دریافت کیا کہ اے محمود تونے بھی میری سزا دیکھی؟ جب اُس نے عرض کیا کہ "دیکھی" تو بادشاہ نے فرمایا "پس یاد رکھ کہ ہند و سندھ، گجرات و مالوہ یا لکھنوتی اور سنارگاوں کا کوئی حاکم جب کبھی، **بادشاہ دہلی** سے بغاوت کرے گا، تو اُس کی اور اُس کے عزیز و اقربا اور اعوان و انصار کی یہی سزا ہوگی جو آج طغرل اور اس کے رفقا کی ہوئی ہے!

پھر دہلی روانہ ہوتے وقت بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور کہا کہ اس بات کو نہ بھولنا، کہ بنگالہ میں دوبارہ تسلط قایم کرنے میں مجھے اس قدر جلادی اور فرعونی کرنی پڑی ہے[1]۔ آخر میں چند ہدایتیں، بطور دستورالعمل تحریر کرا کے بیٹے کے حوالے کیں جن میں سب سے پہلی ہدایت یہی تھی کہ:۔

"پہلا پند محمود کے باب میں یہ ہے کہ جب اقلیم لکھنوتی اُسے ملے تو وہ ہمیشہ بادشاہ دہلی کا فرماں بردار رہے۔

[1] برنی۔ صفحہ ۹۲۔

خواہ بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ آدمی ہو یا اُس کا قریبی رشتہ دار ... کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی بعید فاصلے پر سہی، مضافاتِ دہلی میں داخل ہے!^ا

۳۔ اسلامی علوم اور تمدن، ہند میں۔

بلبن کی وفات

بنگالے کے انتظام سے فارغ ہوکر سلطان ۶۸۱ھ میں دہلی پہنچ گیا تھا۔ اور شہزادۂ محمدؐ کی شہادت، جسے اپنی ترتیبِ مضامین کے لحاظ سے ہم نے پہلے بیان کیا، اس مراجعت کے تین سال بعد کا واقعہ ہے جس نے ضعیف العمر سلطان کو غم سے نڈھال کر دیا۔ جس قدر اس نے یہ غم دل میں چھپایا اسی قدر وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۶۸۵ھ (مطابق ۱۲۸۶ء) کے اواخر میں وفات پائی۔

اسلام کی اشاعت

ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے پورے سو برس نہیں گزرے لیکن اب شمالی ہند کا کوئی بڑا قصبہ یا شہر ایسا نہ ہوگا جہاں اسی عرصے میں ان کی تھوڑی بہت آبادی بس جانے کے ساتھ، کم سے کم ایک مسجد اور مدرسہ نہ بن گیا ہو اور ہر چند نو وارد مسلمانوں اور قدامت پسند ہندیوں کے عقائد و تمدن میں زمین آسمان کا فرق تھا، نیز غیر ملکی فاتحین سے طبعی نفرت، باہمی

ا۔ برنی۔ صفحہ ۹۳ و ۹۵ وغیرہ۔

میل جول میں مانع تھی بایں ہمہ یہی زمانہ ہے جس میں اسلامی علوم کی اشاعت نے ہندؤوں کے معتقدات میں بہت بڑا انقلاب پیدا کیا اور اُن کے صدہا آدمی بُت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہونے لگے ؛

انگریز مصنفوں نے اشاعتِ اسلام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں اور یہ الزام لگایا ہے کہ مسلمان فاتحین ہندوؤں کو جبراً مسلمان کرلیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کا جبر نہ صرف اسلامی تعلیم کے سرتا سر خلاف ہے ، بلکہ مذہب کے معاملے میں کبھی اور کہیں بھی کامیاب نہیں ہوا۔ دوسرے ہندوستان کے اس تاریخی مسئلہ کے متعلق اگر ہم انگریزی کی سب سے مستند کتاب امپی رئیل گزے ٹیئر کی ورق گردانی کریں ، تو معلوم ہوجائے گا کہ اسے مرتّب کرنے والے بھی (غالباً اپنی دلی خواہش کے باوجود) وہ قرائن و شواہد نہ پاسکے جن سے مذکورۂ بالا الزام کو کوئی خاص تقویت پہنچتی [1]۔ اگرچہ انہوں نے بھی اشاعت اسلام کا وہ صحیح سبب سمجھنے پر کافی توجہ نہیں کی جس پر اہل تحقیق کی

[1] امپی رئیل گزے ٹیئر کے مرتبین کی تحقیقات کا عام نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاذ و نادر صورتوں کے سوائے مسلمان فاتحین "غالباً تبدیل مذہب کے لئے بالعموم جبر نہیں کرتے تھے" ! (دیکھو ، جلد اوّل ، صفحہ ۴۴۴ ، جلد دوم صفحہ ۳۰۵ وغیرہ وغیرہ - نیز پنجاب میں ، جہاں سب سے زیادہ

سب سے پہلے نظر پڑنی چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ بُت پرستوں کی آبادی میں ایسے لوگوں کا آکر بس جانا، جو "اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھروں" کی کوئی وقعت نہ کرتے اور اپنے قول و فعل سے توحید پرستی کی فضیلت ثابت کرتے تھے، ہندوؤں پر بہت بڑا اخلاقی اثر ڈالتا اور انہیں "مورتی پوجا" سے کم از کم بدگمان کردیتا تھا؛

اسلامی تعلیم کے اثرات۔ بایں ہمہ ہندوستان خاص کے علاقے میں، جہاں ہندومت یا برہمنی مذہب اچھی طرح دلوں پر قابض تھا، اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، اور یہی ایک واقعہ جبراً اسلام پھیلانے کے غلط الزام کی قطعی تکذیب کرسکتا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں خاص طور پر یہ بات جتانی منظور ہے کہ جن راسخ العقیدہ ہندوؤں نے اسلام کو قبول نہیں کیا اُن پر بھی اُس کی "توحید" اور "مساواتِ انسانی" کی تعلیم اثر کئے بغیر نہیں رہی اور آیندہ شمالی ہند میں جسقدر مصلحین یا ہندو مت کے نئے فرقے پیدا ہوئے۔ جیسے "رامانندی" "کبیر پنتھی" یا "نانک پنتھی" اُن سب نے ویش و کھتری، شودر و برہمن کی تفریق دُور کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک "توحید" کی تعلیم کو بھی قبول کرلیا؛

صوفیۂ کرام یہ اسلامی عقائد، ہندو آبادی میں زیادہ تر مسلمان فقرا یا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۶۔ عرصے تک مسلمانوں کی بادشاہی رہی، اشاعت اسلام کے متعلق دیکھو، جلد بستم صفحہ ۲۸۹)۔ نیز ملاحظہ ہو الفنسٹن کی رائے صفحہ ۲۷۶۔

اولیاء اللہ کے ذریعے پھیلتے تھے جن کی سکون بخش صحبت میں کافر ہو یا مسلمان، ہر شخص کو خدا یاد آجاتا تھا۔ علمائے ظاہر یا مولویوں کو اُس زمانے میں نہ اتنی فرصت تھی نہ توجہ کہ وہ غیر مسلم ہندیوں میں اسلام کی ترویج درکنار، مبادلۂ خیالات کا بھی کوئی ذریعہ نکالتے۔ لہٰذا یہ کام جس حد تک ہوا، مسلمان صوفیوں کے ذریعے ہوا جو شمالی ہند کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ غالباً اسلامی تصوّف کو ہندوستان میں جو فروغ اِس زمانے میں ہوا، کبھی بعد میں یا اور کسی اسلامی ملک میں نہیں ہُوا۔ ملتان و سندھ سے لیکر، جہاں شیخ بہاء الدین زکریا رح کی اولاد اور خلفاء مصروفِ ارشاد تھے، لکھنوتی تک صدہا خانقاہیں بنی ہوئی تھیں جن میں ہر طریقے کے مشایخ تزکیۂ نفس اور عشق الٰہی کی تعلیم دیتے تھے۔ خاص پایۂ تخت دہلی میں اُن دنوں سلطان نظام الدین رح کی بابرکت مجلس مرجع انام تھی اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خاندانِ چشتیہ میں آپ پہلے بزرگ ہیں جو بداؤں یعنی ہندوستان خاص کے علاقے میں پیدا ہوئے اور اس لئے خالص ہندوستانی تھے۔ ان بزرگوں کے حالات میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔[1]

[1] ان کتابوں میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح کی کتاب "اخبار الاخیار" زیادہ مقبول و مشہور ہے۔ اس کے علاوہ فارسی اور (ترجمہ ہوکر) اردو میں بہت سی کتابیں صوفیائے کرام کے حالات میں چھپ چکی ہیں۔ ہندوستان کی تمام

مگر انہیں اس زمانے کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان بہت کم مطالعہ کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے اُن میں صوفیہ کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ طریقت یا تصوف کی تعلیم اسلامی شریعت سے کوئی جداگانہ چیز تھی حالانکہ جس قدر بڑے بڑے صوفی اور بانیانِ سلسلۂ طریقت گزرے ہیں، بلا استثنیٰ وہ سب کے سب نہایت راسخ العقیدہ اور سخت پابندِ شرع مسلمان تھے اور اُن میں اور علمائے ظاہر میں نمایاں فرق ہی یہ تھا کہ وہ تا امکان دُنیا کے مخمصات سے کنارہ کش ہوکر اپنا زیادہ وقت اُنہی عبادات و ریاضات میں صرف کرتے تھے جن کی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی یا ہدایت فرمائی ہے! پھر یہ کہ منصبِ ارشاد کے اہل صرف وہی لوگ مانے جاتے تھے جنہوں نے تفسیرِ قرآن اور حدیث و فقہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸ - بڑی بڑی تاریخوں میں بھی مشہور حضرات صوفیہ کا تذکرہ ملتا ہے اور تاریخ فرشتہ میں خاص اس موضوع پر ایک علیحدہ باب میں نامی مشائخین ہندوستان کے حالات جمع کئے ہیں ؛

[1] یہاں یہ روایت خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہندوستان میں تشریف لائے اور خواجہ فریدالدین (گنج شکر) رح سے پہلی مرتبہ ملتان میں ملاقات ہوی تو خواجہ فریدالدین کی جوانی اور طالبِ علمی کا زمانہ تھا۔ لیکن چندہی روز کی صحبت نے اُن کے دل میں شوق کی وہ آگ بھڑکا دی کہ اُسی وقت خواجہ قطب الدین رح کے ہم رکاب دہلی آنے پر آمادہ ہوگئے

اور گو وہ کتابی تعلیم نہیں دیتے تھے، لیکن اُن کی روحانی تربیت اور پیری کا مقصود یہی ہوتا تھا کہ اسلامی علم کے شعائر و احکام کی وہ خوبیاں مریدین کو سمجھائیں جو خلوص تزکیۂ نفس، اور عمل و تجربے کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتیں۔ علمائے ظاہر سے مستند یعنی صاحبِ ارشاد صوفیہ کے اختلاف اگر کچھ تھے بھی تو وہ محض فروعی مسائل کے متعلق تھے

علوم ظاہری اور فنون۔

ان خانقاہ نشینوں کی خدمت و رہنمائی کے علاوہ مسلمان اربابِ حکومت علوم ظاہری کی تعلیم کا نہایت فیاضی سے انتظام کرتے تھے اور ہر طالبِ علم بغیر کسی خرچ کا بار اُٹھائے، جہاں تک اُس کا شوق مساعدت کرے، تعلیم حاصل کرسکتا تھا۔ درس گاہ کا کام بالعموم مسجدوں سے لیا جاتا تھا اور بڑے بڑے مقامات پر مساجد سے متصل پردیسی طلبہ کے رہنے کے مکانات ہوتے تھے۔ ان عمارات کے قیام اور مدرسین و طلبہ کے ضروری مصارف بادشاہ یا شہر کے رؤسا کے ذمے ہوتے اور اکثر بڑی بڑی جاگیریں اسی غرض سے وقف کردی جاتی تھیں کہ اِنکی آمدنی مذکورۂ بالا مصارف کی کفیل ہو۔ تعلیم کی ایک اور صورت یہ تھی کہ ذی ثروت اُمرا اپنی اولاد کے واسطے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۹۔ مگر خواجہ صاحب موصوف نے انہیں روک دیا اور فرمایا کہ ابھی تمہیں کچھ عرصے تک علوم ظاہری کی تحصیل میں مشغول رہنا چاہئے کیونکہ کہتے ہیں "زاہد بے علم مسخرۂ شیطان است"۔ (تاریخ فرشتہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۰۳)

متعلمین کو گھر پر ملازم رکھ لیتے اور اُن کے لڑکوں کے ساتھ خاندان یا محلے کے اور لڑکے بھی شریک درس ہو جاتے تھے؛ لیکن یہاں اس اہم فرق کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس زمانے میں تعلیم کی غرض و غایت یہ تھی کہ آدمی عمدہ اخلاق و عادات سیکھے اور چونکہ مسلمانوں کے نزدیک اِن کا سب سے مکمل نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم ہی کی سیرت ہوسکتی ہے لہذا نصاب تعلیم میں زیادہ تر کتب دینیہ شامل تھیں اور اس قسم کے علوم و فنون، جن سے معاش حاصل کرنا مقصود ہو، پیشہ ور لوگ اپنی اولاد یا شاگردوں کو بطور خود سکھاتے تھے؛ اس کلیئے سے فنون سپہ گری ایک حد تک مستثنیٰ ہیں۔ مسلمان فاتحین کا عام پیشہ یہی سپہ گری تھی اور اِس لئے ان کی فوجوں یا چھاؤنیوں میں ہمیشہ ایک بڑی تعداد اس قسم کے فن سیکھنے اور سکھانے میں مصروف رہتی تھی؛

سپہ گری اور سپہ سالاری کے فن میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جو دستگاہ حاصل کی شاید اس کا بہترین ثبوت تو یہ ہے کہ قبائل مغل تک اُن کا لوہا ماننے لگے تھے[1]؛

[1] اس بارے میں ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحات ۱۳۱، وغیرہ۔ جن میں مغل سفیروں کے دہلی آنے اور مرعوب ہونے کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے؛ نیز دیکھو برنی۔ صفحہ ۵۵ وغیرہ؛

لیکن اسلامی علوم کی مہارت میں بھی یہاں کے بس جانے والے دوسرے ملکوں سے کچھ بہت پیچھے نہ تھے۔ مختلف کتابوں میں مؤرخین، شعرا اور ادیبوں کے علاوہ بہت سے ہندی علما کا نام ملتا ہے جنہوں نے تفسیر و فقہ میں بلند پایہ کتابیں تصنیف کی تھیں اور گو اس موضوع پر یہاں تفصیل سے لکھنے کی گنجایش نہیں، تاہم امام رضی الدین حسن بن محمد صغانی رح کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کے علم و فضل کو علمائے حجاز و عراق تک نے تسلیم کیا۔ امام صغانی

وہ سلطان نظام الدین رح کی طرح، بدآوں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ پھر کچھ عرصے تک کول (علی گڑھ) کے سرکاری دفتر میں "نائب مشرف" (یعنی سررشتہ دار) کے عہدے پر رہے اور یہیں سے بغداد جاکر علم حدیث کی تکمیل کی۔ اُن کی تالیف "مشارق الانوار" حدیث کی نہایت مشہور و معتبر کتاب مانی جاتی ہے اور اس کی قبولیت کا اس ایک واقعے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دسویں صدی ہجری تک (یعنی تقریباً ساڑھے تین سو برس میں) اس کتاب کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی ایسے لکھے جاچکے تھے جو بجائے خود مستقل اور بلند پایہ کتابیں ہیں! امام صاحب موصوف کی اور بھی کئی کتابیں یادگار ہیں۔ اُنہوں نے ۶۵۰ھ میں وفات پائی[1]

---

[1] امام صغانی رح کے حالات اور تصانیف کا مآثر الکرام میں ذکر موجود ہے

علما کی تعظیم
عدالتی مناصب

مشائخین و علما کی تعظیم اور خدمت گزاری کو ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کے مسلمان اپنی سعادت جانتے تھے اور سرکاری طور پر بھی اُمرا اور وزرا سے قضاۃ کا مرتبہ اونچا ہوتا تھا[۱] مگر ان قاضیوں کے بھی اُمرا اور دیگر عہدہ داروں کی طرح مختلف درجے تھے۔ یوں تو ہر بستی یا چھاؤنی میں ایک دو قاضی مقرر کئے جاتے تھے کہ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کریں، لیکن پائے تخت دہلی اور لشکر شاہی کے قاضی مرتبے میں سب سے بڑے سمجھے جاتے تھے اور ان سب پر ایک **قاضی ممالک** یا صدر الصدور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲ - (صفحہ ۱۸۰) اور اس میں انہیں غلطی سے "لاہوری" لکھدیا ہے۔ لیکن سب سے واضح اور معتبر حالات وہ ہیں جنہیں سلطان نظام الدین رح کی زبانی صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے (صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۵) قدیم حواشی اور شروح کے لئے دیکھو کشف الظنون جلد اوّل صفحہ ۳۳۲۔ "مشارق الانوار" کا ایک محشّٰی ترجمہ اردو میں چھپ چکا ہے لیکن مترجم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صاحبِ کتاب اصل میں ہندوستان کے آدمی ہیں ؟

[۱] صاحب طبقات اور ضیاء الدین برنی نے جہاں بادشاہوں کے بڑے عہدہ دار اور اولاد کی فہرست درج کی ہے وہاں بادشاہِ وقت کے بعد شہزادوں سے بھی پہلے "قضاۃ" کے نام لکھے ہیں اور یہی باعتبار مراتب اُس عہد کا درباری آئین معلوم ہوتا ہے۔ (دیکھو طبقات صفحہ ۱۲۵ و ۱۷۷، برنی ۲۴ و ۱۲۶ وغیرہ)

یا شیخ الاسلام ہوتا تھا جو تمام عدالتی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا اور مختلف مقامات پر قاضیوں کا تقرر اور مقدمات کا مرافعہ اور آخری فیصلہ کرتا تھا۔ فیصلے بالعموم فقہ حنفی کے مطابق کئے جاتے تھے۔

پنچایتیں۔ ہندوؤں کو عدالتی یا قانونی معاملات میں بالکل آزادی حاصل تھی اور اُن کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ خود اُن کی منتخب کردہ دیہی یا قومی پنچایتوں میں ہوتا تھا اور اُن فیصلوں کے نفاذ کے لئے ضرورت کے وقت سرکار ان کی اعانت کرتی تھی۔

کوتوال اور شحنہ۔ بڑے بڑے شہروں میں تھوڑے سے انتظامی اختیارات کوتوال شہر کو بھی دے دئے جاتے تھے جس کے ماتحت نیم فوجی پولیس کی معقول جمعیت ہوتی تھی۔ ان اختیارات کی بنا پر اگر ہم اس زمانے کی اصطلاح میں کوتوال کو "پولس میجسٹریٹ" کہیں تو بیجا نہ ہوگا لیکن اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ تمام اہم فوجداری مقدمات اس کو قاضی کی عدالت میں پیش کرنے پڑتے تھے اور قاضی کے فیصلے کے بغیر وہ بطور خود کوئی سزا مجرم کو نہ دے سکتا تھا۔

شحنہ کی اصطلاح اُس زمانے میں ایک خاص معنی میں مستعمل تھی، جسے میجر راورٹی انگریزی میں "سپرنٹنڈنٹ" کے لفظ سے ترجمہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک دورِ جدید

کی زبان میں اسے ڈپٹی کلکٹر یا افسر مال کہنا چاہیئے جو گاؤں کے پٹیل پٹواری کی معرفت سرکاری مالگزاری وصول کرتا اور مال کے مقدمات بھی فیصل کرتا تھا۔ مگر دیوانی یا فوجداری مقدمات میں اس کا کچھ دخل نہ تھا اور یہ مقدمے صرف قاضی کی عدالت یا پنچایت ہی چکا سکتی تھی۔

صوبہ دار وغیرہ

کوتوال و شحنہ پر ہی منحصر نہیں، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی انتظامی عہدہ دار عدالتی معاملات میں دخل و اختیار نہیں رکھتا تھا، اور یہ وہ قدرتی اور واجبی تقسیم اختیارات ہے جس کے واسطے آج کل اہل ہند انگریزی حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں؛ مگر مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں صوبے کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار بھی بالعموم قاضی کا فیصلہ رد نہیں کر سکتا تھا۔

یہ عہدہ دار اُن دنوں مقطع یعنی "صاحب اقطاع" کہلاتے اور صوبہ کی بجائے بھی "اقطاع" کا لفظ مروج تھا۔ اِن مقطع یا صوبہ داروں کے اختیارات و مرتبے میں فرق ہوتا تھا اور اس کا سبب اُن کی ذاتی وجاہت اور نیز اقطاعات کی مختلف حیثیت ہوتی تھی کیونکہ پائے تخت دہلی سے دُور، سرحدوں کے اقطاع[1] بالعموم رقبے میں

---

[1] مثلاً بنگالے میں اگرچہ دریائے گنگا کے شمال اور جنوب میں دو علیحدہ صوبے تھے، مگر بالعموم ان کا صوبہ دار یا مقطع ایک ہی شخص ہوتا، جس کا مستقر (اور اس لئے صوبے کا نام بھی) لکھنوتی تھا۔

بہت وسیع تھے اور اُن کے حاکموں کو بھی اندرونی نظم ونسق کے علاوہ ، اپنی ذمہ داری پر بیرونی جنگ تک کا اختیار دے دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں مرکزی حکومت کو وقتی اور مقامی ضروریات سمجھانے اور کسی کام کی منظوری حاصل کرنے میں بہت دیر لگتی تھی ؛ غرض بڑے اقطاعات کے حاکموں کا مرتبہ بڑا اور اختیارات زیادہ ہوتے تھے اور اسی طرح بادشاہ بطور خاص اپنے کسی عزیز کو چھوٹے اقطاعات میں بھی زیادہ اختیارات دے سکتا تھا ؛ مقطع کے ماتحت چھوٹے شہروں میں یا براہِ راست بادشاہ کے حکم سے اضلاع اور پرگنوں میں جو انتظامی حاکم مقرر ہوتے تھے ، وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) اسی طرح ملتان و اُچھ کے دو بڑے اقطاع شہزادہ محمدؔ کی حکومت کے زمانے میں ملادئے گئے تھے۔ سرحد راجپوتانہ کے مشہور اقطاع ناگور، منڈور، اجمیر اور سانبھر، پائے تخت سے قریب ہونے کی وجہ سے رقبے میں بڑے نہ تھے لیکن یہاں کے صوبہ دار بھی اکثر نہایت معزز اور ذی اختیار ہوتے تھے۔ مالوے کے اقطاعات میں تھنکر (بیانہ) اور گوالیار کا جابجا ذکر آتا ہے ؛ پنجاب میں پہلے لاہور اور بعد میں دیالپور، بھٹنڈہ، سانہ، کہرام اور ہانسی مشہور اقطاع تھے۔ اور پائے تخت دہلی کے قریب اوّل اوّل مسلمان آبادی کا بڑا مرکز ہونے کے سبب سے اقطاع بداؤں کی خاص وقعت و منزلت تھی کہ

"خواجہ" اور "متصرف" کہلاتے تھے[1]

خطبہ و سکہ[2] کے سوا جو ہمیشہ بادشاہ دہلی کے نام کا رائج ہوتا تھا، بعض صوبہ دار اپنی اپنی جگہ پر نیم خود مختار بادشاہ ہوتے تھے۔ لیکن مرکزی حکومت خراج کی مقررہ رقم اور فوجی امداد لینے کے علاوہ، اُن سے انتظامی معاملات میں بھی باز پرس کر سکتی تھی۔ چونکہ خود صوبہ داروں کی آیندہ ترقی اور ذاتی اقتدار ہی اپنے صوبے کی خوشحالی پر منحصر ہوتا تھا، لہٰذا وہ رعایا کو خوش کرنے اور آبادی بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور تاریخ میں اکثر مسلمان صوبہ داروں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے عمدہ نظم و نسق کے ساتھ ملک میں بہت سے نئے شہر بنائے ویران علاقے آباد کیے۔ اور دشوار گزار جنگلوں کو کاٹ کر اور اُن علاقوں میں جو کثرت بارش سے ہفتوں زیر آب رہتے تھے، مضبوط و بلند پشتے بنا کر[3] نئے راستے

---

[1] برنی صفحہ ۳۶ و ۳۸

[2] جہاں تک تاریخی شہادت کا تعلق ہے، تمام شمالی ہند میں ایک سکہ سب سے پہلے سلطان معزالدین سام ہی کے زمانے میں جاری ہوا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے بنگالے کے بعض اضلاع میں اس سے پہلے دھات کا کوئی سکہ رائج ہی نہیں ہوا تھا۔ (دیکھو طبقات ناصری۔ صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۱۔ کرانکلز آوف دی پٹھان کنگز صفحہ ۱۱۱)

[3] اس قسم کے بلند راستے بنانے کی ضرورت بنگالے میں پڑتی تھی جہاں

نکالے تاکہ تجارت اور آمد رفت میں سہولتیں پیدا ہوں اور صوبے کی خوش حالی ترقی پائے۔

اسی کارگزاری پر صوبہ دار کی شہرت اور آیندہ ترقی منحصر تھی۔ صدر حکومت کو اس کے عزل و نصب کا اختیار تھا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا، وہ ہر وقت اس کے کاموں پر نظر رکھتی تھی۔ صوبہ دار کا سب سے بڑا فرض یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مُلک میں فتنہ و فساد نہ ہونے دے اور گو خشک سالی یا دیگر مشکلات کی وجہ سے رقوم خراج یا جزیہ کی عدم ادائی، نیز فوج کا بر وقت مہیا نہ ہو سکنا، معمولی تحقیقات کے بعد معاف کر دیا جاتا تھا لیکن ایک خطا ایسی تھی جس میں صدر حکومت نہایت سخت گیری سے کام لیتی تھی۔ وہ یہ کہ مظلوم اور کمزور کی داد رسی میں قصور کیا جائے یا خود صوبہ دار کسی رعایت یا اشتعال کی وجہ سے نا انصافی کر گزرے! ایسی صورت میں صوبہ دار پر بادشاہ کا سخت عتاب ہوتا اور اگر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷) برسات میں پانی کی وجہ سے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ مسلمان حکام نے بیسیوں میل لمبے متعدد سنگین پشتے تیار کرا کے اس خرابی کو دور کر دیا تھا اور بعض پشتوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی سنین میں ان پشتوں کی تعمیر کے متعلق دیکھو طبقات ناصری صفحہ ۱۶۲- اور آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کا خلاصہ راورٹی نے اپنے حواشی میں لکھ دیا ہے۔ (صفحہ ۵۸۲) ؁

خود صوبہ دار نے کوئی ظلم کیا ہے تو بلا رو رعایت عام مجرموں کی طرح اُس کو سزا دی جاتی تھی ؂

ڈاک کا انتظام

صوبہ داروں پر نگرانی اور حالات کی اطلاع دینے کے لئے ہر اقطاع میں ایک بادشاہی عہدہ دار مقرر تھا جسے برید یعنی ڈاک کا عہدہ دار کہتے تھے اور ان سب کا اعلیٰ عہدہ دار برید ممالک کہلاتا اور خاص پائے تخت میں اُس کا دفتر ہوتا تھا۔ ڈاک کے مقررہ وقت باقاعدہ پہنچنے پر خاص توجہ کی جاتی تھی اور کم سے کم بلبن کے عہد میں یہ محکمہ اس قدر منتظم حالت میں تھا کہ بنگالے اور حاج نگر پر فوج کشی کے زمانے میں بھی اُس نے حکم دیا تھا کہ دہلی کی ڈاک ہر ہفتے میں تین چار مرتبہ لشکر گاہِ شاہی میں پہنچ جایا کرے؂ اسی بادشاہی ڈاک کے ساتھ اور لوگ بھی اپنے خطوط روانہ کر سکتے تھے امراء، صوبہ دار اور بڑے بڑے تاجروں کے ہرکارے ہر سمت میں الگ دوڑتے رہتے تھے اور اُس زمانے کی تاریخیں نیز بعض مکتوبات کے مجموعے، دیکھکر یہ رائے قائم کرنا کچھ بے بنیاد نہیں ہے کہ ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں لوگ خاصی طرح خط و کتابت کرتے اور کر سکتے تھے ؂

؂ برنی صفحہ ۸۷ ۔ نیز ڈاک کے انتظام کے متعلق دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) ترجمہ ۸۲ ۔

راستے اور ذرائع سفر

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں جب کہ ریل تو ایک طرف پکی سڑکیں بھی نہ تھیں، راستہ طے کرنے میں بہت دیر لگتی تھی۔ کچے راستوں میں بھاری بیل گاڑیوں کے سوا اور کسی قسم کی گاڑی نہ چل سکتی تھی۔ پالکی، سنگھاسن یا ہوادار، پُر تکلف امیرانہ سواریاں تھیں۔ لیکن اُس زمانے میں ایسے دودم اونٹ اور گھوڑے خاص طور پر بہ کثرت پالے جاتے تھے جو ایک دن میں سو میل کی منزل طے کرتے تھے[۱] اور بعض سپہ سالاروں کی (سوار) فوج سمیت ۶۰، ۷۰ میل روزانہ طے کرنے کی بھی مثالیں ملتی ہیں[۲] بایں ہمہ فوج کی بڑی منزل، جبکہ لمبا سفر کرنا ہو ۲۴، ۲۵ میل سے زیادہ نہ ہوتی تھی اور عام مسافر یا تجارتی قافلے اس سے بھی آہستہ چل کر راستہ طے کرتے تھے۔

تجارت اور صناعات

آمد و رفت اور تجارتی یا فوجی سامان لے جانے کے لئے، جہاں کہیں دریا تھے، وہاں کشتیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خاص کر دریائے سندھ میں بہت سی تجارتی کشتیاں بیرونی ممالک کا تجارتی مال اندر اور پنجاب و سندھ کی دساور، سندھ کی بندرگاہوں تک لاتی اور لے جاتی تھیں۔ اور پہلے باب میں جغرافیہ ادریسی کے حوالے سے اجمالاً

---

[۱] طبقات ناصری۔ صفحہ ۲۲۳۔ راورٹی صفحات ۵۱۴ و ۶۶۴ وغیرہ

[۲] ۔ ۔ ۔ ۲۲۳ ۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان بندرگاہوں سے چین، جزائر ہند چینی اور دوسری طرف خلیج فارس اور بحیرۂ عرب کے سواحل تک تجارتی درآمد و برآمد کا سلسلہ جاری تھا۔ اِدھر برّی تجارت کے بڑے بڑے قافلے دُور دور کے ملکوں سے ہندوستان آتے تھے اور لاہور کی تباہی کے بعد اُن کا سرحدی مرکز ملتان اور اُچھ بن گیا تھا جہاں سے وہ ستلج کے کنارے کنارے جنوبی پنجاب سے گزر کر دہلی پہنچتے تھے ستلج اُن دنوں موجودہ گزرگاہ سے چالیس پچاس میل نیچے ہٹ کر بہتا تھا اور یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجاب کے جنوب کے وہ اضلاع جو اب صحرائے راجپوتانہ کی حدود میں آکر غیر آباد رہ گئے ہیں، اُس وقت سرسبز و شاداب تھے۔[1]

اشیائے تجارت کی تفصیل اور مقدار و مالیت کا کوئی صحیح تخمینہ نہیں ملتا، لیکن شاہی دربار کے سامانِ تجمّل، اُمرا کے قیمتی ملبوسات اور اسبابِ آرائش و ظروف[2] کے جا بہ جا

---

[1] راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۳۳۲

[2] مثال کے طور پر دیکھو طبقات صفحات ۳۱۶ تا ۳۱۹ جن میں اُلغ خاں کے جلوسِ فتح اور مُغل سفیروں کی دعوت وغیرہ کا حال بیان کیا ہے۔ تاج المآثر، ضیاء الدین برنی کی تاریخ نیز امیر خسرو رح کی تصانیف میں بھی جستہ جستہ اُس عہد کے پرتکلّف اسبابِ معاشرت کا ذکر ملتا ہے جو زیادہ تر بیرونِ ہند سے بن کر آتے تھے۔

حالات پڑھکر یقین ہوتا ہے کہ وسطِ ایشیا اور ممالک اسلامی کی مشہور مصنوعات کثرت کے ساتھ ہندوستان میں آتی اور فروخت ہوتی تھیں؛ پھر جب حکومت دہلی کو استقلال حاصل ہوا تو ان ملکوں سے خود صناع اور باکمال کاریگر، بالخصوص اسلحہ ساز و معمار، نقلِ وطن کرکے ہندوستان آنے لگے؛ چنگیزخانی سیلاب نے اس رفتار کو اور بھی تیز کردیا اور جہاں بیسیوں امیر زادے وطن چھوڑ چھوڑ کر مجبوراً ہندوستان میں آکر پناہ گزین ہوئے وہیں ہزاروں پیشہ وروں[۱] کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا، کیونکہ مُغل حملہ آور انہیں پکڑ کر جبراً مغولستان لے جاتے تھے؛ غرض یہی نو وارد کاریگر تھے جنھوں نے اسلحہ سازی، قلبِ معادن، پارچہ بافی اور زردوزی وغیرہ صنعتوں کے نئے کارخانے بنائے اور دہلی اور دیگر بلاد ہند میں عہد شمسی کی وہ عالیشان مساجد و عمارات تعمیر کیں جن میں کم سے کم قطب صاحب کی لاٹھ آج بھی دنیا کے مشہور آثارِ قدیمہ میں داخل ہے[۲]؛

۱؎ ممالک اسلامی میں صناعوں کی جو کثرت تھی اس کا کچھ اندازہ اس واقعے سے ہوگا کہ جب چنگیز نے شہر سمرقند کو فتح کیا تو وہاں صرف صناع و کاریگر مردوں کا شمار تیس ہزار تھا؛ (راورٹی، حاشیہ صفحہ ۹۷۰)

۲؎ عام طور پر انگریز مصنفوں نے یہ بات مشہور کردی ہے کہ سلاطین دہلی نے یہ عمارتیں ہندو معماروں سے تیار کرائی تھیں۔ حالانکہ روایت و درایت دونوں اعتبار سے ان کا یہ "قیاس" غلط ہے اور میجر راورٹی بھی اسکی

پائے تخت دہلی۔

جیسا کہ اشارۃً اوپر بیان ہوا، دارالسلطنت دہلی اس تجارت و صنعت بلکہ اسلامی تمدن کا مرکز تھا۔ اور جب اس عہد کا سب سے بڑا سیاح ابن بطوطہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے تمام متمدن ممالک میں پھر کر ۷۳۴ھ میں یہاں آیا تو اس نے دہلی کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ "یہ ایک عظیم الشان شہر ہے۔ آبادی بہت زیادہ ہے۔ مضبوطی اور خوبصورتی دونوں کے اعتبار سے بے مثل اور لاجواب ہے۔ جیسی مضبوط شہر پناہ دہلی کے گرد بنی ہوئی ہے، ویسی عمدہ اور مستحکم شہر پناہ دنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے۔ تمام بلادِ ہندوستان پر ہی نہیں بلکہ دہلی کو تمام مشرقی دنیائے اسلام کے شہروں پر ترجیح ہے[۱]" ایک جہاندیدہ پردیسی کے یہی چند جملے اسلامی حکومتِ ہند کے مجموعی محاسن کی نہایت عمدہ سند کا کام دے سکتے ہیں کہ صرف سو ڈیڑھ سو برس کے اندر اس حکومت نے ایک معمولی بستی کو ترقی دیکر متمدن دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں شمار ہونیکے لائق بنا دیا۔ لیکن پہلے ہمیں اس کی مختصر ابتدائی تاریخ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۲) زوردار الفاظ میں تردید کرتے ہیں۔ (دیکھو، ان کا ترجمہ طبقات حاشیہ صفحہ ۵۲۰)

[۱] سفرنامہ۔ (اردو ترجمہ) صفحہ ۸۹

مطالعے کے ساتھ یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اسے شمالی ہند کا پائے تخت منتخب کرنے کی کیا وجوہ تھیں نامعتبر افسانہ و قصص کو چھوڑ کر تاریخاً یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ بستی چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں پہلی مرتبہ آباد ہوی یا دہلی کہلائی اور پانچویں صدی ہجری (یا گیارہویں صدی عیسوی) کے وسط میں اُس ریاست کی راج دھانی بنی جس کی حدود ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اسلامی فتح کے وقت یہاں سنگِ سرخ کا ایک مضبوط قلعہ تھا لیکن پرتھی راج کے دور میں آنیکی وجہ سے دہلی ریاست اجمیر کی تابع بن گئی اور اسطرح اُس کی سیاسی منزلت گھٹی تو گمان ہوتا ہے کہ آبادی بھی گھٹ گئی ہوگی[1]۔ مگر مسلمان فاتح، شمالی ہند میں جو نئی سلطنت قایم کر رہے تھے اُس کے واسطے دہلی سے بہتر صدر مقام کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اوّل تو وہ سندھ و پنجاب اور موجودہ آگرہ و اودھ کے عین وسط میں واقع ہے دوسرے یہاں سے راجپوتانے کے جنگجو قبائل پر ہر وقت نظر رکھی جاسکتی تھی۔ تیسرے لبِ جمنا اور نیز گنگا کے قریب واقع ہونے کے باعث یہاں سے ممالکِ بنگالہ تک فوج کشی کرنا سہل ہو گیا تھا کیونکہ یہ دریا کشتی رانی کے واسطے نہایت موزوں تھا

[1] آرکی ہسٹری - صفحات ۳۸۴ و ۳۸۶ گزیٹیر جلد گیارہ صفحہ ۲۳۳-

شہر کی آبادی

غرض ہندوستان کے نئے بادشاہوں نے اسی شہر کو اپنی تخت گاہ قرار دیا اور ایک صدی کے اندر، راجپوت زمینداروں کی یہ چھوٹی سے بستی، اتنا بڑا شہر بن گئی کہ آج کل، نئی دہلی یا شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر اس کے پرانے کھنڈر بھی تقریباً پینتالیس مربع میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بے شبہ ان میں سے اکثر کھنڈر اُن عمارتوں کے ہیں جو عہد بلبن کے بعد تعمیر ہوئی تھیں لیکن شہر کی وسعت و عظمت کی بنیاد سلطان شمس الدین ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی اور فتنۂ مغول کے بھاگے ہوئے لوگ انہی ایام میں بلادِ ہند، خاص کر دہلی، میں آکر بسے تھے۔ بغداد تباہ ہوا (۶۵۶ھ) تو وہاں کے علماء اُمرا اور دو عباسی شہزادے بھی یہیں آکر پناہ گزیں ہوئے۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب ایسے پندرہ شہزادے، جن کے خاندان میں چند سال قبل تک حکومت و بادشاہی تھی، دربار بلبنی کی زینت بڑھاتے تھے اور دہلی میں ہر ایک کے نام پر علیحدہ علیحدہ محلّے آباد ہو گئے تھے[1]۔ یہ محلّے بجائے خود چھوٹے چھوٹے قلعے ہوتے تھے جن میں پیادہ و سوار کی معقول جمعیت کے علاوہ، شاگرد پیشہ، تجار، اور اہل حرفہ کی کافی تعداد رہتی تھی۔

[1] تاریخ فرشتہ (صفحہ ۷۵) جس میں ان پندرہ محلّوں کو نام بہ نام درج کیا ہے۔

اُس زمانے میں مردم شماری کا دستور نہ تھا اور ہم شہر کی کُل آبادی کا اندازہ صرف اُن سپاہیوں کی تعداد سے کرسکتے ہیں جنھوں نے دہلی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور جو شہر کی مردانہ آبادی کا عنصر غالب تھے۔ کیونکہ درحقیقت اکثر اسلامی شہروں کی نوعیت ہی فوجی چھاؤنیوں کی سی تھی جن میں سپاہی اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے مکانات بناکر مستقل سکونت اختیار کرلیتے تھے۔ اور سلطان ناصرالدین محمود ہی کے زمانے میں اس فوج کی تعداد جو دہلی اور حوالئی شہر میں تھی دو لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار گنی گئی تھی[1]۔ اس قول کی تصدیق نیز اس بات کا ثبوت کہ اِس تعداد میں آیندہ مزید اضافہ ہوتا رہا، یہ ہے کہ علاءالدین خلجی کے عہد میں فقط سوار فوج کا شمار تین لاکھ تک پہنچ گیا تھا[2] اور اگر سب نہیں تو اس فوج کا حصۂ اعظم یقیناً خاص دہلی میں سکونت گزیں تھا۔ اب قیاس کرنا چاہیئے کہ اتنی کثیر سپاہ کے اہل و عیال، متعلقین، ملازمین اور ان کی ضروریاتِ تمدن پوری کرنے والے

[1] طبقاتِ ناصری صفحہ ۳۱۷۔ راورٹی صفحہ ۸۵۶۔

[2] فرشتہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ مغلوں سے جب شہر کے قریب مقابلہ ہوا تو علاءالدین "بروایت صحیح با سہ لک سوار و دو ہزار و ہفت صد فیل" مقابلے کے لئے نکلا تھا؛ ضمناً ضیاالدین برنی کے اقوال سے بھی اس تخمینۂ فوج کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۷۔

اہل حرفہ، مزدور اور تاجر، بنئے بقّال کتنے ہوں گے؟ اور تمام قرائن کو ملحوظ رکھکر امّید ہے ہمارا یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ سمجھا جائے گا کہ عہد بلبن میں دہلی اور حوالئ دہلی کی کل آبادی کم سے کم پانچ اور سات لاکھ کے درمیان تھی! گویا عظمتِ رفتہ کے مرثیہ خواں شاعر، حالی، کا یہ شعر نہ صرف بعد کی دہلی یا شاہجہاں آباد پر بلکہ ساتویں صدی (ہجری) کی دہلی پر بھی بخوبی صادق آتا تھا کہ،

زیب دیتا تھا لقب تجھکو "جہان آباد" کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا![ع۱]

دوسرے بڑے شہر۔

بالعموم ایشیائی ممالک میں صرف دارالسلطنت ہی بڑا اور آباد شہر ہوتا ہے۔ سلطنتِ دہلی کے متعلق بھی یہ خیال اس حدتک صحیح ہے کہ اُن دِنوں شمالی ہند میں اور کوئی شہر آبادی میں اُس کے برابر ہونا تو درکنار، آدھا بھی نہ تھا، تاہم مختلف شواہد پر بہ احتیاط غور کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم تین شہر ایسے موجود تھے جنھیں زمانۂ جدید کے معیارِ آبادی کی رو سے بھی "بڑے شہر" کہا جاسکتا ہے۔ یہ ملتان، لاہور (تباہی سے قبل) اور

ع۱ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شہر بغداد کی کُل آبادی کا شمار اُسکے عروج (یعنی تیسری صدی ہجری کے اوائل) کے زمانے میں بیس لاکھ مانا جاتا تھا (انسای کلو، جلد سوم صفحہ ۱۹۰)

لکھنوتی تھے جن میں سے آخرالذکر کی آبادی کچھ عرصے بعد بڑھتے بڑھتے خود دہلی کے برابر ہوگئی تھی[۱] دوسرے درجے کے آباد و بارونق شہر، بہار، بنارس، کڑاہ، فیض آباد، (اودھ)، بداؤں، اجمیر، ناگور، ہانسی، بھٹنڈہ، کہرام، سمانہ، دیالپور، اچھ، بھکر، اور دیبل مانے جاتے تھے اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے اقطاع کا (جنہیں اس زمانے کی قسمت یا کمشنریوں کے برابر سمجھنا چاہئے) مستقر تھے۔

محاصل سلطنت

تمام سلطنت کی آبادی کا اندازہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی قابل اطمینان ذریعہ نہیں لیکن اس بارے میں اگر ہم کچھ قیاس دوڑا سکتے ہیں تو محاصل سلطنت کا تخمینہ کرنے کے بعد جن کی صحیح میزان صرف تاریخ فیروز شاہی[۲] میں ملتی ہے۔ اور وہ صحت و تحقیق کے ساتھ ہمیں بتاتی ہے کہ فیروز تغلق کے زمانے میں محاصل سلطنت کی

---

[۱] راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۸۲ ۔ (چنگیز مصنفین کے حوالے سے)

[۲] یہ تاریخ، جسے سلطان فیروز شاہ تغلق کے ایک درباری شمس سراج عفیف نے لکھا تھا، ضیاء الدین برنی کی کتاب کی طرح تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہے اور چونکہ اس میں صرف بادشاہِ موصوف کے حالات درج ہیں، لہذا ہم اس تاریخ کو اسی نام سے یاد کریں گے اور برنی کی کتاب کو محض تاریخ برنی کہیں گے تاکہ ان دونوں میں بہ آسانی امتیاز ہو سکے۔

کُلّ میزان ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ تنکہ تھی۔[1] تنکہ یا تنگہ (معنی "سفید") ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اور اُن دنوں ہندوستان کا روپیہ، یعنی ایک تولہ چاندی کا سکّہ، اسی نام سے مروّج تھا سونے کی اشرفی کو بھی تنکۂ زر یا تنکۂ سُرخ کہتے تھے مگر زیادہ رواج اُسی نقرئی تنکے اور تانبے کے پیتل یا جیتل کا تھا جسے اِس زمانے کے ادھنّے کا ہم سنگ سمجھنا چاہیئے۔ ایک تنکے کے ۴۸ جیتل اور ایک جیتل کے ۴ فلوس (یعنی دھیلے یا چھوٹے پیسے) ہوتے تھے؛ اوّل اوّل چاندی کا ایک اور سکہ دہلی وال بھی بنایا جاتا تھا جس میں تانبے کی ملونی ہوتی تھی لیکن سندھ و پنجاب کے سوا، ہندوستان خاص کے علاقوں میں اس کا زیادہ رواج نہیں ہوا۔ البتہ بعد میں، خاص جدّت طراز محمّد تغلق کے عہد میں، اور کئی سکّے چلنے لگے تھے جن میں دوگانی (= دو جیتل) اور چہارگانی (= چار جیتل) قابل ذکر ہیں۔[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۹۴۔

[2] ہندوستان کے قدیم اسلامی سکّوں کے ٹھیک وزن و قیمت کے متعلق ہماری معلومات یقینی نہیں۔ ہم عصر فارسی تاریخوں میں اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت منتشر اور کہیں کہیں متناقض ہے۔ حال میں اڈورڈ ٹامس نے اِن کی تحقیقات میں بڑی محنت اور قابلیت سے چند مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن اس کے نتائج بھی ہر جگہ قابل تسلیم

الغرض جیسا کہ ہم بیان کر رہے تھے، عہد فیروز شاہ تُغلق میں محاصلِ سلطنت کی میزان پونے سات کروڑ تنکہ تھی اور اس وقت نہ صرف دکن بلکہ بہار و بنگال کے زرخیز صوبے، سلطنت کی حدود سے خارج اور خود مختار ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے سلاطین کے محاصل کی کوئی صحیح میزان ہمیں نہیں ملی۔ صاحب طبقات ناصری نے ایک جگہ سلطان شمس الدین کی داد و دہش کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ "علمائے باتام و سادات کرام و ملوک و اُمرا و صدور و کبرا" کو "زیادت از ہزار لک" (یعنی دس کروڑ) ہر سال عطا کیا کرتا تھا۔ اور گو مدح کے جوش میں اُس نے ہمیں سکّہ تک نہیں بتایا، لیکن گمان ہوتا ہے کہ عجب نہیں یہ دس کرور تنکہ مداخل و مصارف سلطنت کا ایک مبالغہ آمیز تخمینہ ہو؟ دیگر قرائن سے بھی ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر نظر عہد میں ممالک ہند کی کل سالانہ آمدنی کم و بیش دس کرور تھی اور اسی میں اِن تمام اقطاعات اور جاگیرات و اوقاف کے تخمینی محاصل شامل ہیں جنہیں خزانۂ شاہی کی بجائے صاحبانِ اقطاع

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ نہیں معلوم ہوتے۔ مذکورۂ بالا بحث کے متعلق ملاحظہ ہو اُس کی کتاب "کرانکلز آوف دی پٹھان کِنگز" (صفحات ۴۹، ۱۱۶، ۲۱۹، وغیرہ) نیز دیکھو راورٹی حواشی صفحہ ۵۸۴۔ الیٹ جلد دوم حاشیہ صفحہ ۲۴۲ تا صفحہ ۱۶۶۔

روپے کی قیمت خرید

و جاگیرات وصول کر لیتے تھے [1]

اس دس کرور تنکہ محاصل کا اگر موجودہ محاصل سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہرا بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ چنانچہ شمالی ہند کے چار بڑے صوبوں کی مقامی (لوکل) اور شاہی (امپیریل) محاصل کی کل میزان ۱۹۱۰ء میں تقریباً پینتالیس کرور روپیہ تھی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اُس زمانے کے ایک تولہ چاندی کے تنکے اور آج کل کے روپے کی قیمت خرید میں بڑا بل تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اجناس کے جو نرخ سرکاری طور پر مقرر و مروج تھے اُن سے اُس عہد کی ارزانی کا پتہ چلتا ہے کہ ایک تنکہ کے (موجودہ اوزان کے حساب سے) ڈھائی من تو گیہوں بکتے تھے اور جو، چنا، موٹھ، ماش وغیرہ اجناس اس سے بھی زیادہ سستی تھیں؛ مصری کچھ کم آٹھ سیر، سفید شکر بارہ سیر اور سرخ شکر چھتیس سیر فی تنکہ فروخت ہوتی تھی۔ اسی طرح باریک و نرم گاڑھے ("کرپاس") کا بیس گز کا تھان ایک تنکہ میں، اور عمدہ نین سکھ ("شیریں بافت") کا غالباً اسی قدر بڑا تھان پانچ تنکہ میں اور معمولی تین تنکہ میں مل جاتا تھا [1]۔ غرض مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا

---

[1] نرخ اجناس کے متعلق دیکھو برنی صفحہ ۳۰۵ و ۳۱۰۔ اوزان کے تعین میں ہم نے فرشتہ کی پیروی کی ہے جس نے اپنے زمانے میں قدیم تر اوزان کی تحقیق کی تھی۔ دیکھو صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۴ ج۱ واضح رہے کہ سیر اس زمانے میں

کہ قیمتِ خرید کے اعتبار سے آج کل کے کوئی بارہ روپے اُس زمانے کے ایک تنکہ کے برابر ہوے ہُونگے۔

آبادی اور عام خوشحالی۔

القصہ فیروز شاہ کے محاصل ہی کو پیش نظر رکھکر اگر ہم اُس ایک گاؤں کی آمدنی (تیس ہزار جیتل)، کو جو صاحب طبقات ناصری کو ملا تھا[1] اوسط قرار دیں تو تمام شمالی ہند میں کل دیہات کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے اوپر ہوگا اور تاریخ فیروز شاہی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین کے عہد میں ایک گانوں کی آبادی ذکور کا تخمینہ ۲ سو تا ۳ سو مرد کیا جاتا تھا[2] لہذا ہم ایک گانوں کی کل آبادی بالاوسط چار سو قرار دیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا اور اس حساب سے کل شمالی ہند کی مردم شماری کا تخمینہ چار کرور کے قریب ہوتا ہے جو گویا آج کل کی (چودہ کرور) آبادی سے کچھ کم یک ثلث تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ظنی اعداد ہیں، البتہ ایک بات، جس کے ثبوت میں بہت سے قوی قرائن اور تحریری شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں، یقینی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ گو اُس وقت کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱-) ۲۴ تولے کا ہوتا تھا اور اس حساب سے چالیس سیر کا من، ہمارے ۱۲ سیر کے برابر ہوا۔ لیکن اوپر جو نرخ لکھے ہیں وہ موجودہ اوزان کے حساب سے ۸۰ تولے کا سیر بنا کے لکھے گئے ہیں۔

[1] طبقات۔ صفحہ ۲۹۵۔

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ صفحہ ۹۵۔

تمدّن سادہ اور اس زمانے کے مقابلہ میں دہقانی قسم کا تھا، بایں ہمہ متوسط اور ادنےٰ طبقے کے لوگ، جن کی تعداد کل آبادی میں ستّر اسّی فیصدی ہوتی ہے، آج کل کی نسبت کہیں زیادہ آسودہ اور خوشحال تھے۔

۳- بلبن کے جانشین -

سلطنتِ دہلی کی جنگی قوت اب اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ اگر مغلوں کے حملے کا اندیشہ نہ رہتا، تو بلبن ہی کے زمانے میں اس کی حدود نربدا سے آگے بڑھ جاتیں چنانچہ آخرکار جب سلطان علاءالدین کے عہد میں شاہی افواج نے دکن پر پیش قدمی کی تو اس وقت انھیں یہاں کی کوئی ریاست نہ روک سکی۔ مگر ان فتوحات کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم واقعاتِ تاریخی کا سلسلہ درست رکھنے کے لئے مختصر طور پر بلبن کے جانشینوں کا حال بیان کردیں۔

بلبن اگرچہ اپنے چھوٹے بیٹے بغراخاں سے زیادہ خوش نہ تھا، مگر آخری بیماری میں اُسی کو لکھنوتی سے بلاکر آیندہ جانشینِ سلطنت بنانے پر آمادہ ہوگیا۔ لیکن بغراخاں کو بادشاہی کی ہوس نہ تھی اور باپ کا مرض ٹھیرا ہوا دیکھکر وہ شکار کے بہانے سے خود ہی لکھنوتی چلا آیا۔ بلبن کو بہت رنج ہوا اور جب مرض میں دوبارہ

شدت ہوئی تو اُس نے وصیت کی کہ آیندہ بادشاہی کے لئے شہزادہ محمد یا خانِ شہید کے فرزند کیخسرو کو منتخب کیا جائے، مگر اس شہزادے سے محل کے ملازمین خوش نہ تھے۔ بظاہر انہی کی مخالفت سے ارکینِ سلطنت نے اُسے اپنے باپ کی جگہ ملتان روانہ کردیا اور شہر میں کیقباد کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا جو بغراخاں کا بیٹا اور صرف سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان شہزادہ تھا (۶۸۶ھ)۔

معزالدین کیقباد

خود مختار بادشاہ ہوتے ہی کیقباد عیش و عشرت کا شکار ہوگیا، اور اس عیاشی نے نہ صرف خود اُس کی صحت اور حکومت برباد کی، بلکہ پایۂ تخت دہلی میں عام بد اخلاقی پھیلادی۔ کیونکہ بادشاہ کا یہ میلان پاتے ہی دُور دُور سے ڈوم ڈھاڑی اور آبرو باختہ طوایف ہزاروں کی تعداد میں دہلی پہنچ گئیں۔ الناس علیٰ دین ملوکہم، خواص و عوام سب اسی رنگ میں رنگ گئے اور شاہد و شراب کی کثرت نے سارے شہر کو خرابات بنادیا۔ ان رنگ رلیوں میں، جن کی ہمعصر مؤرخ نے نہایت واضح تصویر کھینچی ہے، کام کا ہوش نہ بادشاہ کو تھا نہ اور درباریوں کو۔ سلطنت کی باگ ملک نظام الدین کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ظاہرا "دادبک[1]" ورنہ درحقیقت "نائب ملک" یعنی

[1] امیرداد" خود مقدمات و مرافعات کی سماعت کرتا تھا لیکن دادبک کی حیثیت اِس زمانے کی زبان میں، بادشاہ کے "معتمد عدالت" کی سی ہوتی تھی۔

مختارِ کار بن گیا تھا اور بادشاہ کی یہ غفلت و مدہوشی دیکھکر اب خود تختِ بادشاہی حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔
بغراخاں کو یہ خبریں لکھنوتی میں پہنچیں اور تحریری نصیحت و پند کا کچھ اثر نہ ہوا تو اُس نے اشتیاق آمیز خط لکھکر بیٹے کو ملنے کے واسطے بلایا۔ ملاقات اودھ میں ہوئی اور جب نالایق مصاحبوں کے اغوا سے کیقباد نے اصرار کیا کہ بغراخاں دربار میں سلطنتِ دہلی کے خراج گزار کی حیثیت سے حاضر ہو تو دور اندیش باپ نے یہ شرط بھی منظور کرلی اور حسبِ دستور کورنش کرتا ہوا خاص تخت کے سامنے پہنچ کر "خاکبوس" کے لئے جھکنا چاہتا تھا کہ کیقباد ضبط نہ کرسکا اور تخت سے اُتر کر خود اُسکے قدموں میں گرپڑا! مثنوی "قِران السعدین" اسی تاریخی واقعے کی یادگار ہے۔
اس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ نوجوان بادشاہ نظام الدین سے بدگمان ہوگیا ورنہ باپ کے بہت کچھ سمجھانے بجھانے سے، پرہیز و پارسائی اختیار کرنے کی جو قسمیں اُس نے کھائی تھیں، وہ چند ہی روز بعد توڑدیں اور پھر اُسی خرافات میں مبتلا ہوگیا جس نے دو ڈھائی برس میں اُسے "ضعیف و نزد" کردیا تھا۔
اِدھر نظام الدین کے ہاتھ سے اختیارات نکلتے ہی معاملات میں مزید ابتری پیدا ہوگئی اور جب اِنہی دِنوں بادشاہ پر

نشہ بازی کی بدولت فالج گرا تو ترک اُمرا نے مشورہ کرکے اُسے معزول اور اُس کے شیر خوار بچے شمس الدّین کی بادشاہی کا اعلان کردیا (۱۲۹۰ء) اسی ضمن میں انہوں نے چاہا کہ اُن عہدہ داروں کو بھی جو خالص ترک نہ تھے، مناصب جلیلہ سے الگ کردیا جائے اور اس فہرست میں سب سے اوپر "عرضِ ممالک" ملک جلال الدّین خلجی کا نام تھا؛ عارض یا عرضِ ممالک فوج کے مہیا اور مرتب کرنے والے عہدہ دار کو کہتے تھے جسے راورٹی نے انگریزی میں "مسٹر ماسٹر" کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت اور کردینی چاہئے کہ خلج یا خلجی لوگ بھی اگرچہ خالص ترکی نسل سے تھے لیکن اُن کا قبیلہ صدیوں سے الگ ہوکر ہرات و کابل کے اقطاع میں آبسا تھا اور اس لئے اب وہ ایک جداگانہ قوم سمجھے جاتے تھے؛

سلطان جلال الدّین خلجی۔

مذکورۂ بالا سازش کی جلال الدّین کو بر وقت اطلاع پہنچ گئی۔ وہ نہایت آزمودہ کار سپہ سالار تھا اور اس کے بیٹوں کی شجاعت و قوّت بھی مشہور تھی۔ شہر کے باہر اُس کے ماتحت پچاس ہزار سے زیادہ جنگجو سوار فروکش تھے۔ اِن کا ایک دستہ لے کر جلال الدّین کے بیٹے ایک دن اچانک شہر میں گھس آئے اور نئے بادشاہ یعنی شیر خوار شمس الدّین کو پکڑ کر لے گئے۔

اسی ہنگامے میں وہ ترک سردار بھی جو خلجیوں کی مخالفت میں پیش پیش تھا، مارا گیا۔ شہر کے لوگوں کو خلجیوں کی یہ زبردستی نہایت ناگوار گزری اور ان کا بہت بڑا گروہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن کوتوال نے بہ مشکل سمجھاکر بلوائیوں کو منتشر کردیا اُدھر بہت سے عہدہ داروں نے بہارپور کے پڑاو پر جاکر جلال الدین کی اطاعت قبول کرلی۔ ایک شخص جس کے باپ کو سلطان کیقباد نے مروا دیا تھا، خلجیوں کے اشارے سے محل میں آیا اور اس مفلوج و معزول بادشاہ سے جو پہلے ہی بستر پر پڑا دم توڑ رہا تھا، اپنے باپ کا انتقام لیا۔ یعنی بچھونے میں مارکر اس کی لاش جمنا میں پھینک دی[۱]۔

ماہِ محرم ۶۹۸ھ میں سلطان جلال الدین خلجی نے تخت دہلی پر ایک اہم انقلاب

[۱] برنی (صفحہ ۱۷۵) اور غالباً اسی کی تقلید میں صاحب طبقات اکبری نے (۵۷) جلال الدین کی تاریخ تخت نشینی ۶۸۸ھ لکھی ہے۔ فرشتہ (صفحہ ۸۸) نے ایک سال اور بھی کم کردیا جو سراسر غلط ہے۔ برنی کی غلطی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کیقباد کے بچے کا "زمانۂ بادشاہی" شمار نہیں کیا اور کیقباد کی معزولی کی تاریخ ہی کو جلال الدین کی تخت نشینی کا سال قرار دے دیا۔ یہ (غالباً کئی ہفتے بعد) دوسرے سال کے شروع کا واقعہ ہے جیساکہ امیر خسرو رح نے مفتاح الفتوح میں صاف صاف تحریر کیا ہے اور اس کی تصدیق و توضیح میں سب سے اچھی شہادت

جلوس کیا۔ خلجیوں کی شجاعت و سپہ گری پہلے سے مسلم تھی لیکن ہندوستان کے باشندے جو اب تک خالص ترک سلاطین کی رعایا رہے تھے، ان سپاہی پیشہ لوگوں کے بادشاہ بن جانے سے بہت ناراض ہوے اور گو جلال الدین کی انتظامی قابلیت اور ذاتی صفات نے چند ہی روز کے اندر ملک میں امن و انتظام قایم کردیا، نیز خود ترک امرا نے اُس کی اطاعت قبول کرلی۔ بایں ہمہ یہ انقلاب، ہندوستان کی طرزِ حکومت کے حق میں نیک فال نہ تھا، اور اس نے اُمرا کی قوّت توڑ کر یقیناً بادشاہ کی مطلق العنانی کو مزید تقویت پہنچائی اور گویا امکان پیدا کردیا کہ آیندہ محمدؐ تغلق جیسے خود رائے اور ایذا رساں بادشاہ عرصۂ دراز تک فرماں روائی کرتے اور لوگوں کو ستاتے رہیں ؛ البتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس اخلاقی اور اصولی نقصان کے مقابلے میں خلجی خاندان کے بادشاہوں سے ایک بہت بڑا فائدہ ہندوستان کو یہ پہنچا کہ انہوں نے شمالی ہند کو جنوبی ہند سے متّصل کیا اور انہی کی حیرت انگیز اولوالعزمی اور فتوحات نے "برّاعظم ہندوستان" کو سیاسی طور پر پہلی مرتبہ "ایک ملک"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۷ - مُلّا عبدالقادر نے فراہم کی ہے (دیکھو منتخب التواریخ - صفحہ ۱۶۴)۔

یا "ایک سلطنت" بنایا اور کیسا ہی دھندلا اور سطحی سہی، در حقیقت یہی واقعہ یک خمس نوعِ بشر کے اُس اتحاد کا پہلا نقش تھا جس کا محض خفیف و بعید امکان آج دُنیا کے دُور اندیش اربابِ فکر کی نظر میں محکوم و شکستہ حال اہلِ ہند کے اعزاز و احترام کا سبب ہو سکتا ہے!

راجپوتانے اور مالوے کی شورشیں

لیکن دکن کی فتح کچھ عرصے بعد کی بات ہے۔ دہلی کی نئی حکومت کو مسلمان اُمرا کی مخالفت[1] دفع کرنے کے بعد راجپوتوں اور مغلوں سے اپنے دیرینہ مقبوضات بچانے ہی دشوار ہو گئے تھے! راجپوتانے میں مسلمانوں کی مغربی سرحد کی جنگی چوکی منڈور تھی اور غالباً کیقباد کے عہد غفلت و عیش میں، آزاد قبائلِ راجپوت کو اس کے چھین لینے کا موقع مل گیا تھا۔ جلال الدین خلجی کے وقت میں راجپوتوں سے پہلی لڑائی یہیں ہوئی، جس میں اُنہوں نے شکست کھائی

[1] ان میں سب سے سنگین مخالفت بلبن کے بھتیجے ملِک اختیار الدین (عُرف ملک چھجو)، نے کی، جو عام وراثت کے قاعدہ سے وارثِ سلطنت تھا۔ معلوم ہوتا ہے دہلی میں اس نے دب کر خلجیوں سے مصالحت اور کڑے کی اقطاع داری پر قناعت کرلی تھی لیکن یہاں پہنچ کر مصاحبوں کی شہ سے وہ دوبارہ اپنے "حقِ شرعی" کا دعویٰ دار ہوا اور جلال الدین کو خاص اہتمام سے اُس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لڑائی میں ملِک اختیار الدین کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا تھا لیکن جلال الدین نے اپنے قدیم آقا بلبن کے نمک کا پاس کیا اور اُسے ملتان بھیج کر صرف نظربند رکھنے پر اکتفا کی۔

قلعہ پر دوبارہ حکومت دہلی کا قبضہ ہوگیا؛ لیکن رنتھنبور کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس قلعے کے استحکام اور عمدہ جائے وقوع کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی ہم نے بتایا تھا کہ اجمیر پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہونے کے بعد، راجپوتوں کی نظر میں رنتھنبور کی وقعت بڑھ گئی تھی اور اُدھر حکومت دہلی کو رنتھنبور نیز راجپوتانے کے دوسرے قلعوں کی چنداں پروا نہیں رہی تھی (صفحہ ۱۸۹) فریقین کے ان متضاد خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت میں انتشار و سستی آتے ہی راجپوتوں کے ایک طاقتور جتھے نے اس قلعے پر بھی قبضہ کرلیا اور ساتھ ہی تمام مشرقی راجپوتانے اور شمالی مالوے میں شورش و بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی؛ نئے بادشاہ نے مالوے کا دورہ خود کیا اور بڑے بڑے سرکشوں کو سزا دیتا ہوا رنتھنبور پہنچ گیا جہاں افواج شاہی نے باغیوں کو گھیر کر پہلے ہی قلعہ کا محاصرہ کرلیا تھا ساباط اور گرگچ بن چکے تھے۔ منجنیقیں نصب ہوچکی تھیں حملے کی تیاری میں کوئی کسر باقی نہ تھی لیکن جلال الدین کو اس وسیع و مستحکم قلعے کا بغور معائنہ کرنے کے بعد یہ تردد پیدا ہوگیا تھا کہ ایسے قلعے کی تسخیر میں کتنے مسلمانوں کی جان جائے گی کتنی عورتیں بیوہ اور اُن کے بچے یتیم ہوجائیں گے؟ وہ بالطبع نہایت حلیم و نیکدل آدمی تھا اور بادشاہ ہونیکے بعد

باغیوں اور خونیوں تک کے قتل سے احتراز کرنے لگا تھا۔ اِس موقع پر بھی جذبۂ خدا ترسی غالب آگیا اور اُس نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے! بعض اُمرا نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور ہر چند عرض کیا کہ باغیوں کے ساتھ ایسی رعایت کرنے کا نتیجہ بہت خراب ہوگا اور آیندہ سرکشوں کی جرأت اور بڑھ جائے گی لیکن بادشاہ نے اسلام کی تعلیم اور کُشت و خون سے تا امکان بچنے کی تعریف میں ایک لمبی تقریر کی اور فوج کو لے کر واپس دہلی چلا آیا[1]

مغلوں کا حملہ

باایں ہمہ اگر سلطان اسلامی جہاد کو محض دفاعی جنگ سمجھتا تھا، تو اس کا بھی بہت جلد موقع پیش آگیا یعنی مغلوں کے ایک بڑے لشکر نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور اگر مُلّا عبد القادر کی روایت صحیح ہے، تو ستلج کو عبور کرکے سنام کے قریب تک پہنچ گئے[2] جہاں افواج دہلی نے ان کا مقابلہ کیا اور کئی دن کی لڑائیوں میں اپنی جنگی برتری ثابت کردی! واضح رہے کہ اب مغل حملہ آور

[1] ضیاالدین برنی نے اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے (صفحات ۲۱۳ تا ۲۱۶)

[2] منتخب التواریخ صفحہ ۱۷۲- برنی کی تاریخ میں سنام کی بجائے "برام" لکھا ہے (۲۱۸) جس کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ یہ مقام کہاں تھا؟ اور اس لئے غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو، الیٹ جلد سوم صفحہ ۱۴۷)

پہلے کی طرح بت پرست و کافر نہ تھے بلکہ ممالکِ اسلامی کی حکومت نے انہیں دینِ اسلام سے آشنا کردیا تھا اور اِن میں سے بہت لوگ مسلمان ہوگئے تھے۔ اس فوج کا سردار عبداللہ بھی ہلاکو خاں کا نواسہ، مگر ایک نومسلم مُغل بادشاہ کا مسلمان بیٹا تھا۔ لہٰذا جلال الدّین خلجی یقینِ کامیابی کے باوجود، مصالحت پر آمادہ ہوگیا اور ایک مُغل سردار الغو خاں کو مسلمان کرکے اُس کے ساتھ بخوشی اپنی بیٹی بیاہ دی۔ اُسی کی تقلید میں اور بہت سے مغلوں نے اسلام قبول کیا اور دہلی میں آکر بس گئے [1] (۶۹۱ھ)۔

اس عرصے میں جنوبی مالوے کی شورش سلطان کے بھتیجے اور داماد ملک علاء الدّین خلجی (حاکم کڑہ) نے فرو کی اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر دربار میں حاضر ہُوا اسی مہم کے دوران میں اُس نے قلعہ دیوگیر (یا دیوگیری موجودہ دولت آباد) کی دولت کے قصّے سنے اور وہ دل ہی دل میں اُس پر حملہ کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ اِدھر سلطان کی بیوی (یعنی اپنی ساس) کی بدسلوکی نے اُسے ہندوستان میں رہنے سے دل برداشتہ کردیا تھا غرض مختلف اسباب ایسے جمع ہوئے کہ کڑے پہنچ کر اُس نے دو ہزار پائک اور تین چار ہزار چیدہ

علاء الدّین کی یورش دکن پر

[1] فرشتہ نے اِس فوج کی تعداد سات آٹھ ہزار سوار بتائی ہے (صفحہ ۹۹)

سواروں کا ایک مختصر لشکر فراہم کیا اور چندیری کی تسخیر کے بہانے، جس کی سلطان سے اجازت مل گئی تھی، وسطِ ہند کے جنگلوں میں گھس گیا۔ راستے میں جو ریاستیں ملیں کسی کے راجہ نے اس کی مزاحمت نہ کی نہ وہ کسی سے الجھا اور ایلچپور ہوکر یکایک دیوگیر پہنچ گیا۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب، دیوگیر کے چھوٹے سے پہاڑی قلعے کے گرد اس وقت کوئی فصیل یا خندق بنی ہوئی نہیں تھی[1]۔ میدان کی دونوں لڑائیوں میں کثرتِ تعداد کے باوجود اہل دکن کو شکست ہوئی۔ راجہ کو اضلاعِ ایلچپور کے علاوہ بے شمار مال غنیمت دل کی نذر کرنا پڑا جس میں ایک ہزار من چاندی[2]، سو من سونا، سات من موتی اور دو من جواہرات شامل تھے۔ قیمتی لباس اور دیگر اجناس اتنی ملی تھیں کہ ان کی تفصیل دشوار ہے "و عقل نیز از تصدیقِ آن ابا دارد[3]"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۲ اور ایک ہمعصر مؤرخ صاحب "ملحقات طبقات ناصری" کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مندرجۂ بالا قول برنی کا ہے (صفحہ ۲۲۲) جس کا چچا علاء الملک اس وقت کڑے میں موجود اور علاء الدین کا ہمراز تھا۔ اور چلتے وقت اسی کو علاء الدین نے اپنے صوبے کا نائب بنایا تھا۔

[1] فرشتہ، صفحہ ۹۵۔

[2] اس من سے غالباً وہ من مراد ہے جس میں جواہرات تُلتے تھے اور جو قدیم میں دو رطل یعنی موجودہ ایک سیر کے قریب ہوتا تھا۔

[3] فرشتہ صفحہ ۹۵

جلال الدین کا قتل۔

مسلمانوں کا دکن پر یہ پہلا حملہ تھا۔ لیکن اُن کی مرکزی حکومت کو دہلی ایک طرف اس حملے کی اطلاع تک نہ تھی البتہ جب علاء الدین واپس روانہ ہوا تو فتح سے بڑھکر اُس کے بے حساب مال غنیمت کی سارے ملک میں شہرت ہوگئی۔ دربار دہلی کے ہوشمند اُمرا نے تو یہ خبر سنتے ہی پیشین گوئی کردی تھی کہ علاء الدین کے پاس اِس قدر زرو جواہر کا جمع ہوجانا آیندہ فساد و بغاوت کی تمہید ہے۔ لیکن بوڑھے سلطان کو اس قسم کا کوئی فکر نہ تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ بہت جلد اس کا بھتیجا تمام غنائم کو اُس کے سامنے لاکر پیش کردے گا جیساکہ مالوے کی مہم کے بعد اُس نے کیا تھا۔ علاء الدین کے خطوط سے بھی اِس یقین کو تقویت ہوی۔ لیکن کڑے پہنچ کر جب اُس نے کبھی دراندازوں کی مخالفت کبھی عتابِ شاہی کا خوف کبھی کثرت باراں کا عذر کیا، نیز اُس کے تازہ لشکر فراہم کرنے اور لکھنوتی پر فوج کشی کے ارادے کی افواہیں پایۂ تخت میں پہنچیں تو اُس وقت تمام اہل الرّائے پر اُس کی نیّت کا فساد ظاہر ہوگیا۔ بایں ہمہ جلال الدّین کو زعم تھا کہ وہ بھتیجا جسے خود میں نے پالا اور بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا ہے، کبھی میرے ساتھ برائی نہ کرے گا۔ البتہ دیوگیر کے جواہرات کی اُسے لَو لگی ہوی تھی اور اِسی لئے

بار بار بھتیجے کو اشتیاق آمیز خط لکھکر دہلی بلاتا تھا ؛ عجب نہیں کہ علاء الدین بھی اِس شوقِ ملاقات کی اصلی وجہ کو سمجھ گیا ہو شاید اسی بنا پر اُس نے اپنے بھائی الماس بیگ کو دہلی خط لکھا اور پائے تخت آنے میں اندیشۂ جان اور بہت سی مجبوریاں ظاہر کرنے کے ساتھ یہ بات بھی جتادی کہ اِس موقع پر اگر خود سلطان معمولی جمعیت ہمراہ لے کر کڑے آنے کی زحمت گوارا کریں تو دیوگیر کے تمام غنائم بے تأمّل اُن کی خدمت میں پیش کردئے جائیں گے ! جلال الدین دھوکے میں آگیا اور کثرت بارش کے باوجود گنگا کے کنارے (مقام ڈھمائی موجودہ ڈبائیں ہے) سے کشتی میں سوار ہوکر چند روز میں کڑے آپھنچا ؛ سامنے کے کنارے پر علاء الدین اپنی تمام فوجی جمعیت کے ساتھ استقبال کو آیا تھا۔ عصر کے بعد روزہ دار سلطان کا بجرا کنارے پر لگا ، بھتیجے نے اُترتے ہی جھک کر قدم لئے مگر عین اس وقت کہ بوڑھا چچا ہاتھ میں ہاتھ لئے محبت و اخلاص کی باتیں کر رہا تھا ، خونیوں نے گھات سے نکل کر حملہ کیا۔ جلال الدین ہاتھ چھوڑ کر یہ کہتا ہوا اپنے بجرے کی طرف دوڑا کہ "اے علائے بدبخت چہ کردی" لیکن حملہ آوروں نے دریا تک پہنچنے کی مہلت نہ دی اور گرا کر اُس کا سر

کاٹ لیا[1] ماہ رمضان ۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء -

[1] اس عبرت ناک واقعے کو تمام فارسی مؤرخوں نے قریب قریب اسی طرح لکھا ہے اور علاء الدین اور اُس کے ساتھیوں پر سخت لعنت و نفرین کی ہے ۔ خاص کر برنی نے کئی صفحے اظہار رنج و غضب میں بھر دیئے ہیں (ص ۲۳۵ وغیرہ)، لیکن خاص کڑے کے لوگوں میں اس سے مختلف روایت مشہور ہے جس میں جلال الدین پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ خود وہ بھتیجے کو مارنے یا قید کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ مگر یہ روایت کچھ قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی ہے۔

ضمیمہ باب پنجم

طوطئ ہند امیر خسرو رح

سلطان شمس الدین ہی کے عہد میں فارسی کے بہت سے قادر الکلام شعرا دربار دہلی میں جمع ہوگئے تھے جن میں امیر روحانی اور ناصری زیادہ مشہور ہیں، پھر شہاب مہمرہ بداؤنی عمید تولکی اور شمس الدین دبیر کا دور آیا جن کے جستہ جستہ حالات اور اشعار اس عہد (ساتویں صدی ہجری) کی تصانیف اور نیز بعد کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ امیر خسرو رح نے بھی اپنی تصانیف میں ان کی مدح و ثنا کی ہے اور حق یہ ہے کہ انکا عمدہ کلام، چند خاص اساتذہ کے سوا دیگر شعرائے ایران کے کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا لیکن ملا عبدالقادر کے بقول[1] سورج کے بلند ہوتے ہی جو حال ستاروں کا ہوجاتا ہے ... وہی کلامِ خسرو رح کے سامنے ان کا ہوا یعنی سب ماند پڑکر رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے اور اُن کے

[1] منتخب التواریخ صفحہ ۷۱۔ ان سب شعرا کا منتخب کلام بھی ملا صاحب نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے اور غالباً ان کمیاب اشعار کے ایسے اچھے نمونے اور کسی کتاب میں مشکل سے ملیں گے۔ (دیکھو منتخب التواریخ جلد اول، صفحات ۶۵، ۷۱، تا ۸۳ و ۹۴ تا ۱۲۷)

کلام کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہے جو اس زمانے تک بہ شکل باقی رہ گیا ہو۔
امیر خسرو رح کے والد امیر سیف الدین مضافات بلخ سے ترک وطن کرکے
ہندوستان کے ایک گاؤں پٹیالی (یا مومن آباد) میں آ بسے تھے، جو
اُن دِنوں صوبۂ بداؤں میں داخل تھا۔ یہیں غالباً ۱ھ۶۵۱ کے اخیر میں
یہ جامع کمالات بزرگ پیدا ہوئے جن کے مولد ہونے پر ملک ہند جتنا
فخر کرے بجا ہے۔ مگر لڑکپن میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا اس لئے آئندہ

۱ انگریزی زبان کی سب سے تازہ اور مستند تاریخ "اوکسفورڈ ہسٹری آوف انڈیا" (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) کے فاضل مؤلف ونسنٹ اسمتھ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ عہد بلبن میں فتنۂ مغول کے خوف سے جو بادشاہ اور شہزادے اپنا وطن چھوڑ کر دہلی میں پناہ گزین ہوئے، اِن کی "ملازمت یا مصاحبت میں بہت سے ادیب بھی تھے جن میں امیر خسرو شاعر سب سے زیادہ مشہور ہیں" (صفحہ ۲۲۹) سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل مؤلف نے جبکہ امیر صاحب رح کی ولادت اور حالات زندگی سے واقفیت بہم پہنچانیکی تکلیف گوارا نہیں کی، تو اِن کی نسبت یہ آدھی سطر لکھنی بھی کیا ضرور تھی ؟ یہاں اتنی صراحت اور کردینی چاہیئے کہ امیر صاحب رح کے والد سلطان شمس الدین کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور اُن کا اُن "پندرہ شہزادوں" سے کوئی خاص تعلق نہ تھا جو دربار بلبن کی زینت بڑھاتے تھے ۲ امیر صاحب کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ قران السعدین کے ایک شعر سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ۶۵۲ھ میں پیدا ہوئے لیکن یہ صحیح نہیں اور تاریخ فرشتہ میں آپ کی عمر کے متعلق جو "هفتاد و چہار" لکھا ہے (جلد دوم - ۴۰۲) وہ بھی کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ورنہ آپ نے چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی جس کے ۷۲۵ھ میں کوئی اختلاف اور شبہ نہیں اور آپ کی لوح تربت پر جو قطعۂ وفات کندہ ہے اس سے بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت دہلی ہی میں ہوئی جہاں آپ کے نانا عماد الملک پائے تخت
کے عالی رتبہ اُمرا میں شمار ہوتے تھے؛ اسی شہر میں حضرت امیرؒ کو
سلطان نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور
حضرتِ موصوف کے ساتھ اُس ارادت و شیفتگی کی ابتدا ہوئی جو آج تک
ضرب المثل ہے؛ امیر خسروؒ نے بہت کم عمری سے شعر کہنا شروع کیا تھا
اور جوانی ہی میں اُن کے کلام کی شہرت ہوگئی تھی؎۱ شاید یہی سبب ہے
کہ ابتدا سے لوگوں میں وہ اپنے تخلّص "خسرو" سے مشہور ہو گئے
ورنہ اصلی نام "ابوالحسن" تھا۔ باقی "امیر" اعزازی لقب ہے اور وہ
نسلاً خالص تُرک ہیں؛ اپنی شعر گوئی اور خاندانی وجاہت کی بدولت امیر صاحبؒ
جوانی سے اُمرائے دہلی کے طبقے میں روشناس ہوگئے تھے اور شہزادۂ محمدؒ کے
وقت سے محمدؒ تغلق کے ابتدائی عہد تک شاہانِ دہلی کے محبوب و ممتاز
مصاحب رہے۔ اس تعلّق سے انہیں دربار کے اندرونی حالات اور تاریخی
واقعات معلوم کرنے کا نہایت عمدہ موقع مل گیا اور اُن کے کلام کا معتدبہ
حصّہ تاریخی منزلت رکھتا ہے۔ چنانچہ سر ہنری الیٹ نے اپنی تاریخ ہند
مرتّب کرتے وقت امیر صاحبؒ کی "تاریخ علائی" (یا خزائن الفتوح)
کے ساتھ بڑی محنت سے اُن کی تاریخی مثنویوں کے بعض حصّوں کا بھی
انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تاریخی حیثیت سے امیر خسروؒ
کے بیان کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ جن واقعات کا وہ
ذکر کرتے ہیں، اُن میں نہ صرف خود موجود تھے بلکہ اکثر معاملات میں

؎۱ چنانچہ آپ کے پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" میں ۱۶ سے ۱۹ برس کی عمر
تک کا کلام جمع کیا گیا تھا؛

اُن کی شرکت بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دوست مورخ ضیاءالدین برنی اپنے قول کی تصدیق کے لئے جا بہ جا امیر صاحب رح کو گواہ بناتا ہے۔[1] امیر صاحب رح کے مجموعۂ کلام کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے کُل اشعار کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہے۔[2]

نثر میں جو کتابیں لکھیں وہ اسکے علاوہ ہیں اور ان میں خزائن الفتوح، انشائے خسروی، اور چہار درویش (فارسی) بہت مشہور ہیں۔ لیکن امیر صاحب رح کی اصلی ناموری اُن کی شاعری پر مبنی ہے اور غزل گوئی میں وہ اور اُن کے محبوب دوست میر حسن دہلوی سعدی شیرازی کے سب سے اچھے جانشین مانے گئے ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان صاحبوں کے تھوڑے عرصے بعد ہی خاک شیراز نے ایسا شخص پیدا کیا کہ دنیا کا کوئی شاعر آج تک غزل گوئی میں اُس کا مد مقابل نہ ہوا اور اُس کے سامنے سب قدما کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بایں ہمہ ہندوستان کے یہ دونوں شاعر فارسی اساتذہ کی صف اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ پنج گنج خسرو۔ (یعنی وہ پانچ مثنویاں جو خمسہ نظامی رح کے جواب میں لکھی گئی تھیں)، اور تین تاریخی مثنویاں، یعنی قران السعدین، خضر خان، دول رانی اور نہ سپہر نیز مطلع الانوار فارسی نظم کی نہایت بلند رتبہ تصانیف ہیں اور حال میں انہیں مدرسۃ العلوم علی گڈھ کیطرف سے

[1] الیٹ جلد سوم، صفحہ ۶۹، نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ جلد مذکور۔

[2] تاریخ فرشتہ، صفحہ ۴۰۲، الیٹ جلد سوم صفحہ ۵۲۳ بحوالہ کوول۔ وغیرہ۔ صاحب تذکرہ آتشکدہ اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک لاکھ شعر خود میری نظر سے گزرے ہیں۔ (حیاتِ خسرو، صفحہ ۸۷)۔

خاص اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کیا گیا ہے۔ دیگر فارسی اساتذہ کے مقابلے میں امیر خسروؒ کی مثنوی کے حسن و خوبی پر بحث کرنے کا محل نہیں ہے۔ مشرق اور حال میں مغرب کے نقاد اس مبحث پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ امیر صاحبؒ ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں اور اُن کا نام نامی اس فہرست میں داخل ہے جس میں فردوسی، نظامیؒ اور جامیؒ جیسے سحر بیان شعرا کا نام آتا ہے۔ اب یہ انفرادی ذوق کی بات ہے کہ بعض نقاد ان میں سے کسی ایک اُستاد کو باقی پر ترجیح دیں ورنہ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ مسلم الثبوت شاعر اور اپنی طرز میں سب سے اچھا سخن طراز ہے۔

فارسی کی طرح امیر خسروؒ عربی، ترکی اور ہندی میں بھی عمدہ اور بے تکلف شعر کہہ سکتے تھے اور اصناف شعر میں صاحب ایجاد ہونیکے علاوہ فن موسیقی میں بھی اُن کو ایک مجتہد کا مرتبہ حاصل ہے۔ تصوّف کے اعتبار سے وہ خاندان چشتیہ کے محترم رکن مانے جاتے ہیں اور اُن کی دینداری اور تقویٰ کی بہت سی روایتیں کتابوں میں محفوظ ہیں۔ مگر شاید اُن کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ملک ہندوستان سے دلی محبت رکھتے ہیں اور یہاں کی ہر چیز خاص کر ہندی زبان کی جابجا اُنھوں نے تعریف و حمایت کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ نووارد مسلمانوں کے دل میں سب سے پہلے جس ادیب نے ہندوستان کی وطنیت اور محبت کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کی وہ امیر خسروؒ ہیں

اور معلوم ہوتا ہے کہ انہی کے فیض صحبت سے یہ جذبہ اُن کے ہمعصر مصنفوں میں بھی پیدا ہوگیا تھا۔ خود امیر صاحب رح ہندی زبان کو سلمانوں میں پھیلانے کے جس قدر خواہاں تھے، اُس کا سب سے اچھا ثبوت اُن کی مشہور کتاب "خالق باری" ہے۔ یوں بھی وہ اپنی تصنیفات میں کہیں کہیں ٹھیٹھ ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور اُن کے بعض اشعار میں آدھے مصرعے ہندی کے نظر آتے ہیں۔

میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرۂ شعرا میں نیز بعض دیگر مصنفوں نے زبانِ اردو (یا ریختہ) کا سب سے پہلا شاعر بلکہ موجد امیر خسرو رح کو تسلیم کیا ہے اور دو شعر بھی اُن سے منسوب کئے ہیں جنہیں "اردو" کہنا غلط نہیں۔ لیکن یہ لکھنے کی شاید ضرورت نہیں کہ مستقل زبان کی حیثیت سے اس وقت تک "اردو" نے جنم نہیں لیا تھا اور اس لئے امیر خسرو رح کے ہندی آمیز اشعار کو اُن کی شاعرانہ جدت یا محض تفنن سمجھنا چاہیئے۔

امیر صاحب رح کا انتقال ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں ہوا اور اپنے محبوب مُرشد سلطان نظام الدین رح کے قریب ہی اُن کا مدفن بھی آج تک زیارت گاہ مشتاقان بنا ہوا ہے۔ اُن کے دو سال بعد میر حسن دہلوی نے وفات پائی۔ ملا عبدالقادر کے بقول وہ اس وقت دولت آباد (دکن) میں تھے، وہیں دفن ہوئے*۔

"آں دو طوطی کہ بہ نو خیزئ شاں | بود در ہند شکر ریزئ شاں
آخرش سخرۂ افلاک شدند | خامشانِ قفس خاک شدند!" جامیؔ

* مخدومی مولوی غلام یزدانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ خلد آباد کے جنوبی دروازے کے باہر جنوب مغرب میں کوئی چار سو قدم کے فاصلہ پر میر حسن رح کا مزار ہے۔

باب ششم

سلطنت دہلی کی انتہائی وسعت

۱۔ فتوحات گجرات و دکن۔

ممالک گجرات و دکن کا سلطنتِ دہلی سے الحاق، آیندہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اِن دونوں ملکوں کی سرحد تک مسلمانوں کے قدم پہلے پہنچ چکے تھے، اور سلطان محمود کے حملۂ سومنات سے قطع نظر، قطب الدین ایبک کے زمانے میں نہروالہ (انہلواڑہ) پائے تخت گجرات پر، حکومت دہلی کا مستقل قبضہ ہوگیا تھا۔ (صفحہ ۱۱۹) علاء الدین خلجی نے شمالی دکن پر جو یلغار کی اور دیوگیری کے راجہ سے اطاعت گزاری کا اقرار لیا، اس کا حال بھی اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ حملہ محض ایک ہنگامی تاخت تھی اور اگر تقدیر علاء الدین خلجی کو تخت دہلی کا مالک نہ بنادیتی تو شاید

اِس حملے کا ذکر بھی تاریخ سے محو ہو جاتا۔ اسی طرح نہروالہ کی تسخیر کے باوجود جزیرہ نمائے گجرات پر مسلمانوں کا تسلّط نہیں ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اکیلے شہر پر بھی اسلامی حکومت غالباً زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ گجرات کے شاداب علاقے سے قطع تعلّق ہوتے ہی اس کے ہر طرف راجپوتانے کا ویران ریگستانی علاقہ رہ گیا اور حکومت دہلی کے لئے یہ بات نہایت دشوار ہوگئی کہ وہاں کوئی بڑی چھاونی بنا کر اُسے اپنے دوسرے مقبوضات سے کمک پہنچانے کا انتظام کردیتی، پس گو کہیں صراحت کے ساتھ تحریر نہیں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدّین کے بعد ہی اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلانا پڑا اور اس شہر پر بھی گجرات کے ہندو راجاؤں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تھا۔

فتح گجرات ۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء

انہلواڑے کی طرح، مالوے کے شہروں پر بھی اسلامی حکومت پوری طرح قایم نہ ہوئی تھی، اور جنوبی راجپوتانے پر تو کبھی سابق سلاطین دہلی نے فوج کشی ہی نہیں کی کیونکہ یہ صحرائی علاقے نہایت گرم و دشوار گزار تھے۔ لیکن سلطان علاء الدّین خلجی گجرات اور مالوے کے شاداب اور زرخیز صوبوں کے مستقل الحاق کا تہیّہ کرچکا تھا اور دہلی کے جنگجو مدبّروں سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ جب تک جنوبی راجپوتانے

کے مستحکم پہاڑی قلعے فتح نہ ہوں گے یا وہاں کے دلیر و آزاد قبایل پر سلطنت دہلی کی سطوت کا نقش نہ بیٹھ جائے گا، اُس وقت تک مذکورۂ بالا ممالک پر اطمینان و استقلال کے ساتھ حکومت کرنی دشوار ہوگی۔ پس اگرچہ گجرات کو مسلمانوں نے علاءالدین کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہی فتح کرلیا اور وہاں کے راجہ کو بھگا کر[1] اپنا قبضہ جمالیا تھا (۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء) لیکن اس کی تکمیل اور مضبوطی کے لئے وہ آیندہ چھ سات برس تک راجپوتانے میں شمشیر زنی کرتے رہے اور چتوڑ کی تسخیر (۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء) سے پہلے انہوں نے مالوے کے الحاق کی کوشش نہیں کی۔

دراصل جنگی دشواریوں کے علاوہ، ان فتوحات میں تاخیر کی ایک وجہ تو بادشاہ کی غیر ہردلعزیزی تھی کہ وہ نہایت سخت گیر اور جابر سپاہی تھا اور حصولِ مقصد کے لئے — بعض سلاطین (۱) علم ناواقفی

[1] گجرات کا راجہ رائے کرن بھاگ کر دیوگیری چلا گیا تھا اور پھر غالباً وہیں کے راجہ کی اجازت سے بگلانہ میں حکومت کرنے لگا۔ بگلانہ دریائے تاپتی کے جنوب میں شمال مغربی دکن کے اُس پہاڑی خطے کو کہتے تھے جو عرض میں ۱۶۰ اور طول میں ۲۰۰ میل کے قریب تھا اور یہاں کے نیم آزاد زمینداروں پر کبھی راجہ گجرات اور کبھی راجہ دیوگیری کی حکومت رہا کرتی تھی (دیکھو گزیٹیر، جلد ششم صفحہ ۱۹۱) رائے کرن کی اسی فراری میں اُس کی رانی کھولا دیوی گرفتار ہوکر دلی آئی۔

بالعموم تشدّد سے کام لیتا تھا۔ مگر اس سے بھی
بڑھکر ایک سبب جو بیرونی فتوحات مین مانع آتا رہا
بلکہ بعض اوقات اس نے بہت خطرناک صورت اختیار
کرلی، مغلوں کے پیہم حملوں کو سمجھنا چاہیئے کہ انھی آٹھ
دس برس میں انہوں نے کم سے کم چھ مرتبہ نہایت وسیع
پیمانے پر فوج کشی کی اور کئی مرتبہ پائے تخت دہلی تک
بڑھ آئے۔

علاءالدین خلجی نے جیسی سنگدلی کے ساتھ اپنے چچا
اور ولی نعمت کو قتل کرایا اس نے لوگوں کو قدرتی طور
پر اس سے متنفّر کردیا تھا اور ہم عصر مورّخ نے اُسکے
حال میں جو کچھ تحریر کیا ہے اُس کے ہر ورق سے
بیزاری ٹپکتی ہے۔ درحقیقت، اگر جلال الدین خلجی کی بیوہ،
ملکۂ جہاںؔ کی جلدبازی اور خود رائی سے دہلی میں اُسکے
چھوٹے بیٹے کی بادشاہی کا اعلان نہ ہوجاتا اور جلال الدّین
کا بڑا بیٹا ارکلی خاں، مُلتان سے پائے تخت پہنچ جاتا،
تو علاءالدین کو کڑے سے دہلی کی طرف بڑھنے کی جرأت
بھی نہ ہوتی۔ لیکن مذکورۂ بالا اعلان کی خبر سُنکر ارکلی خان
جس کی شجاعت و لیاقت مسلّمہ تھی، اپنی ماں سے
ناراض ہوگیا اور دلّی کا سفر ملتوی کرکے ملتان ہی میں
رُک گیا۔ اور ادھر یہ اطلاع ملتے ہی علاءالدّین کو،
جو لکھنوتی کی طرف چلے جانے کا ارادہ کررہا تھا، تخت دہلی

لینے کی امید ہوگئی اور وہ پایۂ تخت کی جانب اس شان سے چلا کہ:-

"خزانہ ریز شد منزل بہ منزل ۔ بہ زر کردہ کلید کار مشکل
بہر منزل زپیشِ تخت تا دُور ۔ فشاندے گنجہا بے منعِ گنجور
چو بادہلی فتاد از فتح کارش ۔ گرفت از منجنیقِ زرحصارش"

اور یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ اسِ کُوچ میں ایک چھوٹی منجنیق سے کئی سیر سونے کے پھول ("اخترِ زر") روزانہ علاء الدین پر سے نچھاور کئے جاتے تھے اور جو لوگ اس کی فوج میں بھرتی ہوتے انہیں صدہا روپیہ بطریق انعام تقسیم ہوتا رہتا تھا۔[1]

جلال الدین کے اہل عیال کا حشر

اس طرح دکن کا بے حساب خزانہ لٹاتا ہوا جب وہ بداؤں پہنچا تو ایک لشکر کثیر اس کے ساتھ ہوگیا تھا اور اسِ زرپاشی نے عوام الناس ہی کو نہیں بلکہ عمائدینِ دہلی کو بھی رام کرلیا۔ یہ لوگ علاء الدین کے شرمناک جُرم پر اسے نفرین کرتے تھے لیکن ملکۂ جہاں اور اس کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کی بادشاہی سے بھی رضا مند نہ تھے۔ لہذا پایۂ تخت سے جو فوج لڑنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس کے بعض سردار بطور خود اور اکثر روپیہ لے کر

---

[1] برنی، صفحہ ۲۴۴۔ نیز دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۰۱، طبقات اکبری وغیرہ امیر خسرو کی نظم و نثر میں بھی کئی جگہ ان واقعات کا ذکر آیا ہے۔

علاء الدین کے ساتھ جا ملے اور پانی کا زور کم ہوتے ہی وہ جمنا اُتر کر دہلی کے سامنے پہنچ گیا۔ ابراہیم پہلے دن لڑنے نکلا تھا، مگر بہت کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ اپنی ماں اور بیوی بچوں کو لے کر اسی رات ملتان کی طرف فرار ہوگیا۔

علاء الدین کی تخت نشینی کی رسم ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء کے آخری مہینے میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ عیش وطرب کے جس قدر سامان ممکن تھے، کمال دریا دلی سے مہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر لوگوں کی مہمانی اور مدارات کا اہتمام ہوا۔ قدیم عماید و اُمرا کے مناصب و جاگیرات میں اضافے ہوئے۔ مستحقین کو بہت سا روپیہ صدقہ و خیرات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقے کے افراد کو حسب مراتب اتنا انعام ملا کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالامال ہوگئے اور ان رنگ رلیوں میں انہیں یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ جس شخص کی اطاعت گزاری کا آج حلف اٹھا رہے ہیں، اسی کو چند روز پہلے صلواتیں سنایا کرتے تھے[۱]! سلطان مقتول کے ورثہ کی جانب سے

---

[۱] "و خلق را استقبال ہائے تازہ فرمود و خلق چنان فریفتۂ زر گشت کہ نام قبح فعلِ سلطان علاء الدین و کفران نعمتِ او بر زبانِ کسے نمی رفت۔ و از ذوقِ گرفتنِ زر، مردمان را پروائے ہیچ کارہ نماندہ بود" برنی صفحہ ۲۴۸۔

جو خلش علاء الدین کے دل میں تھی، وہ بھی بہت جلد دفع ہوگئی اور دلی سے جو سردار اُن کے تعاقب میں روانہ کئے گئے تھے وہ کامیاب واپس آئے۔ یعنی گو ملکۂ جہاں، اُس کا چھوٹا بیٹا اور دوسرے عزیز و رفیق، ارکلی خاں والئی ملتان کے پاس پہنچ گئے تھے لیکن جب تعاقب کرنے والی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کیا، تو حکومتِ دہلی کی صدارت و مرکزیت کا ملک میں اتنا اثر قایم ہوگیا تھا کہ، خود اہلِ مُلتان "افواج سلطانی" کے خلاف لڑنے سے انکار کرنے لگے اور آخر میں جان بخشی کے وعدے پر ارکلی خاں کو اطاعت قبول کرنی پڑی[1] بادشاہ نے اس "وعدے" کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن جلال الدین کے بیٹوں اور دامادوں کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا کر عمر بھر کے لئے ہانسی کے قلعے میں محبوس کردیا!

(۳) عہدِ علائی کے مغول

مُلتان کی یہ مہم سلطان کے بھائی الماس بیگ الملقب بہ اُلغ خاں اور ملک ہزبر الدین ظفر خاں نے سر کی تھی اور یہی علاء الدین خلجی کے سب سے بہادر و معتمد علیہ سپہ سالار تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں (۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء) جب اطلاع ملی کہ مغلوں نے فتح پنجاب کے ارادے سے بڑے اہتمام کے ساتھ فوج کشی کی اور دریائے سندھ کو عبور کرلیا ہے تو یہی دونوں سردار مقابلے کے لئے بھیجے گئے اور انہوں نے

---

[1] برنی صفحہ ۲۴۹ - فرشتہ صفحہ ۱۰۲ وغیرہ -

حملہ آوروں کے ٹڈی دل کو جالندھر سے آگے بڑھکر روکا۔ مغلوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے اور غالباً ابھی تک اُن کی اتنی بڑی فوج سے اہل دہلی کھلے میدان میں نہیں لڑے تھے۔ لیکن اُن کی جو ہیبت چھائی ہوئی تھی، بلبن کے زمانے سے اس میں بہت فرق آگیا تھا۔ اسی بادشاہ کی کوشش اور فوجی تنظیم کی بدولت ہندوستان کی سپاہ فنونِ سپہ گری، جنگی مستعدی اور قواعددانی میں شاید کسی معاصر قوم سے کمتر نہ رہی تھی اور جنگ کے نتیجے نے ثابت کردیا کہ سرداروں کی قابلیت اور سپاہیوں کی جانبازی کے اعتبار سے بھی اہل ہند کو اپنے حریفوں پر برتری تھی۔[1] فرشتہ کی روایت کے بموجب تقریباً بارہ ہزار مغل سپاہی مارے گئے اور انہیں سخت شکست ہوئی ہے۔

اس کامیابی نے علاءالدین کے حقِ فرماں روائی کو نہایت قوی کردیا اور اب اُس کے نئے وزیر **نصرت خاں** جلیسری نے امرائے جلالی سے وہ روپیہ واپس وصول کرنا شروع کیا جو علاءالدین کی آمد کے وقت بطریقِ رشوت انہیں دیا تھا۔ اِس میں قدیم اُمرا پر بڑی بڑی سختیاں ہوئیں طبقۂ اعلیٰ کے بہت کم خاندان ایسے تھے جو نصرت کے جبروتشدد سے محفوظ رہے ورنہ اکثر قدیم اُمرا کا مال واسباب

[1] برنی صفحہ ۲۴۹۔ فرشتہ کی روایت کسی اور تاریخ سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے اُسنے لڑائی کا مقام "حدود لاہور" ورواقعات زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔(صفحہ ۱۰۲)

اور جاگیریں چھین لی گئیں اور بعض کو نہایت سخت سزائیں دی گئیں جس کی وجہ سے نہ صرف نصرت خاں، بلکہ خود بادشاہ سے طبقۂ امرا میں دوبارہ بیزاری پیدا ہوگئی ہے مگر بادشاہ کو فوجی تیاریوں کے لئے روپے کی ضرورت تھی ۔ بدنامیوں کی اُس نے کچھ پروا نہ کی اور بہت جلد ایک بڑی فوج مرتّب کرکے گجرات روانہ کی جس کے اُلغ خاں اور نصرت خاں سپہ سالار تھے ۔ گجرات (نیز **کھمبایت**) کی فتح کے علاوہ جسکا اجمالاً پہلے ذکر آچکا ہے، اس حملے میں بہت سا مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اور اسی میں وہ خواجہ سرا، "**مانک**" یا **ملک کافور** (ہزار دیناری) بھی تھا جو چند سال بعد فاتحِ دکن کی حیثیت سے عہد علائی کا سب سے نامور سپہ سالار ہوا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

اس فتح کے ساتھ رائے کرن کی ریاست سلطنت دہلی کا جزو بن گئی لیکن معلوم ہوتا ہے گجرات کے شمال مغربی اضلاع نیز کچھ پر مسلمانوں کا پوری طرح عمل دخل نہیں ہوا[1] اور نہ وہ ابھی تک راجپوتانے کی اُن ریاستوں کو فتح کرسکے جو پہلے سے آزاد تھیں یا محکوم ہونے کے بعد دوبارہ آزاد ہوگئی تھیں ۔ فتح گجرات کی اس تکمیل میں دیر کا سب سے قوی سبب، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، مغول کے

---

[1] یہ قیاس حال کی تحقیقات پر مبنی ہے کیونکہ ہمعصر فارسی تاریخوں میں اس کے متعلق کافی صراحت نہیں کی گئی ۔ (دیکھو امپی ریئل گزیٹیر جلد یازدہم صفحہ ۸۸، ہسٹوریکل اٹلیس آف انڈیا صفحہ ۱۰ بحوالۂ بمبے گزیٹیر وغیرہ ۔

حملے تھے، جنھوں نے اسی زمانے میں پہلے سندھ اور پھر
براہ راست پائے تخت دہلی پر دوبارہ فوج کشی کی تھی (۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء)
ان میں سے پہلی مرتبہ اُنھوں نے شمالی سندھ کے بعض
قلعوں پر قبضہ کرلیا تھا، وہیں ظفر خاں نے انھیں شکست دی
اور گھیر کر بڑے بڑے سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ لیکن اس کے
بعد ہی ماوراء النہر کے مغل شہزادے **قتلغ خواجہ** نے جس
وسیع پیمانے پر لشکر کشی کی اُس نے چنگیز خانی سیلاب کی یاد
کو تازہ کردیا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس دفعہ کی طغیانی میں
بلادِ ہند کی خیر نہ ہوگی تھے زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ
اس مرتبہ مُغل خونخوار قزاقوں کی طرح نہیں آئے بلکہ اس شان
سے بڑھ رہے تھے گویا خاص اپنے ملک میں سفر کررہے
ہیں۔ راستے میں اُنھوں نے کسی شہر کو تاراج و پامال نہیں کیا بلکہ
سیدھے دہلی تک چلے آئے اور شمال میں دریا کے کنارے
تک پہنچ کے تین طرف سے شہر کی ناکہ بندی کرلی تھی

یہی موقع ہے جس میں مختلف اقطاع کی سپاہ اور مضافاتِ
شہر کے پناہ گزینوں کی وجہ سے دہلی میں اتنے آدمی بھر گئے
کہ رہنے کی جگہ نہ ملتی تھی اور اجناس گراں ہوگئی تھیں۔
دوسرے مغلوں کی دلیری نے بعض اُمرائے دہلی کو
خوف زدہ کردیا اور اِن میں سے ایک نے خلوت میں
بادشاہ کو صلاح بھی دی کہ جس طرح ممکن ہو، روپیہ دے کر
اس بلا کو ٹال دیا جائے۔ لیکن علاء الدّین خلجی نے اس مشورے

کو قبول نہ کیا اور شہر پناہ کے باہر نکل کے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا؛ اور یہ فیصلہ محض جوشِ تہوّر کی بنا پر نہ تھا بلکہ فرشتہ کی روایت کے بموجب، شمار میں بھی دہلی کی فوج زیادہ تھی[1] اور اس کو لڑانے والے ظفر خاں، الغ خاں، رکن خان اور غازی ملک جیسے آزمودہ کار سپہ سالار تھے جنہوں نے پہلے بھی مغلوں کو شکست دی اور بڑے بڑے معرکوں میں نام کیا تھا۔

دہلی کی سب سے بڑی جنگ۔

مؤرخ فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے زمانے میں اسکے وقت تک "کہ تاریخ ہجری بہ ہزار و پانزدہ رسیدہ است" ہندوستان میں اتنی بڑی کوئی لڑائی نہیں ہوی کہ جس میں فریقین کی سپاہ پانچ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اور اس تاریخی شہادت میں اتنا اضافہ کردینا بے محل نہ ہوگا کہ اِس کے بعد بھی، پانی پت کی تیسری لڑائی کے سوا، تاریخ ہند میں اور کسی جنگ کا پتہ نہیں چلتا جس میں لڑنے والوں کا شمار مذکورۂ بالا تعداد کے قریب پہنچ گیا ہو؛ لیکن ہندوستان میں قدیم فنِ حرب کو اسلامی حکومت نے جو ترقی دی، اُس کی نظیر میں خاص طور پہ قابل ذکر بات نظر آتی ہے کہ دہلی کے حربی ماہروں نے ہندوستان کے جنگلی ہاتھیوں کو فی الواقع نہایت کارآمد شئے بنادیا تھا اور انہیں سوار فوج کے ساتھ لڑنے کے واسطے اس طرح سدھانے لگے تھے کہ پیل و اسپ کا متحدہ حملہ روکنا غنیم کو

[1] فوجِ مغل کا شمار سب نے دو لاکھ بتایا ہے مگر دہلی کی سپاہ میں بقول فرشتہ تین لاکھ صرف سوار تھے۔ (صفحہ ۱۰۴) نیز دیکھو برنی صفحہ ۲۵۴ وغیرہ۔

دشوار ہوجاتا تھا۔ واضح رہے کہ مغل حملہ آور اس "بلائے سیاہ" سے ناواقف نہ تھے اور اُن کی جرأت و گریز پائی میں بھی کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن جس وقت ظفرخاں، کہ شجاعت و قوت میں رستم عصر کہلاتا تھا، فوج میمنہ کو لیکر آگے بڑھا اور اُس کے جنگی ہاتھیوں کے خوفناک حملے کے ساتھ ہی سواران دہلی گھوڑے اڑاکر دشمن پر جاپڑے تو مغول کا بایاں بازو (یعنی میسرہ) اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ اُس کی صفیں ٹوٹ گئیں اور اُن کے پیچھے ہٹتے ہی ظفرخاں نے اس طرح گھیر کردبایا کہ وہ مغلوں کے قلب سے جُدا ہوکر دُور ہوتا چلاگیا۔ ظاہراً مغل سرداروں کی ساری کوشش اب یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو اس گھیرے سے اپنی صفیں نکال کر اصلی لشکر سے جاملیں لیکن ظفرخاں کے پیہم حملے انہیں صف بندی اور جم کر لڑنے کی فرصت نہ دیتے تھے۔ سوارانِ دہلی انہیں دھکیل دھکیل کر قتل کررہے تھے۔ اُن کا بہادر سپہ سالار ہر خطرناک مقام پر سب سے آگے نظر آتا تھا اور اس خونخوار شکاری کی شکل دیکھکر مغل سہمے جاتے تھے۔ دیر تک یہی صورتِ جنگ قائم رہی۔ عام روایت کے بموجب، مغلوں کی فوج کو ظفرخاں بھگاتا اور مارتا ہوا چھتیس ۳۶ میل تک پیچھے ہٹالایا اور ان کا بے حد نقصان ہوا۔ لیکن خود ظفرخاں کی آخر اپنے نڈرپن اور دلیری کی وجہ سے جان گئی اور وہ ایک جگہ غنیم کے نرغے میں گھر کر گھوڑے سے گرا اور آخری دم تک، پیادہ لڑتا ہوا

مارا گیا ہے۔[1]

بے شبہ ظفرخاں کی شمشیر زنی کا سکّہ بیٹھ گیا جیسے فارسی مورّخوں نے شاعرانہ آب وتاب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ مُغل سپہ سالار کو حریف کی کثرت سپاہ دیکھکر بھی اپنی فتح سے مایوسی ہوگئی۔ وہ راتوں رات دہلی سے تیس میل ہٹ گیا اور پھر جس قدر جلد ممکن ہوا لمبی لمبی منزلیں کرتا ہوا اپنی فوج کو ہندوستان سے واپس لے گیا۔ (۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء)

فتوحات راجپوتانہ

ہندوستان میں اس فتح نمایاں کی گھر گھر خوشیاں منائی گئیں سرکاری طور پر بہت دن تک خوشی کے جشن، عیش وطرب کے جلسے ہوتے رہے۔ حکومتِ علائی کی وقعت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور خود بادشاہ کے دل میں اپنی اقبالمندی دیکھکر نازوغرور کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ محض اَن پڑھ سپاہی زادہ تھا اور اگر اتنی بڑی سلطنت اور قوّت و ثروت پاکر خوشی میں آپے سے باہر ہوگیا، تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ ارباب دول کے خودغرض خوشامدی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں انہوں نے اور بڑھاوے دینے شروع کئے اور اور اب علاءالدّین کو نشے کی ترنگ میں دُور دُور کی سوجھنے لگی۔ چنانچہ کبھی تو وہ ایک نیا دین جاری کرنے کا منصوبہ باندھتا

[1] برنی نے اس لڑائی کے حالات خاصی تفصیل سے مگر بُری طرح بیان کئے ہیں (صفحات ۲۵۹ وغیرہ) اور بعد کی فارسی تاریخوں میں گھٹا بڑھا کے غالباً اسی کی عبارت کو نقل کردیا ہے۔

اور کبھی سکندر اعظم کی طرح ساری دُنیا کو فتح کرنے کی تدبیریں
سوچتا تھا۔ لیکن جب ہوش کی حالت میں بھی اسی قسم کے
کلمات اس کی زبان پر آنے لگے تو مصاحبوں نے سمجھایا کہ مذہب
جاری کرنا بادشاہوں کا کام نہیں، دوسری قسم کے لوگوں کا کام ہے۔
خُدا یہ خدمت اپنے برگزیدہ پیغمبروں سے (علیہم السلام) لیتا ہے
اور وہی اس کا پیام دُنیا کو پہنچاتے رہے ہیں اور عقاید اسلامی
کی بموجب حضرت **محمد مصطفیٰ** (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم الرسل ہیں کہ
وہی خدائی پیام (یعنی قرآن مجید) جو آپ کی معرفت دُنیا کو بھیجا گیا
ہے، خدا کے حکم سے ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اس میں کوئی
تحریف و تبدیلی نہ ہوگی۔ پس آن حضرت صلعم کے بعد کسی نئے
پیغمبر کی ضرورت نہیں اور خُدا کی طرف سے کوئی جدید مذہب
جاری نہ ہوگا۔ باقی رہا ساری دنیا کو فتح کرنا، تو مناسب یہ ہے کہ
اس قدر دشوار کام کا بیڑا اٹھانے سے پہلے سلطان ممالکِ ہند پر
تسلط حاصل کرے اور مالوے اور راجپوتانے کے وہ علاقے
جو آزاد ہیں، یا آزاد ہو گئے ہیں، انہیں حکومتِ دہلی کا مطیع
بنانے کے بعد، دوسری طرف متوجہ ہو۔

رنتھنبور و جھاین

یہ نصیحتیں سُن کر سلطان اپنی خام خیالی سے باز آگیا اور اُس
نے سب سے پہلے فتحِ رنتھنبور پر توجہ کی جس کے استحکام کا حال
کئی جگہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس فتح میں دشواریاں
دیکھکر ہی صلح پسند جلال الدّین محاصرے سے دست بردار ہو گیا تھا
اور ظاہر ہے کہ اس واقعے نے باغیوں کی ہمّت اور بھی مضبوط کر دی ہوگی

دوسرے رنتھمبور کے قریب[1] غالباً اسی زمانے میں ایک اور قلعہ جھاین بھی تعمیر ہوگیا تھا جس نے رنتھنبور کی جنگی قوت کو بڑھا دیا اور اس کی فتح پیشتر سے بھی زیادہ دشوار ہوگئی تھی چنانچہ پہلی مرتبہ جو فوج اُلغ خاں کی ماتحتی میں بھیجی گئی تھی (۶۹۹ھ) اُسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی اور خود سلطان کو تازہ فوج لیکر اُدھر جانا پڑا۔ علاءالدّین کے مقام جنگ تک پہنچتے ہی محاصرین میں نئی روح پیدا ہوگئی۔ جھاین اور جنوب مشرقی راجپوتانے کا قریب قریب وہ علاقہ جہاں آج کل بوندی اور کوٹہ کی ریاستیں ہیں، افواجِ دہلی کے قبضے میں آگیا۔ محصور قلعے میں دشمن کی آمد و رفت روکنے اور فصیلوں کو توڑنے کی کارروائی زور شور سے ہونے لگی۔ بایں ہمہ قلعے کی تسخیر میں بہت دیر ہوئی۔ بہادر راجپوتوں کے علاوہ رنتھنبور میں مسلمان مغلوں کا بھی ایک دستہ راجہ کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ در اصل یہ لوگ مہم گجرات میں لشکر سلطانی کے ساتھ تھے لیکن واپسی میں انھوں نے سپہ سالار اُلغ خاں سے بغاوت کی اور بھاگ کے رنتھنبور میں جا بسے تھے۔ آخر دو سال سے زیادہ عرصے کے محاصرے کے بعد دہلی کی فوج رنتھنبور میں گھس گئی اور سخت کشت و خون

[1] دیکھو الیٹ جلد سوم، حاشیہ صفحہ ۱۷۲۔ اب اس قلعے کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ مّلا عبدالقادر کے زمانے میں اسے "نوشہر" کہتے تھے (منتخب التواریخ صفحہ ۱۹۰) لیکن معلوم ہوتا ہے بعد میں وہ بالکل ویران و بے نشان ہوگیا۔

کے ساتھ قلعہ فتح کرلیا۔ (۷۰۲ھ ۱۳۰۲ء)[1]

لیکن اس تین سال کے دَوران میں چار فساد بپا ہوئے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ کم سے کم طبقۂ اعلیٰ کا ایک گروہ علاء الدّین سے بیزار تھا۔ اِن میں تین بغاوتیں تو خود بادشاہ کے بھتیجے بھانجوں نے کی تھیں مگر آخری فساد خاص پائے تخت میں ایک غلام نے بپا کیا اور کوتوال شہر کو مار کے ایک شخص کو جبراً تخت پر بٹھادیا۔ جس کا نسب ماں کی طرف سے سلطان شمس الدّین التمش تک پہنچتا تھا! مقامی حکّام نے یہ سب شورشیں خودہی فرو کرلیں اور سلطان کو رنتھنبور سے آنے یا فوج لانے کی بھی ضرورت نہیں پڑی لیکن یہ فکر ضرور پیدا ہوگیا کہ آئندہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ کسی کو ایسا فساد بپاکرنے کی جرأت ہی نہ ہو۔ برنیؔ لکھتا ہے کہ گو محاصرے کی کارروائی شد و مد سے جاری تھی مگر سلطان رات دن اپنے اُمرا سے جن کی اصابت رائے مشہور تھی اسی مسئلے کے متعلّق مشورے کرتا رہتا تھا۔ آخر بہت کچھ غور و بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت کی لوگوں کے ذاتی معاملات سے بے خبری، رعایا کی دولتمندی، شراب خواری اور باہمی قرابت و دوستی کے ذریعے امرا کی فرقہ بندی شورش

اندرونی فساد اور انسدادی قوانین

[1] سنہ میں کسی قدر شبہ ہے۔ (دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۰۸) لیکن ضیاالدّین برنی کے ایک فقرے سے ضمناً ثابت ہوتا ہے کہ یہ مہم تقریباً تین سال میں سرہوئی (برنی صفحہ ۲۷۹)۔

و سازش کے (چار) اصلی اسباب ہیں اور جب تک انہیں دور نہ کیا جائے گا، اُس وقت تک برابر فساد برپا ہونے کا اندیشہ رہیگا۔

یہ رائے صحیح تھی یا غلط، اِس میں شک نہیں کہ جب اُس کے مطابق بادشاہ کی طرف سے نئے نئے قوانین جاری ہوئے تو رعایا، خاص کر دولت مند طبقے کے بے کار افراد کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اول تو بہت سی جاگیریں، انعامات، معافیاں وغیرہ جو "زائد از ضرورت" سمجھی گئیں، سرکار نے ضبط کرلیں دوسرے زرستانی کے بعض نئے ابواب بڑھادئے گئے۔ پھر قماربازی، شراب خواری اور نیز نشے کی اور چیزوں کا استعمال خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ سلطان نے سب سے پہلے خود شراب خواری سے توبہ کی اور شاہی کارخانے میں میگساری کے جس قدر ظروف تھے، سب تُوڑوادئے۔ پھر شراب بیچنے اور پینے کی ایسی سخت سزائیں مقرر کیں کہ اگر یہ بُری عادت بالکل دُور نہ ہوسکی ہوتوکم سے کم مسکرات کی علانیہ خرید و فروخت ضُرور موقوف ہوگئی۔

اُمرا کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی تدبیریں نکالی گئیں اور غالباً اسلامی بادشاہوں میں علاء الدّین پہلا فرماں روا ہے جس کے عہد میں خفیہ پولیس یا جاسوسی کا ایک باضابطہ محکمہ بنا اور یہ طریقہ جاری ہوا کہ اُمرا بغیر بادشاہ کی اطلاع کے نہ باہم شادی

بیاہ کر سکتے تھے نہ زیادہ میل جول بڑھا سکتے تھے اور یہ مطلق العنان بادشاہی کی وہ شان تھی کہ آیندہ مُغل سلاطین کے عہد میں بھی ہمیں اس کا جلوہ نظر آئے گا۔[1]

مالگزاری و بندوبست

اسی ضمن میں محکمۂ مالگزاری کی بھی اصلاح کی گئی اور بہت سے پُرانے عہدہ دار جو رشوتیں لیا کرتے تھے، یک قلم برخاست کردئے گئے۔ پھر دواب سے دیا لپور تک اور جہاین سے لاہور تک تمام علاقے کی پیمائش اور تشخیص کی گئی۔ نائب وزیر ممالک شرف قائی نے جو اپنی قابلیت کے اعتبار سے "درچنیں مملکتے نظیرِ خود نہ داشت" خود ایک ایک گاؤں کی جمعبندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی محنت کے بعد چرائی اور مالگزاری کی رقوم معین کیں۔ ہر جگہ کے لئے تشخیص مالگزاری کا ایک اصول قرار دیا گیا تھا کہ کاشت کار سے نصف پیدا وار سرکار لیگی اور غالباً چرائی کے نام سے جو محصول (شیر آور) گائے بھینس پر لیا جاتا تھا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصول بہت سخت تھا اور مؤرخ کے الفاظ میں اس کے عملدر آمد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تمرد و عصیان و اسپ سوار شدن

[1] ضیاءالدین برنی نے ان واقعات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے (۲۸۲ تا ۲۸۹) لیکن کہیں کہیں شاعرانہ مبالغے کے علاوہ ہر جگہ اُسکی ذاتی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ "قوانین" ایسے نامعقول اور تکلیف دہ نہ تھے، جیسا کہ مؤرخ نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

و سلاح بردست گرفتن و جامۂ خوب پوشیدن و تنبول خوردن از چودھریاں و خوطان (؟) و مقدمان بکلّی برفت"، لیکن اگر یہ شہادت بے کم و کاست مان لی جائے تو بھی ایسے سخت قانون پر عملدر آمد ہونا[1] ملک میں ارزانی پیداوار اور پہلی دولتمندی کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر بادشاہ نے وہ دولت زمینداروں سے چھین کر اپنے خزانہ میں بھر لی تھی، تو بھی وہ ہندوستان ہی میں رہی اور زیادہ تر یہیں کی شاہی عمارات یا فوجی ضروریات میں خرچ ہوئی[2]۔

مہم دکن اور فتح چتوڑ۔

دوسرے درحقیقت اب حکومت دہلی نے گجرات و مالوہ کو صحیح معنی میں سلطنت کا جزو بنانے کا تہیّہ کرلیا تھا اور اس کے لئے جنوبی راجپوتانہ کی فتح مقدم شئے نظر آتی تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ رنتھنبور کے طویل محاصرے نے شاہی

---

[1] اس بندوبست اور مالگزاری کے نئے قوانین کے نفاذ کے لئے ملاحظہ ہو، برنی صفحہ ۲۸۸ وغیرہ

[2] ہندوستان کی "مستند" اور تازہ ترین انگریزی تاریخ (اوکسفورڈ ہسٹری) میں ان قوانین پر سلطان علاء الدین کو ظالم و وحشی وغیرہ بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے (صفحہ ۲۳۴)، تعجب ہے لائق مولف کو جو عرصے تک ہندوستان میں رہے تھے یہ خیال نہیں آیا کہ اس زمانے میں بھی جب کہ خود ان کی شائستہ قوم ہندوستان پر حکمراں ہے اور بقول اُن کے مُلک کہیں زیادہ دولتمند اور آسودہ حال ہے، ایسے کتنے گاؤں ہوں گے جہاں کے چودھری یا نمبردار "اسپ و سلاح" کے مالک ہوں اور عمدہ لباس پہنتے اور پان کھاتے ہوں!

خزانے کو خالی کردیا تھا اور اب پہلے سے بھی زیادہ غیرآباد علاقوں میں فوج کی رسد اور سامانِ آسائش فراہم کرنے کیواسطے زرِکثیر کی ضرورت تھی۔ دکن کا خیال بھی سلطان علاءالدین کے ذہن سے نہیں نکلا تھا چنانچہ اس موقع پر جو لشکر مرتّب ہوا، اس کے ایک حصّے کو اُس نے جاج نگر کی طرف سے دکن جانے کا حکم دیا، اور باقی فوج سے خود چتوڑ پر فوج کشی کی ۱؎ (۱۳۰۳ء)

جس قدر تاریخی یا نیم تاریخی شواہد موجود ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی راجپوتانے کی یہ ریاست ہندو رجواڑوں میں قدیم سے بہت معزز مانی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زد سے بھی اب تک محفوظ تھی۔ کرنیل ٹاڈ نے علاءالدّین کی لڑائیوں کے متعلّق جو قصّے لکھے ہیں انہیں پڑھ کر یہ قدرتی قیاس اور قوی ہوجاتا ہے کہ منچلے راجپوتوں نے جانبازی دکھانے میں بھی کمی نہیں کی لیکن آخرکار انہیں شکستیں کھاکر محصور ہونا اور ہتیار ڈالدینے پڑے۔ چتوڑ پر حکومت دہلی کا قبضہ ہوگیا اور وہاں سلطان نے اپنے بڑے بیٹے **خضرخاں** کو صوبہ دار بنادیا ۲؎

پدمنی کا فسانہ

آخری روایت فرشتہ کی ہے (صفحہ ۱۱۱) اور اسی نے بعض اور تفصیلی واقعات کے ساتھ **پدمنی** کا قصّہ بھی کسی ہمعصر تاریخ کا حوالہ دیئے بغیر نقل کیا ہے اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ چتوڑ کا راجہ **رتن سین** اسیر ہوکر دہلی لایا گیا تھا۔

اُسے سلطان نے پیام دیا کہ اگر اپنی بیٹی (پدمنی)، کو جو اُسکے مفرور اہل خاندان کے ساتھ پہاڑوں میں پناہ گزیں تھی، محل سرائے شاہی میں داخل کرنے پر آمادہ ہو تو اسے رہا کردیا جائیگا۔ راجہ نے اس تجویز کو قبول کرلیا اور قاصد بھیج کر پدمنی کو دہلی طلب کیا۔ لیکن اُس کے خاندان والوں کو یہ عار گوارا نہ تھا اور اس لئے اُنھوں نے پدمنی کی بجائے بہت سی پالکیوں میں راجپوت سپاہی بھیجدئے اور مشہور کیاکہ اس میں وہ اور اُس کی سہیلیاں سوار ہیں۔ اس بہانے سے انہیں قلعے میں جہاں راجہ قید تھا داخل ہونے کی اجازت مل گئی اور اُنھوں نے اندر پہنچتے ہی یک بہ یک باہر نکل کے نگہبانوں پر حملہ کیا اور جس طرح ممکن ہوا راجہ کو بچاکر لے گئے۔ (تاریخ فرشتہ ۔ صفحہ ۱۱۵)۔

خلاف قیاس ہونے کے علاوہ، اس قصّے کا برنی کی مفصّل تاریخ میں مذکور نہ ہونا ہی اسے مشتبہ بنادینے کے لئے کافی ہے۔ الفنسٹن ایک طرف، ونسنٹ اسمتھ جیسا مولّف بھی جس نے ظاہرا اسلامی فرماں رواؤں کو بجا و بیجا بدنام کرنا اپنی تاریخ کا ضروری مقصد قرار دیا ہے، اس بارے میں سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسرے ٹاڈ کا بیان ہے کہ جب قلعۂ چتوڑ کے بچانے سے نا امیدی ہوی تو راجپوتوں نے رسم قدیم (جوہر) کے مطابق اپنے تمام اہل وعیال کو جمع کرکے جلادیا اور خود بھی لڑکر مرگئے۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ جسے

آج کل بعض انگریزی "تاریخوں" میں بہت آب وتاب کے ساتھ لکھا جاتا ہے، محض "شاعری" ہے!

البتہ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ راجہ رتن سین کسی طرح قید سے نکل گیا اور فرشتہ کی روایت کے بموجب، حکومتِ دہلی نے ایک اور راجپوت امیرزادہ کو اپنی طرف سے چتوڑ کا حاکم بنا دیا جو ہمیشہ سلطان کی اطاعت و فرماں برداری کرتا رہا اور جب کبھی ضرورت ہوتی "غاشیۂ عبودیت بر دوش انداختہ با پنج ہزار سوار و دہ ہزار پیادہ دراں سفر حاضری گردید وجاں سپاری می کرد"۔ ؎۱

طرغی مغل کا حملہ۔

حکومتِ دہلی کی یہ حکمت عملی اُس کی عین دانش مندی تھی کیونکہ چتوڑ پر براہ راست قبضہ رکھنا جنگی اعتبار سے دشوار اور مالی لحاظ سے سراسر نقصان کی بات ہوتی۔ چتوڑ کی فتح کا مقصود صرف مالوے اور گجرات کے راستے محفوظ کرنا تھا ورنہ بذاتہٖ جنوبی راجپوتانے کے قبضے سے کسی مالی فائدے کی اُمید نہ تھی۔ اِدھر ایک وفادار و مطیع راجہ کو وہاں حاکم بنا دینے سے مذکورۂ بالا مقصد حاصل اور دہلی کے خلاف کسی خاص شورش کا اندیشہ زائل ہوگیا؛ دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کا چتوڑ کی فتح میں منہمک ہونا سُن کر ہی مغلوں کو دوبارہ دہلی پر تاخت کرنے کا موقع مل گیا اور اُن کا مشہور سپہ سالار طرغی نہایت تیز کوچ کرتا ہوا پائے تخت کے قریب آپہنچا

؎۱ فرشتہ۔ صفحہ ۱۱۵۔ نیز دیکھو الفنسٹن صفحہ ۳۸۵

(۱۳۰۳ء) اور اگرچہ دو مہینے کے محاصرے کے بعد مغلوں کو ناکام واپس جانا پڑا، لیکن شاید اس واقعہ نے بھی حکومت دہلی کو متنبہ کردیا کہ وہ کم سے کم کچھ عرصے کے واسطے اپنی بیرونی ذمہ داریاں بڑھانے میں احتیاط کرے۔ کیونکہ گو سلطان چتوڑ سے واپس آگیا تھا، لیکن مغلوں کی آمد کے وقت سلطانی افواج اس قدر بٹی ہوئی تھیں کہ دہلی کی باقی ماندہ فوج حملہ آوروں کے بارہ تمن (یعنی ایک لاکھ بیس ہزار) سواروں کا بھی میدانی مقابلہ نہ کرسکتی تھی اور سلطان کو قلعہ بند ہوکر مدافعت کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ شہر کے لوگوں کو اس محاصرے سے بہت پریشانی اور تکلیف تھی لیکن مغلوں نے جب کبھی شہر کے کسی حصّے میں گھسنے کا ارادہ کیا، انہیں ناکامی ہوئی اور دہلی کی سپاہ نے کئی بار مدافعت کا حق ادا کردیا[1] لہذا حملہ آور جو رسد رسانی کی دقتوں کے علاوہ بظاہر ایک غیر ملک میں عرصے تک بیکار پڑے رہنے سے گھبرا گئے تھے اور جن کا خاص مقصد پچھلی شکست کا داغ مٹانا تھا، اسی تیزی سے واپس چلے گئے[2]

---

[1] برنی صفحہ ۳۰۲۔

[2] اِس تشویش ناک محاصرے کے زمانے میں سلطان نظام الدین اولیاءؒ سے بھی دُعا کی درخواست کی گئی تھی اور مغلوں کی بے جنگ و شکست پسپائی کو لوگوں نے آپ ہی کے روحانی تصرف پر محمول کیا اور ہمعصر

فوجی تنظیم اور نرخ اجناس کا تعین۔

لیکن اس واقعے نے اور مہم رنتھنبور و چتوڑ کی مشکلات نے سلطان کے سکندری ولولوں کو بہت کچھ سرد کردیا اور اب اسے صاف نظر آگیا کہ جب تک فوجی تعداد اور جنگی سازو سامان میں خاطرخواہ اضافہ نہ کیا جائے گا، دنیا کی فتح ایک طرف خود اپنے مُلک میں بھی مغلوں کے خوف سے اطمینان میسّر نہ آئے گا۔ پس مُلکی مداخل و مصارف کی بڑی اہتمام سے جانچ پڑتال کی گئی اور فوج میں اضافۂ کثیر کی نہایت مفصّل تجاویز مرتب ہوئیں جن سے، دیگر جنگی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ، خاص طور پر یہ انتظام کرنا منظور تھا کہ فوج والوں کو جو تنخواہ دی جائے اس میں وہ بہ آسانی اپنا گزارہ کرسکیں۔ اس غرض کے لئے کھانے، پہننے، برتنے کی ہر شئے کے سرکاری نرخ مقرر کئے گئے اور اجناس خوردنی، کپڑا، برتن، گائے بھینس، گھوڑے غرض غالباً کوئی استعمالی شئے ایسی نہ تھی جو اس ہمہ گیر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۵ - مورخ نے بھی اسی عقیدے کو تحریر کردیا جس پر ونسنٹ اسمتھ صاحب یہ "بدگمانی" کرتے ہیں کہ حکومتِ دہلی کی جانب سے کوئی رشوت یا نذرانہ دیا گیا ہوگا کہ مُغل حملہ آور واپس چلے گئے! (صفحہ ۲۳۳)، لیکن اوّل تو برنی جو عہد علائی کی ہر کمزوری یا خرابی کو تفصیل بلکہ مبالغے سے بیان کرتا ہے، اس قسم کی کارروائی سے بے خبر نہ رہ سکتا تھا دوسرے اسمتھ صاحب اگر غور کرتے تو انہیں بلا دقّت اس پسپائی کے بہت سے ظاہری اسباب اور قوی قرائن بھی مل جاتے۔

قانون کے احاطے میں نہ لے لی گئی ہو۔ دوسرے جا بہ جا بڑے بڑے سرکاری انبار خانے قائم کردئے گئے جن میں ہر قسم کا غلہ بھرا رہتا تھا کہ قحط و خشک سالی کے زمانے میں بھی مقررہ نرخ بدلنے کی ضرورت نہ پیش آئے اور ہمعصر مورخ شہادت دیتا ہے کہ سلطان علاء الدین کے جیتے جی اس نرخ و ارزانی میں کوئی فرق نہیں آیا جو درحقیقت اس بادشاہ کی حیرت انگیز انتظامی قابلیت کا ثبوت ہے[۱]

نرخوں کے اس تعیّن کی نگرانی کے لئے معمولی پولس کے علاوہ ایک بہت بڑا محکمہ قائم ہوا بڑی منڈی میں سرکاری شحنہ مقرر کئے گئے جن کی سختی نے تھوڑے ہی عرصے میں ہر قسم کے تجارت پیشہ لوگوں کو نئے ضوابط کا پابند بنادیا اور پھر سلطان کو فوج کی ازسرنو تنظیم اور اضافہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ اُس نے پایۂ تخت اور دیگر مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کئے اور چار لاکھ پچھتر ہزار سوار کی وہ جرّار فوج مرتّب کی جس نے مغلوں کو شکستیں دیتے ہیں، سپاہِ بلبنی کی شہرت کو ماند کردیا۔ اِن سواروں کی عام تنخواہ ۱۲۳۔ اور دو اسپہ کی ۱۹۶ تنکہ (یا روپیہ) ماہانہ تھی اور اسی میں ان کے اہل و عیال نیز اسپ و اسلحہ کے

---

[۱] اِن تمام قوانین یا ضابطوں کا ضیاءالدین برنی نے تفصیل سے حال بیان کیا ہے جس سے اُس زمانے کے اقتصادی حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے (صفحات ۳۰۴ تا ۳۲۰)

مصارف بخوبی پورے ہوجاتے تھے[1]

دکن کی فتوحات

اس نئی فوج نے دوہی سال میں مغلوں کو ایسی سخت شکستیں دیں کہ ۱۳۰۸ء کے آخری بڑے حملے کے بعد مدت تک انہیں ہندوستان کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں ہوی اور کئی بار ان کے ہزارہا سپاہی مارے گئے اور فوجیں کی فوجیں اسطرح معدوم ہوئیں کہ اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ پھر کر نہ گیا۔ ان معرکوں میں سب سے زیادہ شہرت ملک کافور اور غازی ملک تغلق نے پائی جو آخر میں سلطنت دہلی کا بادشاہ ہوا[2]

اِس دوران میں عین الملک نے مالوہ کو ازسرنو فتح کر کے اس علاقے کا سلطنت سے الحاق اور آئندہ دکن پر پیش قدمی کا راستہ صاف کردیا تھا[3] جس کی سلطان علاء الدین کو

---

[1] برنی صفحہ ۳۰۳ و ۳۱۹ - یہ عبارت مشتبہ ہے اور فرشتہ نے مذکورۂ بالا نرخوں کے علاوہ آخری شرح تنخواہ ۶½ تنکہ لکھی ہے (صفحہ ۱۱۳) جو راقم الحروف کے قیاس کے مطابق محض دو اسپہ کو بطریق اضافہ ملتا تھا (۱۳ + ۶½ = ۱۹½)، بلوخمین اور میجر فلر برنی کی عبارت کا ٹھیک مطلب نہ سمجھ سکے اور الیٹ نے غور و بحث کے بعد یہ قیاس کیا کہ اصل تنخواہ ۱۹½ اور ۶½ تنکہ دو اسپہ کے واسطے اضافہ تھا۔ (الیٹ جلد سوم صفحہ ۶۲۵) لیکن وہ اگر فرشتہ کے قول سے اصل عبارت کا مقابلہ کرتے تو غالباً مذکورۂ بالا نتیجے پر پہنچ جاتے ۱۲

[2] مغلوں پر ہندوستانی فوج کا اس درجہ ہراس طاری ہوگیا تھا کہ پھر وہ ہندوستان کی سرحد (یعنی کوہِ سلیمان) تک بھی آنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اُن کی مسلسل شکستوں کے لئے دیکھو برنی صفحات ۳۲۱ تا ۳۲۲ ۱۲

[3] نئے انتظام کی عمدگی کی فرشتہ ان الفاظ میں شہادت دیتا ہے "مزاحمت مغل

بہت دن سے آرزو تھی، مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ گو آئندہ سات برس میں اسلامی فوجوں نے یکے بعد دیگرے جنوبی ہند پر چار حملے کئے اور دیوگیری، ارنگل (ورنگل) یعنی ریاستِ تلنگانہ دور سمدر (یعنی موجودہ میسور) اور سب سے جنوبی ریاست پانڈیا کا پائے تخت مدورا تک فتح کیا جو دہلی سے تقریباً پونے دو ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بایں ہمہ ان کے براہِ راست سلطنت دہلی کے ماتحت الحاق کرنے کا ابھی تک خیال نہیں پیدا ہوا تھا اور ان ریاستوں کے رئیسوں کو خراج گزاری کے اقرار پر اپنی جگہ بحال رہنے دیا گیا تھا۔ جسکی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں اتنے بعید اور دشوار گزار فاصلوں کا طے کرنا کچھ آسان بات نہ تھی دوسرے درحقیقت، بعض ساحلی بندرگاہوں کے سوا دکن میں ابھی تک مسلمانوں کی کوئی آبادی نہ تھی اور شمالی ہند کے سپاہی زیادہ عرصے تک اپنے گھروں سے دُور رہنا گوارا نہ کرتے تھے۔ دکن کے مستقل قبضے میں یہی وہ دقّت تھی جسے رفع کرنے کی غرض سے سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیری میں منتقل کیا تھا مگر یہ سلاطین خلجی کے عہد کے بعد کی بات ہے۔ البتہ خلجیوں کا بجائے خود یہی کارنامہ کچھ کم قابلِ داد نہیں ہے کہ سب سے پہلے انہی نے دکن کے بعید مُلک فتح کئے اور شمالی ہند سے دکن کا سیاسی تعلق اور تمام برِاعظم ہند میں ایک مرکزی سلطنت قائم کرنیکا امکان پیدا کر دیا، جو اُنسے پہلے محض ایک خیالی اور محال بات تھی؛

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۸ بالکلیہ برطرف شدو اکثر بلادِ ہندوستان کہ ملاذ و معاذ مفسداں و متمرّداں بود بحیطۂ ضبط در آمد و مملکتِ مالوہ چنانکہ باید مُصفّا گردید و راہ ہائے آمد و شدِ تجار و سائرِ اہلِ سیاحت صورت امنیت پذیرفت'' (صفحہ ۱۱۲)

دیگر مشاہدہ نہ شد و شاید کہ (آئندہ) معائنہ ہم نہ شود ۔ ؎۱

سلطان قطب الدین مبارک شاہ

اِن میں بعض "عجائبات" علاء الدین کے بعد تک موجود رہے اگرچہ اوصافِ ذاتی کے اعتبار سے اس کے جانشین بیٹے کو باپ سے کوئی نسبت نہ تھی ۔ واضح رہے کہ سلطنت کا اصلی وارث شہزادہ خضر خاں تھا مگر اسے باپ نے اپنی آخری بیماری میں ناراض ہوکر قلعہ گوالیار میں نظر بند کردیا تھا ۔ جب علاء الدین مرا تو اس کے محبوب غلام کافور نے ، جو کچھ دن سے سلطان کے مزاج اور سلطنت کے کاروبار پر حاوی ہوگیا تھا ، سلطان مرحوم کا ایک وصیت نامہ پیش کیا اور اس کی رُو سے علاء الدین کے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کی بادشاہی کا اعلان کردیا جس کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی ۔ پھر اُس کے دو بڑے بھائیوں کو حالتِ نظر بندی میں اندھا کرادیا اور شاید تیسرے کے قتل کی فکر میں تھا کہ محل کے سپاہیوں نے خود اُسے مار ڈالا اور قطب الدین کچھ عرصے چھوٹے بھائی کے سرپرست کی حیثیت سے اور بعد میں اُسے ہٹا کر سلطنت کا مالک ہوگیا ۔ (۱۳۱۶ء)

الحاقِ دیوگیری

نوجوان شہزادے نے تخت نشین ہوتے ہی عہد علائی کے سخت ضوابط منسوخ کردئے جس کی وجہ سے اجناس کے نرخ تھوڑے ہی دن میں گراں ہوگئے اور غالباً سرکاری آمدنی پر

؎۱ اس قسم کے بیسیوں منتخب ارباب علم وفن کا مؤرخ نے نام بہ نام تذکرہ کیا ہے ۔ دیکھو برنی صفحات ۳۳۹ تا ۳۶۲ ۔

بھی بُرا اثر پڑا۔ بایں ہمہ چونکہ پچھلے عہدہ دار اپنے عہدوں پر بحال تھے اس لئے ملکی نظم و نسق اور فوجی انتظامات میں زیادہ فرق نہ آیا اور گجرات و دکن میں جو شورشیں بپا ہوئی تھیں وہ بہت جلد فرو کردی گئیں۔ ان میں سے گجرات کا سلطنت دہلی کے ساتھ پہلے ہی الحاق ہوچکا تھا اب عین الملک نے فسادات کو دفع کرنے کے بعد از سرِ نو یہاں کے انتظامات کی دُرستی کی اور ایسے عمدہ مواقع پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں کہ آئندہ اندرونی شورش کا سدّباب ہوگیا۔ لیکن سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم ہرپال راجہ دیوگیری کی بغاوت تھی جس کے ساتھ مہاراشٹر کے بہت سے رئیس شریک ہوگئے تھے۔ سلطان نے اِس طرف خود فوج کشی کی۔ باغی راجہ گرفتار ہوکر مارا گیا اور اِسی واقعے نے دیوگیری کی رہی سہی آزادی کا خاتمہ کردیا۔ (۱۳۱۸ء)

خسرو خاں — شمالی دکن میں جسے برنی کے زمانے میں "مُلک مرہٹہ" کہتے تھے، اپنے صوبہ دار و عمّال مقرّر کرنے کے بعد عیش پسند بادشاہ نے خود پائے تخت کی راہ لی اور اُس کی حکومت اور زندگی کے باقی تین چار سال محض عیاشی اور بیہودگی میں صرف ہوئے۔ دکن سے چلتے وقت وہ ملیبار کے سرکشوں کو سزا دینے کے لئے خسرو خاں کو جنوبی ہند کی افواج کا سپہ سالار بنا گیا تھا۔ خسرو خاں درحقیقت ایک نومسلم اور کمسن غلام تھا اور نوجوان بادشاہ کو اس کے ساتھ وہی

شیفتگی ہوگئی تھی جو اس کے باپ کو ملک کافور خواجہ سرا سے تھی۔ چنانچہ وہ خرابیاں جن کی علاء الدّین کے آخر زمانے میں شکایت پیدا ہوی، خسرو خاں کے عشق کی بدولت قطب الدّین کے شروع عہد سے ہی نمودار ہونے لگیں اور کافور کی نسبت تو اپنے ولی نعمت کو قتل کرنے کا محض شبہ تھا، لیکن خسرو خاں نے بہت سے اختیار حاصل کرنے کے بعد، واقعی اپنے آقا کو قتل کرادیا اور اِسی کے ساتھ سلطنت کے بڑے بڑے امیروں کو بھی جو اُسوقت پائے تخت میں موجود تھے دھوکہ دیکر نظربند کرلیا۔ (۲۱؍ ۱۳۲۰ء)۔

خسرو خاں نے اپنی قوم کے ہزاروں ہندو سپاہی پہلے سے دہلی میں بُلالئے تھے۔ ایک دو مسلمان امیر بھی جن کی شاہِ مقتول نے آبرو ریزی کی تھی، اس قتل کی سازش میں شریک ہوگئے۔ بعض اُمرا نے روپیہ کی لالچ میں اور بعض نے اصلاحِ حال سے نا امید ہوکر اُس کی اطاعت قبول کرلی اور اُس نے ناصر الدّین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ اس میں شک نہیں کہ سب کے دل گواہی دے رہے تھے کہ یہ چند روز کی بہار ہے، تاہم خسرو خاں کو اتنی فرصت ضرور مل گئی کہ اُس نے علاء الدّین اور قطب الدّین کی نرینہ اولاد کو چُن چُن کر قتل کیا اور محلاتِ شاہی میں خون کی ندیاں بہادیں۔ یہ گویا خدا کی طرف سے جلال الدّین کے خونِ ناحق کی سزا تھی کہ علاء الدّین کے خاندان کا نام ونشان

دنیا سے مٹ گیا ؎

خسرو خاں اور اُس کے "پرواری" رفیقوں نے تین چار مہینے میں اہل شہر پر جو ظلم و ستم کیے، اُن کی تفصیل ناگفتہ بہ ہے مگر سب سے زیادہ سبق آموز اور یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہل دہلی کے لئے یہ وحشیانہ حرکات بالکل ہی نئی نہ تھیں بلکہ علاء الدین جوشِ غضب میں اور اُس کا جانشین عالمِ مستی میں اسی قسم کے زشت و شرمناک افعال کا بارہا تماشا دکھا چکے تھے پس "شدّتِ حرص وطمع دنیا وضعفِ ایمان" کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک گروہ خسرو کا رفیق ہو گیا[1] تو یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ البتہ اِن دونوں حالتوں میں اتنا فرق ہے کہ اُس وقت یہ بدعنوانیاں محض اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور اُس کی عالی خاندانی کا بھی لوگ کچھ نہ کچھ رعب مانتے تھے اور اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعون بے سامان بن گیا جس کی جہالت و ناشائستگی، رذالت و کم نسبی سب پر عیاں تھی ؎

غازی ملک تغلق۔ مگر خسرو خاں کو سب سے زیادہ خطرہ پنجاب کے صوبہ دار **غازی ملک** تغلق کی جانب سے تھا، جس کی شجاعت و سپہ سالاری کا حال ہم اجمالاً پہلے پڑھ چکے ہیں کہ خاندانِ شاہی کی افسوس ناک تباہی سن کر اُسے سخت صدمہ ہوا اور وہ غدار خسرو سے انتقام لینے کے لئے بیقرار تھا لیکن خود اسکا

---

[1] برنی صفحہ ۴۱۲

بیٹا مِلک **فخرالدین جُونا**، کہ آخر میں سلطان محمد تُغلق کے لقب سے دہلی کا بادشاہ ہوا، اُن دنوں پائے **تخت** میں "آخوربک" کا عہدہ رکھتا تھا، اور اُسے گزند پہنچ جانے کے اندیشے سے مِلک تُغلق کچھ دن تک کوئی جنگی کارروائی نہ کرسکا۔ حتیٰ کہ مِلک جُونا ایک شام کو چھپ کر دہلی سے نکل گیا اور صحیح سلامت سرستی آپہنچا جہاں اُس کے باپ کی طرف سے اُسی زمانے میں ایک فوجی دستہ قلعے پر قابض ہوگیا تھا؛ اب لشکر تُغلق نے دیپالپور سے حرکت کی اور خسرو کے رفیقوں کو دو مقام پر شکست دیتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ خسرو اور اُسکے ساتھ دینے والوں میں سے بہ مشکل کوئی شخص زندہ بچا ہوگا کیونکہ جو لڑائی میں قتل ہونے سے بچ کر بھاگے وہ کہیں بھی نہ چُھپ سکے۔ سارا مُلک، بلکہ کہنا چاہیئے کہ زمین و آسمان، اُن کا دشمن ہوگیا تھا اور کئی دن تک وہ جابہ جا سے پکڑے ہوئے آتے اور قتل کرادئے جاتے تھے؛

یہ بے رحم غاصب اپنے کئے کی سزا پاچکے تو فاتح سردار اپنی خیمہ گاہ سے شہر میں آیا اور "قصر ہزار ستون" میں مجلس عزا منعقد کی جس میں خاندانِ علائی کی تباہی پر "جمیع بزرگانِ مُلک" نے جمع ہوکر عبرت کے آنسو بہائے۔ غازی مِلک تُغلق کی فتح اور ظالموں سے انتقام لینے پر خدا کا شکر ادا کیا گیا۔ پھر اسی مجمع میں سردار موصوف نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ میں خاندانِ علائی کا ایک ادنیٰ نمک خوار ہوں اور میں نے

محض اپنے ولی نعمت کا انتقام لینے کے واسطے تلوار کھینچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی ہوی اور غدار غاصب اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ اب تمام بزرگانِ مُلک یہاں جمع ہیں۔ چاہیئے کہ خاندانِ علائی کا اگر کوئی فرد بھی زندہ موجود ہے تو اُسے ڈھونڈ کر لائیں اور تخت پر بٹھائیں کہ بغیر کسی تخت نشین بادشاہ کے سلطنت کے کاروبار میں خرابی کا اندیشہ ہے۔ لیکن اگر بدنصیبی سے اس شاہی خاندان کا کوئی وارث باقی نہیں رہا تو پھر کسی اور ایسے شخص کا جو آپ کے نزدیک اس منصب کا اہل ہو، انتخاب کرلینا چاہیئے۔ اور آپ جسے منتخب کریں گے میں بھی اُس کی اطاعت قبول کروں گا۔ کیونکہ اُس نے یقین دلایا کہ "منکہ تیغ زدہ ام در انتقام مُربیانِ خود کشیدہ بہ طمع ملک ایں کار نہ کردہ ام.... ہر کرا بہ تختِ بادشاہی شما اختیار می کنید، من ہم ہموں را اختیار می کنم"[1]

عمائدِ سلطنت نے اِس کے جواب میں خُود اُس کی جنگی فتوحات، ملکی خدمات اور انتظامی قابلیت کی نظریں پیش کیں اور متفق اللسان اقرار کیا کہ بادشاہی کے منصب جلیل کا تم سے زیادہ مستحق کوئی نہیں ہوسکتا۔ پھر ہاتھ پکڑ کے اُسے تختِ شاہی پر بٹھا دیا اور دوسرے دن باضابطہ اُسکی تاج پوشی کی رسم ادا ہوی (۲۱ شعبان ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۱ء)

---

[1] برنی صفحہ ۴۲۲۔

لفظ تُغلق کی تحقیق

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ چونکہ غازی ملک تغلق نے خسرو خاں کے مقابلے میں دینِ اسلام اور مسلمانوں کی فریاد رسی کی تھی، لہذا اُس کا لقب غیاث الدین مشہور ہوگیا۔ لیکن خود اس نام "تغلق" کے متعلق فرشتہ نے ملحقاتِ طبقات ناصری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دراصل یہ ترکی زبان کا عام نام "قُتلُغ" ہے جسے اہلِ ہند نے الٹ کر "تُغلق" بنالیا۔[1] مشکل الفاظ کو اس طرح اُلٹ لینا، ہندی دماغ اور لب و لہجہ کی عجیب خصوصیت ہے جس کی دیہات کے لوگوں میں آج بھی متعدد مثالیں سننے میں آئینگی لیکن یہ بات کسی قدر قابلِ تعجب ہے کہ علمی دنیا نے بھی اس تصرّف کو قبول کرلیا حالانکہ اسی لفظ قُتلغ کی ایک اور بہتر صورت "قُتلو" بھی موجود و مروّج تھی۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ ابن بطوطہ بھی اُسے تُغلق لکھتا ہے اور اسی کی مستند روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تُرکی قبیلۂ "کرونا" کا ایک غریب آدمی تھا اور کسی سوداگر کے ساتھ سندھ آکر علاء الدین کے بھائی اُلغ خاں کی سرکار میں نوکر ہوا۔ پھر ادنٰے پیادے سے بڑھتے بڑھتے، سوار، سردار، صوبہ دار اور آخر میں سلطنت دہلی کا فرماں روا ہوگیا۔ ضیاء الدین برنیؔ کا اس کے حسب و نسب کے متعلق سکوت بھی غالباً اِس امر کا بالواسطہ ثبوت ہے کہ وہ

۱؎ فرشتہ صفحہ ۱۳۰۔

ابتدا میں گمنام اور بہت کم رتبہ "گلوانی" یعنی بارگیر تھا۔[1]

عمدہ اوصاف اور ملکی اصطلاحات

سلطان غیاث الدین تغلق کے عمدہ اخلاق اور ذاتی اوصاف کی تعریف میں ہمعصر مؤرخ نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں۔[2] لیکن اس تاریخ میں اصولاً ہم کو بادشاہ یا اُمرا کے صرف اُن ذاتی حالات سے بحث رکھنی چاہیئے جن کا ملکی معاملات یا انتظامات سے کوئی تعلق ہو۔ لہذا اِس جگہ یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ پختہ کار سپہ سالار نہایت منتظم، اعتدال پسند اور فرض شناس فرماں روا تھا جس کے چند سالہ عہدِ حکومت میں بہت سی انتظامی خرابیاں دور ہوئیں۔ سپاہی اور عہدہ داروں کو ٹھیک وقت پر بلا نقصانِ "یک دانگ و درم" نقد تنخواہیں ملنے لگیں۔ حکومت کی باخبری اور انصاف پسندی نے ہر شخص کو یقین دلا دیا کہ جس طرح پر جُرم و غفلت کی مناسب سزا ملے بغیر نہ رہیگی اسی طرح حُسنِ خدمت بھی اس دور میں بغیر صلہ رائیگاں نہ جائیگی۔ رعایا میں عام طور پر فراغت

[1] فرشتہ کی روایت کہ غازی ملک تغلق بلبن کے ایک ترک غلام کا، جس نے اسی ملک میں شادی کی، بیٹا تھا (فرشتہ صفحہ ۱۳۰) ابن بطوطہ کے قول کے مقابلے میں کچھ وقیع نہیں کیونکہ اس افریقی سیاح نے مذکورۂ بالا تذکرہ شیخ رکن الدین ملتانی رح سے سنی تھی جو خاص اُس زمانے کے نہایت مشہور و محترم درویش ہیں۔ دیکھو سفرنامہ ابنِ بطوطہ حالات سلطان غیاث الدین تغلق نیز الیٹ کی تاریخ جلد سوم صفحہ ۶۰۶)

[2] برنی ازصفحہ ۴۲۵ تا ۴۳۶

وخوش حالی کے آثار پیدا ہوئے - بہت سے ویران علاقے آباد اور بنجر زمینیں مزروعہ ہوگئیں اور اگر برنی کا قول محض شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آب پاشی کے واسطے نہریں کھدوانے کا طریقہ سب سے پہلے اسی بیدار مغز و رعایا پرور سلطان کے عہد میں جاری ہوا۔ کم سے کم اس بیان کی صداقت میں تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علاء الدین کی زیادہ طلبی کی بجائے سرکاری مالگزاری، پیداوار کے دسویں یا گیارہویں حصّے کے حساب سے مقرر کی گئی اور تاکیدی احکام نافذ ہوئے کہ صاحبانِ اقطاعات کی سب سے مقدم کوشش یہ ہونی چاہئے کہ شرح مالگزاری کی جگہ زراعت کو ترقی دیں تاکہ سرکار کا مالی فائدہ بھی دیرپا ہو[1]

الحاق ورنگل

ممالک دکن اور بنگالے کی لڑائیاں اور آخر میں سلطنت دہلی سے قطع تعلق، آئندہ چالیس برس کے سب سے اہم سیاسی واقعات ہیں۔ ان میں سے شمالی دکن کے مستقل طور پر سلطنت دہلی سے ملحق ہونیکا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں - اب تلنگانے یعنی ریاست ورنگل کی باری تھی اور اندرونی انتظامات کے درست ہوتے ہی حکومتِ دہلی کی جانب سے ۷۲۲ھ میں شہزادۂ جونا کو فوج کثیر دے کر ادھر بھیجا گیا - شہر ورنگل کا حملہ آوروں نے محاصرہ کرلیا تھا لیکن مُفسدوں نے جھوٹی خبریں اُڑا کے لشکر میں پھوٹ ڈلوادی اور یہ فوج بہت ابتر حال میں ناکام

[1] برنی صفحہ ۴۲۹ - نیز دیکھو سرہنری الیٹ کا ترجمہ اور حاشیہ، جلد سوم صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱

واپس آئی ۔ مگر سال آئندہ شہزادہ جونا دوسری[1] فوج لیکر تلنگانے میں داخل ہوا اور بیدر و ورنگل کے قلعے تسخیر ہو گئے ۔ راجہ (لدّر دیو) اور اس کے بہت سے سردار اور عزیز اقربا گرفتار کر کے مال غنیمت کے ساتھ دہلی بھیجے گئے ۔ فتحمند شہزادہ نے جا بہ جا اپنے حکّام اور عہدہ داروں کا تقرر کیا اور مُلک کی ازسرنو تنظیم کے ضمن میں ورنگل کا نام تک بدل کر سلطان پور کردیا جو گویا اس امر کی تصدیق و توثیق تھی کہ ملک تلنگانہ اب مستقل طور پر دہلی کی اسلامی سلطنت کا ٹکڑا ہے ۔ (۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء)

معاملات بنگالہ اسی زمانے میں اطلاع ملی کہ بنگالے میں اندرونی فساد اور خانہ جنگی نے رعایا کے امن و امان میں خلل ڈال دیا ہے اور حکومت کا اصلی حقدار اپنے باغی بھائی بہادر شاہ کے ہاتھ سے عاجز آگیا ہے لہٰذا اس شورش کو دفع کرنے کے واسطے خود سلطان غیاث الدین کو اس طرف جانا اور شہزادۂ ولی عہد جونا کو ورنگل سے بلا کر دہلی میں اپنا نائب بنانا پڑا کہ شمالی سرحدوں پر بھی نگاہ رکھے جہاں دوبارہ مغل ترکتازوں کی جانب سے کسی قدر اندیشہ پیدا ہوگیا تھا[2]۔ یہاں یہ صراحت کردینی چاہیئے

[1] اب وہ الغ خاں کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا، جسے اس زمانے کے انگریز مورخوں نے غلطی سے الف اور الپ خاں بنادیا ہے ۔

[2] ان واقعات کو ٹھیک سمجھنے کے لیئے ابن بطوطہ کے سفرنامے اور ضیاءالدین برنی کی تاریخ کو پہلو بہ پہلو رکھکر پڑھنے کی ضرورت ہے جو ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں ۔

کہ ناصر الدین بن بلبن کے زمانے سے ممالک بنگال کی صوبہ داری موروثی ہوگئی تھی، اور یہاں کے حکمراں اندرونی طور پر قریب قریب خود مختار تھے جو سلطنتِ دہلی کی سیادت کو تسلیم کرتے اور کبھی کبھی بطور خراج تحائف وہدایا بھی دربار دہلی کو بھیجتے رہتے تھے۔ مگر اُن کی اندرونی آزادی کو بعض خاص وجوہ سے تقویت پہنچتی تھی۔ یعنی اوّل تو بنگالے کی پائے تخت سے دُوری تا کہ خاص اہتمام کے بغیر حکومت دہلی کا لکھنوتی کے اندرونی حالات سے واقفیت رکھنا یا مداخلت کرنا محال تھا۔ دوسرے ابتدائی فتوحات کے وقت سے بنگالے میں مسلمان سپاہی اور سرداروں کی ایک بڑی جماعت آکر بس گئی تھی اور ان کی اولاد نیز نومسلموں کی کثرت سے یہاں مسلمانوں کا بڑا جتھا بن گیا تھا جو بنگالے کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت ناپسند کرتے تھے پس حکومتِ دہلی بھی اسلامی بنگال کے مقابلے میں سخت گیری کرنے سے ایک حد تک احتراز کرتی تھی۔ اس موقع پر بھی فوج کشی کی غرض حکومتِ بنگالہ کے جائز ورثہ کو بے دخل کرنا نہ تھی بلکہ محض بغاوت کا استیصال اور اصلی حقدار، شہاب الدین کو مدد پہنچانی منظور تھی جس کے لئے سلطان تغلق نے مشرقی بنگالے تک سفر کیا اور باغی بہادر شاہ کو گرفتار کرکے اپنے ہمراہ دہلی لے آیا۔ شہاب الدین جو ماتحت خراج گزار کی حیثیت سے سلطان کے ہمرکاب تھا، حکومتِ بنگال پر

بحال کردیا گیا ؎ دکتہ ۷۲۴ھ ؎۱

دہلی کی صدر حکومت سے بنگالے کا یہ ماتحتانہ تعلق ایک لحاظ سے ۷۶۱ھ تک قائم رہا جبکہ سلطان **فیروز شاہ** تغلق نے دوسری مرتبہ بنگالے پر فوج کشی کی اور سکندر شاہِ بنگال کو صلح کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس صلح کے حالات اور بعض شرائط سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطانِ دہلی غالباً پہلے سے اپنے حریف کو بنگالے کا بادشاہ مانتا تھا اور اس اعتبار سے فرشتہ کا یہ قول صحیح سمجھنا چاہیے کہ دراصل حکومتِ بنگال ۷۴۰ھ سے آزاد و خود مختار تسلیم کرلی گئی تھی ؎۲ اور اسکے بعد وہ تقریباً پونے دوصدی تک ایک مستقل اور جداگانہ سلطنت رہی جہاں **شیر شاہ** سوری سے قبل، اسکے بعد دیگرے اٹھارہ یا انیس سلمان بادشاہ تخت نشین ہوئے جن کے حالات قلمبند کرنا ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہے ؎

بنگالے کی آزادی۔

ممالکِ دکن کا حال بنگالے سے بہت مختلف تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت یہ ملک مسلمانوں کے لئے قریب قریب بالکل نئے اور غیر ملک تھے اور خاندانِ تغلق

معاملاتِ دکن

۱؎ برنی صفحہ ۴۴۹۔

۲؎ فرشتہ صفحہ ۱۴۷۔ انفنسٹن اور دنسنٹ اسمتھ کا یہ لکھنا کہ محمد تغلق کے زمانے سے بنگالہ آزاد ہوگیا تھا درست نہ ہوگا کیونکہ تاریخ فیروز شاہی، نیز تاریخ مبارک شاہی (دستور الیٹ) کی متواتر روایتوں سے ثابت ہے کہ فیروز شاہ تغلق کی ابتدائی حکومت میں بنگالہ کچھ عرصے تک سلطنت دہلی کا صوبہ رہا ؎

برسر حکومت ہوا ہے تو اُن کی فتح کو بہ مشکل بیس برس گزرے تھے۔ نقشے میں دیکھئے تو دہلی سے لکھنوتی اور ورنگل کا فاصلہ تقریباً مساوی نظر آتا ہے لیکن شمالی ہند کے آباد و سرسبز میدانی قطعات اور گنگا میں دریائی سفر کی آسانیوں نے بنگال و دکن کی طے مسافت میں بہت بڑا فرق پیدا کردیا تھا اور دہلی سے جنوب کی طرف چند منزل کے بعد ہی غیر آباد جنگل اور دشوار گزار پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور سفر کی یہ مشکلات مالوے کے خطّے سے آگے بڑھتے ہی زیادہ ہوجاتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ نہ صرف دکن کی فتح میں بہت دیر لگی بلکہ بعد میں بھی شمالی ہند کے مسلمان مدت دراز تک ادھر آنے سے گھبراتے رہے اور درحقیقت عہد عالمگیر سے قبل دکن "ہندوستان خاص" سے بالکل جداگانہ ملک سمجھا جاتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ سلطان محمد تغلق ہندوستان کا پہلا فرماں روا ہے جس نے شمالی ہند کا جنوبی ہند سے پیوند ملانا چاہا اور معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے خوشی سے اس کے اولوالعزمانہ ارادوں میں ساتھ نہ دیا، تو اُس نے حکماً دہلی کی آبادی کو **دولت آباد** (دیوگیری) میں منتقل کردیا کہ دکن میں مسلمانوں کی مستقل سکونت قائم ہوجائے۔

سلطان محمد ت

یہ بادشاہ، جس کی فتوحاتِ دکن اور دہلی میں نیابت بادشاہی کا ذکر شہزادہ (فخر الدین) **جونا** کے نام سے اوپر گزر چکا ہے اپنے باپ کی مہم بنگالے سے واپسی اور

ناگہانی وفات[1] کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا (ربیع الاول ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) اور اپنی حیرت انگیز قابلیت سے اُس نے بہت جلد اندرونی نظم و نسق میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

[1] کئی روایات سے اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ تغلق اوّل کی ناگہانی موت میں جونا کی سازش کا دخل تھا اور اُس کی فاتحانہ مراجعت کے وقت شہر دہلی سے باہر جو چوبی قصر تیار کرایا گیا تھا (کہ بادشاہ وہاں ٹھیر کر جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہو) اس میں بقول ابنِ بطوطہ عمداً یہ "صنعت" رکھی تھی کہ جب اُس کے ایک خاص حصّے کو ہاتھی مَس کریں تو اس کی چھت گر پڑے۔ چنانچہ باریابی کے بعد جب اُمرا اس قصر کے باہر چلے آئے تو ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ شہزادہ جونا نے ہاتھیوں کے پیش کرنے کی اجازت لی اور خود اس قصر دیا "کُشک" کے باہر نکل آیا۔ پھر جس وقت ہاتھی پیش ہوے تو اُن کے ایک خاص طرف سے گزرتے ہی قصر کی چھت یکایک گر پڑی اور سلطان اور اس کا منجھلا بیٹا محمود اُس کے نیچے دب کے مر گئے۔ ابنِ بطوطہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جونا کے اشارے سے گری ہوئی چھت کے نیچے سے سلطان کو نکالنے میں تساہل اور تاخیر کی گئی ... (سفرنامہ حالات "غیاث الدین تغلق شاہ")، مورخ برنی کا بیان ہے کہ جس وقت سلطان اس قصر میں ٹھیرا اور اُمرا کی باریابی کے بعد دسترخوان بچھایا گیا تو یکایک چھت پر بجلی گری اور سلطان اور شہزادہ محمود دب کے مر گئے اور باقی اُمرا جو ہاتھ دھونے کے واسطے اُس وقت باہر نکل آئے تھے بچ گئے (صفحہ ۴۵۲)، اسی ضمن میں فرشتہ کا قول بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ "بعض تواریخ میں لکھا ہے کہ چونکہ یہ قصر بالکل تازہ بنا ہوا تھا لہٰذا جو تت

مورخ ضیاءالدین برنی اس بادشاہ کا مصاحب خاص تھا اور اُسنے بہت تفصیل کے ساتھ اسکے ذاتی اوصاف اور عیوب بیان کئے ہیں۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی خوبی انتظام نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶ اس کے قریب سے ہاتھیوں کی دوڑ ہوی تو اُن کے پاؤں کی دھمک سے چھت گرپڑی (اور سلطان اور پانچ آدمی جو وہاں موجود تھے اُس کے نیچے دب کر مرگئے) اور بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایسی عمارت بنانے کا مقصود ہی یہ تھا کہ اُلغ خاں (شہزادہ جونا) باپ کی جان لینی چاہتا تھا، جسے ضیاءالدین برنی نے فیروزشاہ تغلق کے خوف سے اپنی تاریخ میں ظاہر نہیں کیا۔ "اما بر ضمائر ارباب بصیرت پوشیدہ نہ خواہد بود کہ ایں حکایت از عقل بسیار بعید است، چہ کہ اُلغ خاں با پدر بر سر مائدہ حاضر بود، ایں کرامات از کجا داشت کہ بمجرد برآمدن او سقف فرود آید؟ و از ہمہ رنگین تر آنکہ صدر جہاں گجراتی در تاریخ نوشتہ کہ اُلغ خاں ایں عمارت را بہ طلسم برپا داشت، و حاجی محمد قندھاری در تاریخ خویش نوشتہ کہ دراں ساعت کہ سلطان بدست شستن مشغول بود، صاعقہ از آسمان نازل شد و سقف شگافتہ بر سرش ریخت۔ و ایں روایت بر تقدیر وقوع بصحت اقرب می نماید، واللہ اعلم" (صفحہ ۲۳۴) لیکن راقم الحروف کا قیاس یہی ہے کہ درحقیقت چھت ہاتھیوں کی دھمک سے اتفاقاً گری اور بعض لوگوں نے بدگمانی سے یقین کرلیا کہ اس میں ضرور شہزادہ جونا کی غداری کا دخل تھا کہ وہ بچ گیا اور باپ اور بھائی دب کے مرگئے، مُلا عبدالقادر بدایونی کی رائے بھی فرشتہ سے ملتی جلتی ہے (دیکھو منتخب التواریخ صفحہ ۲۲۴)

ممالک قریب و بعید کا فرق مٹا دیا تھا اور جس وضاحت سے نواحِ دہلی کی جمعبندی اور مساحت و مالگزاری کے نقشے، نیز سرکاری آمد و خرچ کا حساب "دیوان وزارت" میں موجود رہتا تھا، بالکل اسی طرح بنگالے اور دکن کے دیہات کے تمام کاغذات قصرِ ہزار ستون میں مہیا ہو گئے تھے اور "جس طرح کہ حسابات پہنچنے کے بعد مضافاتِ دہلی کے کارکنوں اور متصرفوں کے کام کی جانچ پرتال ہوتی تھی اور بقایا اور فواضل میں چند پیسے کی چوک محال تھی، بالکل اسی طرح دُور دراز کے کارکنوں، متصرفوں اور والیوں سے ایک ایک پیسے کا حساب لے لیا جاتا تھا . . . اور ہر روز سو دو سو شاہی فرمان تمام اقطاع و بلاد کے حکّام کے نام نافذ ہوتے رہتے تھے چنانچہ ایک نیا محکمہ (دیوان)، محض شاہی فرامین کی تحریر و نفاذ اور جوابات وصول کرنے کے لئے قائم کر دیا گیا تھا . . . " (صفحات ۳۶۸ و ۳۷۰)

ان اصلاحات نے قدرتی طور پر سرکاری مداخل میں نمایاں اضافہ اور شاہی خزانے کو معمور کر دیا۔ سلطان کی داد و دہش دُور دُور تک مشہور ہو گئی تھی اور مستحقین و مساکین، علماء و طلبہ کو اس کی سرکار سے لاکھوں روپیہ تقسیم ہوتا تھا بیرونی ممالک کے جس قدر اشخاص اس کے عہد میں دہلی آئے، کبھی نہ آئے تھے، اور جیسا کہ ابن بطوطہ نے تصدیق کی ہے یہ شہر اب جنوب وسطی ایشیا کا سب سے بڑا مرکز و مرجع بن گیا تھا۔ لیکن برنی کا یہ خیال کہ سلطان کی مالی اصلاحات محض اس داد و دہش کو

دکن میں اسلامی نوآبادی۔

جاری رکھنے کے لئے تھیں، صحیح نہیں ہے۔ یہ صرف طبعی فیاضی تھی کہ اس کے دربار سے کوئی سائل خالی نہ جاتا تھا، یا یہ کہ ذاتی واقفیت کی بناپر وہ اہل علم اور فقرا کی، اُن کی درخواست کے بغیر، نہایت دریادلی سے خدمت کرتا تھا۔ لیکن درحقیقت مالی اصلاح نیز اضافہ محاصل[1] میں جو کوشش محمد تغلق نے کی، اُس کی اصلی غرض کچھ اور تھی۔ وہ نہایت بلند خیال فرماں روا تھا۔ فن سپہ گری کی طرح علم کی اکثر شاخوں میں اس نے مہارت حاصل کی تھی۔ اُس کی ذہانت و زیرکی، نیز قوتِ استدلال وطلاقت لسانی، کی بھی بعض دلچسپ شہادتیں محفوظ ہیں غرض مختلف قابلیتوں کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز و نمایاں نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملکی خوش حالی اور وسعتِ سلطنت کے جو منصوبے اُس نے سوچے تھے اُن میں کوئی شخص اُس کا مشیر و صلاح کار نہ تھا اور وہ لوگوں کو بالکل انوکھے

۱؎ سلطان محمد تغلق نے شرح مالگزاری کو کئی گنا بڑھانے کے علاوہ، نئے نئے محصول بھی رعایا پر لگا دئے تھے جن میں "کیٹل ٹیکس" اور "ہوس ٹیکس" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں انہیں محض "گاؤ شماری" و "خانہ شماری" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ صفحہ ۲۳، بحوالہ تاریخ مبارک شاہی ؛ اس جگہ یہ تصریح کردینی مناسب ہوگی کہ ابن بطوطہ کے سفرنامے اور برنی کی تاریخ کے سوا، اس عہد کے حالات کو فرشتہ طبقاتِ اکبری اور منتخب التواریخ میں ایسی کئی قدیم تواریخ کو سامنے رکھکر جمع کیا ہے جواب ناپید ہیں منہ ۱۲

اور محض تکلیف دہ معلوم ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رعایا کی چیخ پکار اور عام مخالفت کے باوجود ان منصوبوں پر بادشاہ کا عمل کرنا اُس کی مطلق العنانی اور خود رائی کی دلیل ہے جس نے آخر کار اُسے بڑی طرح ناکام و رسوا کیا۔ بایں ہمہ اُس زمانے کے سیاسی آئین کے بموجب محمد تغلق اس بات کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ بادشاہ نے نیک نیتی سے بہبودِ عام کی جو تدابیر سوچی ہیں، اُن پر علی الرغم جمہور عمل کرے۔ انہی منصوبوں میں سے ایک، دکن میں اسلامی نو آبادی بسانے کا منصوبہ تھا اور سلطان کا یہ خیال درحقیقت درست تھا کہ جب تک خاص اہتمام نہ کیا جائے گا، شمالی ہند کے مسلمان یہاں آکر نہ بسیں گے اور اس لئے ان ممالک پر اطمینان سے حکومت کرنا محال ہوگا۔ نظر بریں اُس نے شہر دیوگیری کو دولت آباد کے نئے نام سے، اپنا جنوبی پایۂ تخت قرار دے کر، یہاں سے دہلی تک صاف راستہ بنوایا اور ہر منزل میں کئی کئی سرائیں تعمیر کرائیں جن میں ٹھیرنے اور کھانے پینے کا کافی انتظام تھا۔ عمائد و امرائے دہلی سے منہ مانگی قیمتیں دے کر اُن کے دہلی کے مکانات اور جائدادیں خرید لیں اور حکم دیا کہ اب وہ اہل و عیال کے ساتھ دکن جاکر دولت آباد میں آباد ہوجائیں۔ لائق ذکر یہ بات ہے کہ اس تجویز پر سلطان کے ایما سے سب سے پہلے خود اُس کی ماں مخدومۂ جہاں نے عمل کیا جن کے ہمراہ متعلقین، ملازمین، علماء اور درویشوں کی پوری جماعت دہلی سے اُٹھ کر

دولت آباد آگئی! (۲۳...)

دکن میں لوگوں کے بسانے کی بظاہر اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ صرف ایک شہر کی آبادی کو دولت آباد میں منتقل کرکے پھر اس شہر (دہلی) کو گرد و جوار کے لوگوں سے دوبارہ معمور کر دیا جائے۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق نے یہی کوشش کی تھی لیکن بدنصیبی سے اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی سخت خشک سالی ہوئی اور دوآب کے بہت سے کسان جو بادشاہ کی زیادہ طلبی سے پہلے ہی عاجز و مفلس رہ گئے تھے، زراعت چھوڑ کر رہزنی کرنے لگے۔ ادھر دہلی کا تخلیہ اور ہندوستان کی اندرونی ہلچل سن کر مغلوں نے حملہ کیا اور سارے پنجاب کو تاراج و تباہ کر گئے۔ (۲...)

فتح "خراسان" کا ارادہ

سلطان یہ اطلاع ملتے ہی دہلی پہنچ گیا تھا اور اس نے نہ صرف حملہ آوروں کو اپنے ملک سے دفع کیا بلکہ اُن کے حملوں کے مستقل سدباب کی وہ تدبیر سوچی جو حقیقت میں دفاعِ ہند کی بہترین ضمانت ہوسکتی تھی: یعنی اُس نے ارادہ کرلیا کہ اپنا پہلا مورچہ کوہستانِ سلیمان کے پار، اس ملک میں قائم کرے جو مغلوں کے قبضے میں رہ کر ہندوستان کے حملوں میں جنگی مرکز کا کام دیتا تھا۔ افغانستان کے یہ ہمسایہ علاقے بالعموم خراسان کے مغل صوبہ داروں کے ماتحت رہتے تھے اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ضیاء الدین برنی اس ارادہ کو "فتح خراسان" کا منصوبہ کہتا ہے حالانکہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ شاید سلطان

صرف موجودہ افغانستان پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا اور اُس کے لئے جنگی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اُس نے وہاں کے ذی اثر لوگوں کو لاکھوں روپیہ دیا تھا کہ حملے کے وقت وہ ہندی حملہ آوروں سے مل جائیں۔

سکۂ مس

ہمعصر مورّخ نے اِن واقعات کو ذاتی ناراضگی اور کم فہمی کیوجہ سے بہت بُرے پیرائے میں لکھا ہے اور اگر ہم غور و احتیاط کے ساتھ اصلی واقعات اور اُس کی رائے میں امتیاز نہ کریں گے تو اکثر فارسی اور انگریزی تاریخ نویسوں کی طرح ، راستے سے بھٹک کر ، اصلی حالات کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکیں گے ۔ ورنہ ، شمالی ہند کے سب سے دولتمند شہر کے باشندوں کا دکن چلے جانا ، دولت آباد کو اہتمام خاص کے ساتھ بسانے کے سرکاری مصارف ، اضافۂ محاصل ، خشک سالی اور مُغلوں کی لوٹ مار کی وجہ سے رعایا کی محتاجی اور آخر میں بادشاہ کی پرویسیوں کو داد و دہش اور "فتح خراسان" کے لئے بہت سے روپے کا ہندوستان سے باہر نکل جانا بہ ترتیب ذہن نشین کرنے کے بعد محمدؐ تغلق کے اُس منصوبے کا اصلی سبب بلا دقت سمجھ میں آجاتا ہے جس کی ہمارے مورّخ نے سب سے زیادہ ہنسی اڑائی ہے ۔ حالانکہ خود اسی کے بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں سونے چاندی کے سکّے کا قحط ہوگیا تھا اور اس نے زراعت اور تجارت ہر قسم کے کاروبار میں رکاوٹ پیدا کردی تھی ۔

بیرونی مہمات کے واسطے حکومت کو "زرِ خالص" کی ضرورت تھی اور خزانے میں اتنا سونا چاندی موجود نہ تھا کہ جن کے سکے اندرونی اور بیرونی ضروریات کے واسطے کافی ہوجائیں۔ پس محمد تغلق نے، جو اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ سکہ کا منشا محض مبادلۂ اجناس میں سہولت پیدا کرنا ہے، تانبے کا وہ سکہ یا اشرفی جاری کی جس کی قانونی قیمت آج کل کے "کرنسی نوٹ" کی طرح اصل قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔ واضح رہے کہ ممالکِ چین میں ایسے کاغذی سکے کے رواج کا بہت قدیم زمانے سے پتہ چلتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اخیر میں یعنی سلطان محمد تغلق کے عہد سے تیس چالیس برس پہلے بھی وہاں اور نیز ایران میں مغل بادشاہوں نے اسی قسم کے کاغذی سکے جاری کئے تھے جن پر شاہی مہر ہوتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کو زیادہ دیرپا سکہ چلانا منظور تھا اور اس نے اپنی رعایا کی ایمانداری کے بھروسے پر یہ تانبے کی "اشرفیاں" ضرب کرا کے ان کی قانونی قیمت سونے کی اشرفیوں کے برابر قرار دی تھی اور کچھ عرصے بعد لوگوں کو اختیار دے دیا تھا کہ جب چاہیں اپنی "مہر مس" کی فرضی قیمت کے برابر سونا چاندی سرکاری خزانے سے وصول کرلیں۔[1]

[1] ہمعصر مؤرخ نے اس تمام قصے کو بہت اجمالی اور طعن آمیز طریقے سے لکھا ہے (ص ۴، ۷۶، ۴۷۶) اور بعد کے فارسی مؤرخ بھی اسی کے اقوال کو نقل کرتے ہیں۔ لیکن جدید تاریخوں میں اس مسئلے پر ایڈورڈ ٹامس نے کافی تفصیل و تحقیق کے

یہ تانبے کی اشرفی ۷۳۰ھ سے ۷۳۲ھ تک شاہی ٹکسال میں ضرب ہوتی رہی لیکن اس تین سال کے عرصے میں لوگوں نے اسی قسم کی بے شمار جعلی اشرفیاں خود بنا بنا کے چلانی شروع کردیں کیونکہ اِس زمانے کی کلوں کی طرح اُس زمانے کے سکّے بنانے کے اوزار عام زرگروں کی دسترس سے باہر نہ تھے، اور اتنے وسیع ملک میں تانبے کی معمولی دھات کا جعلی سکّہ بنانے سے لوگوں کو باز رکھنا بادشاہ کی قدرت میں نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں جعلی سکّے کی وہ کثرت ہوئی کہ "مہرِ مِس" کی وہ قانونی قدر و قیمت غائب ہوگئی اور سلطان کو ناچار یہ نیا سکّہ منسوخ کرنا پڑا اور جو تانبے کے سکّے لوگوں کے پاس موجود تھے، عام اس سے کہ جعلی تھے یا اصلی، اُسی قانونی قیمت پر خزانے میں واپس لینے پڑے جو سرکار نے اجرا کے وقت قرار دی تھی۔

معلوم ہوتا ہے اسی ناکامی اور نقصان نے "فتحِ خراسان" کے منصوبے پر پانی پھیر دیا لیکن آئندہ کئی سال کے واقعات کا تاریخ سے ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ ہم "مہرِ مِس" کی مجتہدانہ ترویج کے اقتصادی نتائج کا صحیح اندازہ کرسکیں البتہ چھ برس کے بعد جب ہم سلطان کو فتحِ چین کی جنگی تیاریاں کرتے دیکھتے ہیں تو قیاس ہوتا ہے کہ خزانۂ عامرہ

"مہم تبت" ۷۳۸ھ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۳ ساتھ بحث کی ہے اور سلطان کی جدت پسندی اور نیک نیتی بہت سراہا ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر "انکلز آف دی پٹھان کنگز" صفحات ۲۳۹ تا ۲۵۲۔

جو کچھ نقصان تانبہ کے سکّے کی بدولت اٹھانا پڑا ہو' وہ اس عرصے میں پورا کرلیا گیا تھا اور ممالک ہند پر سلطان کا اتنا تسلّط قائم تھا کہ اطمینان کے ساتھ ایسے مُلک پر فوج کشی کرے جو آج تک ہندوستان کے کسی فرماں روا نے فتح نہیں کیا تھا۔ امرا نے اس ارادے سے بادشاہ کو روکنا چاہا تھا مگر محمد تغلق نے کسی کی نہ سُنی اور اس کے حکم سے سپہ سالار خسرو ملک فوجِ کثیر کے ساتھ نیپال کے راستے غالباً تبّت کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ لیکن راستے کی دشواری اور پہاڑی لوگوں کی شدید مزاحمت نے اِدھر تو اُس کا تعلق اپنے ہندوستانی مرکز سے منقطع کردیا اور اُدھر اِس غیر آباد مُلک میں رسد میسّر نہ آئی۔ پھر سردی اور بارش نے ہندوستانی فوج کی ہمّت پست کردی اور وہ کافی نقصان اٹھاکر ناکام واپس چلی آئی۔ سلطان اس پسپائی سے نہایت ناراض ہوا اور جو فوجیں پیچھے تھیں اور بڑھنے والوں کو مدد نہ پہنچا سکی تھیں' ان کے قریب قریب ہر سپاہی اور سردار کو نمک حرامی کے جرم میں اُس نے بہت سخت سزائیں دیں۔

قحط اور بغاوتیں۔ برنی واقعات کو جس بُری شکل میں پیش کرتا ہے' اُسے دیکھکر قیاس ہوتا ہے کہ شاید محمد تغلق کے دماغ میں فتور تھا۔[1] حالانکہ

[1] چنانچہ الفنسٹن صاحب نے یہی رائے قائم کی ہے (صفحہ ۳۹۵) جس کی "اصابت" کی ونسنٹ اسمتھ صاحب بھی تصدیق کرتے ہیں (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۲۳۸) اگرچہ یہیں الفنسٹن نے کسی اسلامی بادشاہ کی تھوڑی سی تعریف بھی کردی ہے تو اسے ونسنٹ اسمتھ صاحب نے خاص اہتمام کے ساتھ رد کیا ہے۔

وہ خود سلطان کی ذہانت و فراست کا قائل ہے اور بہت سے قرائن و واقعات سے بھی اس کی ہوش مندی، خوش فہمی اور کارکردگی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تبت کی ناکامی پر اُس نے جو سزائیں دیں ہم انہیں محض بے عقلی اور جوشِ غضب پر محمول نہیں کریں گے بلکہ یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ وہاں "فوج رویمن" نے اپنے حملہ آور حصّے کو مدد دینے میں سلطانی ہدایات کی پابندی نہیں کی اور ادائے فرض میں غفلت و تساہل سے کام لیا، مگر اسی کے ساتھ یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان خطاکاروں کو سزا دینے میں جلّادی اور بے رحمی سے کام لیتا تھا اور اُس کی سخت گیری نے غالباً حکام و رعایا کو اس سے بیزار کردیا تھا۔ اِدھر یہی زمانہ ہے کہ شمالی ہند میں ڈیک اور قحط ایسا سخت پڑا کہ سات برس تک[1] بارش نہ ہونے کی وجہ سے ضلع کے ضلعے ویران اور بنجر ہوگئے۔ حوالیِ دہلی میں غلّہ میسّر نہ آتا تھا، لہٰذا بہت سے فاقہ کش کسان رہزنی کرنے لگے اور مغربی دوآب اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں سخت مصیبت و پریشانی پھیل گئی۔ سلطان محمد تغلق نے بڑی مستعدی سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور کئی سال تک موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں مقیم رہ کر اقطاعِ دہلی میں رسد رسانی اور از سرِ نو وسائلِ زراعت و آب پاشی مہیّا کرنے کا انتظام کرتا رہا[2]

---

[1] منتخب التواریخ (صفحہ ۲۳۳) بحوالہ "مبارک شاہی"۔

[2] برنی۔ صفحات ۴۸۴، ۴۸۵، وغیرہ۔

پنجاب میں بعض شوریدہ سر زمینداروں نے جو فساد مچا رکھا تھا اُسے بھی خود جاکر دفع کیا لیکن ظاہر ہے کہ ان انتظامات نے خزانے پر بہت بڑا بار ڈال دیا ہوگا اور اسی کو پورا کرنے کے لئے بادشاہ نے دوسرے صوبوں کے مالئیں وہ اضافے کئے جنہیں ادا کرنے سے بعض صوبہ داروں نے پہلوتہی کی اور جب صدر حکومت کی طرف سے سختی ہوئی تو علانیہ منحرف ہوگئے۔

یہ خیال بھی کہ رعایا خستہ حال، سلطانی سپاہ بے دل اور خزانہ خالی ہے، بغاوت پسند صوبہ داروں کے لئے موجب تحریک تھا، اور جب ایک نے سرکشی کی تو دوسروں کا حوصلہ بڑھ گیا چنانچہ آئندہ دس گیارہ سال میں (۱۳۵۱ء تک)، مالوہ، کٹرہ، بنگال، دکن، ملیبار، گجرات، اور سندھ میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن سلطان محمد تغلق کی بلند ہمتی اور جنگی مستعدی کا اس سے بڑھکر ثبوت کیا ہوگا کہ وہ ہر صوبے میں خود فوج لے کر گیا اور اکثر مقامات پر باغیوں کا قلع قمع کرنے میں کامیابی پائی۔ حتیٰ کہ صرف بنگال اور دکن ایسے صوبے تھے جہاں باغیوں نے دوبارہ کافی قوت فراہم کرلی اور سلطان بُعدِ مسافت نیز دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے دوبارہ اِن کی سرکوبی کرنے کا موقع نہ پاسکا۔ ورنہ ہندوستانِ خاص، مالوہ اور گجرات کے باغیوں کا اس نے نام و نشان مٹا دیا اور بعض گجراتی مفرورین کے تعاقب میں سندھ آیا تھا کہ بخار میں مبتلا ہوا اور کچھ روز حالتِ سفر میں بیمار رہ کر، یہیں، ٹھٹھہ کے قریب،

وفات پائی (محرم ۷۵۲ھ، ۱۳۵۱ء)

۳- "عہدِ لامرکزیت"

دکن کی خود مختاری

مالوے کی بغاوت کے اصلی مجرم "امرائے صدہ" تھے۔ یہ لوگ دراصل فوجی سردار اور جنگ کے وقت فوج کی ایک مقررہ جمعیت فراہم کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اس فوج کے مہیا اور مرتب رکھنے کے عوض میں انہیں بعید اقطاع میں جاگیریں دے دی جاتی تھیں اور تاریخ فیروز شاہی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ علاءالدین خلجی کے پہلے سے رائج تھا۱ اور گو یہ بادشاہ بھی اس کے خلاف تھا لیکن سلطان محمد تغلق کو اپنے عہدِ حکومت میں ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ وہ اس آئین کا سخت دشمن ہوگیا اور مالوے کے باغیوں کا استیصال کرتے ہی اُس نے دکن کے امرائے صدہ کو بھی فوجی امداد کے بہانے سے اپنے پاس طلب کیا۔ قرینہ کہتا ہے کہ وہ ان کی جاگیریں واپس لیکر نقد تنخواہ پر ملازم رکھنا چاہتا تھا لیکن یا تو ان امراکو پہلے آئین میں ردوبدل پسند نہ تھی اور یا واقعی انہیں سلطان کی بدمزاجی کے باعث اپنی جان کا خوف پیدا ہوگیا تھا کہ وہ مالوے جاتے جاتے راستے میں رک گئے اور متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا کہ سلطان کی اطاعت نہ کی جائے بلکہ دکن میں اپنی ایک آزاد حکومت علیحدہ قائم کرلی جائے۔ اس حکومت

---

۱ فیروز شاہی، صفحہ ۹۵۔

کے لئے انہوں نے بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد امیر اسمٰعیل فتح کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور سلطان ناصرالدین شاہ کے لقب سے دولت آباد میں اس کی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ (فرشتہ)

اسی موقع پر جدید انتظامات کی ضمن میں حسن نامی امیرِ صدہ کو خطاب ظفرخاں کے ساتھ گلبرگہ اور اس کے قریب تین اقطاع کی حکومت سپرد ہوی اور اُس نے یہاں پہنچ کر بہت جلد اتنی قوت بہم پہنچالی کہ سلطان محمّد تغلق بغاوت فروکرنے کے لئے دکن آیا تو اسے ایک فوج خاص حسن کی سرکوبی کے لئے گلبرگہ بھیجنی پڑی جس کا سپہ سالار سلطان کا داماد عماد الملک (سرتیز) تھا۔

محمّد تغلق نے دکن کے باغی بادشاہ کو دولت آباد پہنچ کر محصور کرلیا تھا لیکن اسے بہت جلد بغاوتِ گجرات کی خبر سن کر واپس جانا پڑا اور باغیوں کی سب سے بڑی لڑائی سلطان کی دوسری فوج کے ساتھ بیدر کے قریب ہوی جس میں حسن کو دولت آباد اور نیز جنوبی ہند کے راجہ سے معقول مدد مل گئی اور جنگ میں عماد الملک کہ "در شجاعت و مردانگی ضرب المثل روزگار بود" مارا گیا۔ سلطانی افواج نے شکست کھائی اور دکن کے یہ مغربی اقطاع دہلی کے قبضے سے نکل گئے تھے[1]

سلطنت بہمنیہ

سلطان محمّد تغلق کو اس ہزیمت اور داماد کے مارے جانیکی

---

[1] فرشتہ۔ صفحہ ۲۷۶۔

اطلاع گجرات میں ملی تو نہایت آزردہ ہوا اور غالباً پوری طرح یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی کہ دکن میں جبراً مسلمانوں کو بسانا، ایک اسلامی اور قومی خدمت ہو تو ہو، سلطنت دہلی کے حق میں سازگار نہ تھا۔ دکن کی ہندو ریاستوں کی فتح کبھی اس قدر دشوار نہ تھی جس قدر کہ نوآباد مسلمانوں کی بغاوت کو فرو کرنا دشوار تھا۔ نظر بریں اُس نے دکن پر دوسری مہم بھیجنی ملتوی کردی اور قصد کرلیا کہ گجرات و سندھ کے جھگڑوں سے فرصت پاکر بذات خود دکن پر خاص اہتمام کے ساتھ فوج کشی کی جائے[1]۔ اِدھر حسن ظفر خاں کی نمایاں فتح نے اُس کی ذاتی شہرت واثر کو چار چاند لگادئے اور دکن کے سنئے بادشاہ نے کمال حق پسندی اور ایثار کے ساتھ اپنے سر سے تاج شاہی اتار کے اس اقبال مند سردار کے سر پر رکھدیا۔ اُمرا نے بھی اس تجویز پر صاد کی اور ماہ ربیع الاوّل ۷۴۸ھ؁ ۱۳۴۷ء میں حسن ظفر خاں نے "علاء الدین حسن بہمن شاہ" کے لقب سے دکن کی نئی اسلامی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی[2]۔

[1] سلطان نے اس موقع پر جو گفتگو ضیاء الدین برنی سے کی وہ پڑھنے کے لائق ہے، اور اس سے محمد تغلق کے غم و غصہ کا اندازہ ہوتا ہے (برنی صفحہ ۵۲۱ و ۵۲۲)

[2] حسن اپنی ابتدائی غربت و گمنامی کے زمانے میں ایک ہندو جوتشی، گنگو یا گانگو برہمن کا نوکر تھا۔ اور جب اِس برہمن کی سفارش سے دربار سلطانی میں رُوشناس ہوا تو اُسے حسن گنگو بہمنی یا برہمنی کہنے لگے تاکہ اس نام کے دوسرے اُمرا میں اور اس میں امتیاز رہے۔ بادشاہ ہونے کے بعد غالباً اسی عقیدہ میں

سلطان علاء الدّین حسن نے اپنے پہلے مستقر گلبرگہ ہی کو حسن آباد یا احسن آباد کے نام سے دکن کی سلطنت کا پائے تخت بنایا تھا اور پہلے یہاں اور پھر نئے پائے تخت (احمد آباد) بیدر میں اس خاندان کے بادشاہ تقریباً پونے دوصدی تک فرماں روائی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۶۰) تصرّف کرکے اُس نے اپنے لقب کا آخری حصّہ "بہمن شاہ" قرار دیا تھا لیکن خوشامدی مصاحبوں نے اتنی گنجائش پاتے ہی اس کا شجرۂ نسب قدیم ایران کے مشہور بادشاہ بہمن بن اسفندیار سے ملا دیا اور اسی قسم کی "شہادتوں" کی بناپر حال میں انگریز تاریخ نویسوں نے بھی اس کے شاہی لقب کی یہی وجہ قرار دے دی کہ وہ اپنے آپ کو شاہانِ ایران کی اولاد میں سمجھتا تھا (اوکس ہس صفحہ ۲۷۰) مگر فرشتہ جس نے تین صدی پہلے خاص دکن میں بیٹھکر اپنی مشہور تاریخ تالیف کی ہے اس روایت کی بخوبی چھان بین کرچکا ہے اور کئی کتابوں کا حوالہ دے کر جن میں حسن کے مذکورۂ بالا شجرۂ نسب کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لکھتا ہے کہ "امّا آنچہ بخاطر ناقص جامعِ ایں اخبار می رسد، آنست کہ چوں نام گانگوئے بہمن جزو نام سلطان علاء الدّین حسن گردیدہ اورا بہمنی گفتند۔ امّا شعراء و مورّخان خوشامد گوئے را دستاویزے بہم رسیدہ، ایں معنی را درلباس دیگر جلوہ دادند" (صفحہ ۲۸۲) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج بھی حسن کے قدیم پائے تخت گلبرگہ میں "بہمنی محلہ" موجود ہے اور اس میں جو برہمن لوگ آباد ہیں وہ اُسی گنگو برہمن کی اولاد سمجھے جاتے ہیں جو اپنے پرانے نوکر "حسن" کا بادشاہ ہونا سن کر دکن چلا آیا تھا۔ شریف النفس بادشاہ نے بھی اپنے قدیم مربّی کی بڑی عزّت و توقیر کی اور اسے اپنا وزیرِ سلطنت بنالیا تھا۔

کرتے رہے اور گو حکومت کا خاتمہ چند سال پہلے ہو چکا تھا لیکن ۹۳۳ھ ۱۵۲۷ء میں اس خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔

ان بادشاہوں کے نام اور سنین حکومت تتمہ کتاب میں درج ہیں۔ ان کی مفصل تاریخ لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں لیکن اجمالی طور پر یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ سلطنت بہمنی کی حدود حکومت اپنے عروج کے زمانے میں شمالی دکن کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک پہنچ جاتی تھیں اور وین گنگا ان کی شمال مشرقی سرحد بناتی تھی۔ ملک برار پر ان کا قبضہ تھا لیکن اسکے شمال میں، یعنی وادی تاپتی اور خاندیس میں خاندان فاروقیہ کی آزاد ریاست قائم ہوگئی تھی اور جنوب کی طرف ریاست وجیانگر[1] شاہان بہمنی کو تنگ بھدرا ندی سے آگے مستقل قبضہ نہ کرنے دیتی تھی۔

وجیانگر

اس ہندو ریاست سے جو غالباً ۷۴۶ھ ۱۳۴۵ء[2] میں ایک مستقل سلطنت بن گئی تھی، شاہان بہمنی کی بارہا لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی ایک فریق غالب آتا تھا کبھی دوسرا۔ لیکن اس پیہم جنگ و جدال کا مجموعی طور پر جو کچھ نتیجہ نکلا وہ گویا دکن کے مسلمانوں کو سبق دیتا تھا کہ شمالی ہند سے تعلق قطع کرنے کے بعد خود ان کا اتنی بڑی اور قوی فوجیں مرتب کرنا دشوار تھا کہ جو

۱۔ فارسی مورخ اس ریاست اور شہر کو بیجانگر کہتے ہیں۔

۲۔ ریاست وجیانگر کی تاریخ کے اکثر سنین و واقعات قیاسی ہیں مگر ہم نے اس کے حالات بیان کرنے میں ونسنٹ اسمتھ کی پیروی کی ہے (اوکسفورڈ ہسٹری صفحات ۳۰۰ تا ۳۱۷)۔

افواجِ علائی کی طرح جنوبی ہند کے انتہائی حصّے تک ملک فتح کرتی چلی جائیں گے۔ ادھر ان لڑائیوں نے جنوبی ہند کے باشندوں کو اتنا متحد اور جنگ میں مشّاق بنا دیا کہ پھر وہ عرصۂ دراز تک مسلمانوں سے مغلوب نہ ہوئے۔

اس اتّحاد اور جنگی قوّت کا مرکز شہر وجیانگر میں تھا، جس کے بعض عالیشان مندر و محلّات اور کھنڈر آج بھی اس کی عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ کردیتے ہیں۔ اس شہر یا سلطنت کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی لیکن وہاں کے سکّے، کتبات اور دکن کی اسلامی تواریخ نیز پردیسی سیّاحوں کے سفرناموں سے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں اور حال میں کوشش جاری ہے کہ ان سب ماخذوں کو ملاکر وجیانگر کی ایک مسلسل تاریخ مرتّب کردی جائے تاکہ عالیشان عمارات، دولت و صنعت، عام آسودگی، کثرت آبادی، جنگی قوّت اور درباری تزک و احتشام کی مختلف شہادتوں کے ساتھ تاریخ کے طالبِ علم وہاں کے سیاسی حالات کا بھی ایک خاکہ اپنے ذہن میں قائم کرسکیں۔ اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ دوسرے ریاست مذکور کی تاریخ کا تمام ہندوستان کے سیاسی معاملات پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا کہ ہند کی عام تاریخ میں اس کے اندرونی حالات پر بحث کی جائے۔ البتہ سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد دکن میں جو آزاد اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں اُنکی

مجمل تاریخ اور بیرونی تعلّقات کا ذکر کرتے وقت ہمیں ریاست وجیانگر کے حالات پر بھی اجمالی نظر ڈالنے کا موقع ملے گا۔

سلطنت دہلی

اس جگہ مقدّم یہ ہے کہ ہم شمالی ہند کی صدر سلطنت کے اسبابِ انحطاط کو مختصر طور پر بیان کردیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں ضعف آنیکے بعد ہندوستان میں جو خود مختار سلطنتیں جا بہ جا قائم ہوگئی تھیں، اُن کی نمایاں خصوصیاتِ تاریخی کیا تھیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان محمّد تغلق کی وفات اور اُس کے بھتیجے **فیروز تغلق** کی تخت نشینی (۷۵۲ھ) کے ساتھ ہی شمالی ہند میں عام سکون ہوگیا تھا۔ خود سلطان مرحوم باغیوں کا بزورِ شمشیر قلع قمع کرچکا تھا لیکن مُلک میں جو عام بے چینی پیدا ہوئی تھی، وہ کچھ تو نزولِ باراں اور عمدہ پیداوار نے رفع کی اور زیادہ تر نئے سلطان کی نرمی اور اعتدال پسندی نے اِس کا اثر دلوں سے محو کرادیا[1] بایں ہمہ، حکومت دہلی میں اب یہ قوّت نہ تھی کہ دکن اور بنگال کے بعید صوبوں کو جبرًا دوبارہ اپنا مطیع بنالیتی، اور گو بنگالے پر دو مرتبہ خود سلطان نے فوج کشی کی لیکن جیساکہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں آخرکار دربار دہلی نے اُس کی

---

[1] فیروز شاہ نے عہدِ محمّد شاہی کے تمام زائد محصولات اور ابواب منسوخ کردئے اور مزارعین کو آباد کرنے کے ساتھ خاص طور پر ایسے قوانین بھی نافذ کئے کہ رعایا کو سرکاری مطالبات کا ٹھیک ٹھیک علم ہوجائے اور ماتحت عہدہ داروں کو زیادہ ستانے کا موقع نہ مل سکے۔

آزادی تسلیم کرلی تھی

ہمعصر مؤرخ اس سیاسی نقصان سے قطع نظر، عہدِ فیروز شاہی کی تاریخ شمالی ہند کی عام فراغت و خوشحالی کی دلکش تصویر ہے اور اس اعتبار سے اگر اس کا درباری مؤرخ دعویٰ کرتا ہے کہ "عہدِ دولتِ فیروز شاہ چناں یادگار ماند کہ ہرگز فراموش نشود" تو یہ محض شاعرانہ مدح نہیں ہے۔ بلکہ اوّل تو اُن جزئیات سے جو اس مورخ شمس سراج عفیف نے ضمناً بے کم وکاست بیان کردی ہیں عام امن و آسودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیز خود سلطان فیروز شاہ نے جو اصولِ حکومت اور واقعات "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں بیان کئے ہیں بالواسطہ مذکورۂ بالا قول کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے تغلقوں کا دور ختم ہونے کے بعد کی جو کتابیں محفوظ ہیں اُن کی شہادت پیش کرتے وقت ہمیں کسی بیجا پاسداری کا شبہ نہیں ہوسکتا۔ ان میں "تاریخ مبارک شاہی" قابلِ ذکر ہے جس کا مولف غالباً[2] سلطان فیروز شاہ کے آخری عہد میں خاص دہلی میں موجود تھا[1]

[1] اس کتاب کا قلمی نسخہ ایڈورڈ ٹامس کو مل گیا تھا، اور اسی کا انگریزی میں خلاصہ الیٹ کی تاریخ ہند میں شامل کردیا گیا ہے (جلد سوم صفحہ ۴، ۲۷ وغیرہ) لیکن اس کتاب کا پورا مضمون سلطان فیروز شاہ نے دہلی کی جامع مسجد کے گنبد پر کندہ کرادیا تھا اور غالباً عہدِ اکبری تک یہ کتبہ موجود تھا۔ (دیکھو فرشتہ ۱۵۰ طبقاتِ اکبری حالات سلطان فیروز شاہ۔)

[2] الیٹ جلد چہارم صفحہ ۶۔

مگر اُس نے اپنی کتاب فیروز شاہ کی وفات کے بہت عرصہ بعد (۸۵۲ھ میں) تالیف کی تھی جب کہ دہلی میں خاندان سادات کے بادشاہ فرماں روا تھے۔

عام فراغت و آسودگی۔

انہی سیدوں کے عہد میں اطالی سیاح نکولوڈی کونٹی ہندوستان آیا تھا (۸۲۴ھ) اور اُس نے گجرات و دوآب کی زرخیزی، کثرتِ آبادی، عام دولتمندی اور خوشحالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ گویا تاریخ فیروز شاہی کی بہترین تصدیق ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ گنگا کے دونوں کناروں پر برابر بستیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے جو ہر طرف سے خوبصورت باغات اور تاکستانوں میں گھری ہوئی ہیں۔[1]

باغات کی یہ ترقی خاص طور پر عہد فیروز شاہی کی یادگار معلوم ہوتی ہے کیونکہ گو کھجور، انگور اور نیشکر کی وسیع پیمانے پر کاشت کرانے کا سلطان محمد تغلق نے منصوبہ باندھا تھا۔ اور خاص اسی غرض سے ایک علیحدہ محکمہ بھی قائم کر دیا تھا[2] لیکن وہ اپنی زندگی میں اس پر خاطر خواہ عمل نہ کر سکا، اور شاید اس کے تمام منصوبوں میں یہی منصوبہ ایسا تھا جس کی عہد فیروز شاہی میں ایک حد تک تکمیل ہوئی چنانچہ صرف دہلی کی نواح میں بارہ سو نئے باغات و تاکستان تیار ہو گئے اور ہندوستان میں بھی عمدہ سے عمدہ قسم کا انگور

۱ الفنسٹن صفحہ ۴۷۷۔

۲ برنی، صفحہ ۴۹۸

پیدا ہونے لگا ہے[1]

زراعت کی ترقی اور آب پاشی کے لئے جا بہ جا پانی کے بند باندھے گئے تھے جنکی تعداد پچاس بتائی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اِن کے مفصّل حالات و مقامات معلوم نہیں کہ جو فائدہ اِن سے پہنچا اس کا صحیح اندازہ ہوسکتا لیکن اس عہد کی مشہور نہر جو حصار کے علاقے میں کھودی گئی تھی، آج بھی موجود ہے اور کم سے کم ایک سو پچاس میل لمبی تھی[2]، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ کام کس پیمانے پر انجام دئے جاتے تھے۔

اس غیر آباد علاقے میں خود یہ شہر (حصارِ فیروز) سلطان فیروز تغلق نے تعمیر کیا تھا اور ابھی تک جنوبی پنجاب کے مغربی اضلاع کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسی طرح کڑہ سے آگے بڑھکر شہر جونپور کی بنیاد اسی بادشاہ نے رکھی جو کچھ عرصے بعد "سلطنت شرقی" کا پائے تخت ہوگیا۔ تاریخوں میں اور بھی کئی شہروں یا قلعوں کا ذکر آتا ہے جنہیں سلطان فیروز شاہ نے بنوایا یا ازسرِنو آباد کیا تھا اور فرشتہ نے اس کے "ذکرِ خیر" کو جن عماراتِ فیروز شاہی کی فہرست پر ختم کیا ہے اُن میں بہت سی مسجدیں، مدرسے، دار الشفا اور حمام شامل ہیں کہ اُن سے ہر خاص و عام منفعت فائدہ اٹھاتا تھا اور تمام مصارف شاہی اوقاف سے ادا ہوتے تھے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج)، صفحات ۲۹۵، ۲۹۶۔

[2] گزیٹیر جلد سوم صفحہ ۳۲۷۔

حکومت کی کمزوری۔

اس عام فراغت و آسودگی اور سلطان کی رعایا پروری کے باوجود اس کے آخری زمانے میں حکومت دہلی کی سیاسی قوت میں زوال آگیا۔ یعنی بوڑھے بادشاہ کی نیک دلی اور کمزوری سے چالاک درباریوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملنے لگا اور **خان جہان** وزیر **سلطنت** کے تمام کاروبار پر حاوی ہوگیا۔ سلطان کی اولاد اور اعزہ کو خان جہان کا اقتدار ناگوار تھا اور اسی باہمی حسد کی وجہ سے دربار دہلی میں آئے دن سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ سلطان فیروزشاہ نے اِن جھگڑوں سے **تنگ** آکر اپنی وفات سے کچھ مدت پہلے تمام اختیاراتِ شاہی **تغلق شاہ بن فتح خان** کے سپرد کردیئے تھے اور سلطان کے انتقال کے بعد وہی تختِ دہلی کا وارث ہوا (رمضان ۷۹۰ھ ۱۳۸۸ء)

لیکن اس ہردلعزیز بادشاہ کے مرتے ہی وہ خانگی جھگڑے اور بڑھ گئے اور کئی بار دہلی اور نواحِ دہلی میں سخت لڑائیاں ہوئیں، جن میں تختِ دہلی پر کبھی ایک حریف کا قبضہ ہوجاتا تھا کبھی دوسرے کا۔ چنانچہ صرف سات برس میں پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے[۱] اور ہم بہ آسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عزل ونصب اور خانہ جنگی نے حکومت دہلی کی مرکزیت کو

---

[۱] سلطان فیروزشاہ کا پہلا جانشین اُس کے بڑے بیٹے فتح خاں کا فرزند تھا۔ وہ چند مہینے کی بادشاہی کے بعد حریفوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور امرا نے سلطان فیروزشاہ کے دوسرے پوتے ابوبکر بن ظفرخاں بن فیروزشاہ کو تخت پر بٹھایا مگر سال آئندہ اس کے چچا ناصرالدین محمد بن فیروزشاہ نے سلطنت چھین لی

کس قدر نقصان پہنچایا ہوگا۔ گزشتہ چالیس برس کے امن اور عام خوش حالی نے بڑے بڑے صوبہ داروں کو پہلے ہی بہت دولتمند اور طاقتور بنادیا تھا۔ پائے تخت کے ان ہنگاموں نے انہیں خود مختاری کی تحریک دلائی اور ادھر سلطنت دہلی کی وقعت اور جنگی قوت کا خوف ان کے دل میں باقی بھی تھا تو اسے امیر تیمور کے حملے نے زائل کردیا۔

امیر تیمور کا حملہ

ماوراالنہر کا یہ مغل فرماں روا، جس کی حیرت انگیز فتوحات نے عہد چنگیز خانی کی یاد تازہ کردی تھی، نویں صدی ہجری کے عین آغاز میں ہندوستان آیا اور شمالی سندھ و پنجاب کے اضلاع کو پامال کرتا ہوا پہلے پانی پت کے قریب دریائے جمنا سے اتر کر موجودہ مظفر نگر اور میرٹھ کے اضلاع میں داخل ہوا اور وہاں سے پھر پلٹ کر شہر دہلی کے جنوب میں اس نے دوبارہ دریا کو عبور کیا اور بہت معمولی لڑائی کے بعد شہر پر قابض ہوگیا۔ (جمادی الاول ۸۰۱ھ ۱۳۹۹ء)

سلطنت دہلی کا نام نہاد سلطان ناصر الدین محمود شاہ اور اس کا وزیر ملو اقبال خاں پائے تخت سے موقع پاکر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۸۔ اور خود چند سال حکومت کرنے کے بعد ۷۹۶ھ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ہمایوں خاں الملقب بہ سکندر شاہ باپ کا جانشین ہوا تھا لیکن چند ہی روز میں بیمار ہوکر مرگیا اور امرا نے بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد اس کے بھائی محمود کو منتخب کیا جس نے باپ کا لقب "ناصر الدین" بھی اپنے نام کے ساتھ بڑھا لیا تھا۔

نکل گئے تھے لیکن گو معززین شہر کی درخواست پر اہل دہلی
کو امان دے دی گئی نیز مسجد جامع میں امیر تیمور صاحبقراں کے
نام کا خطبہ پڑھا گیا، بایں ہمہ تیموری سپاہیوں نے مقررہ فدیہ
وصول کرنے میں جو سختی کی اُس کی وجہ سے اہل شہر بگڑ گئے
اور بعض مقامات پر کشت وخون کی نوبت پہنچی۔ تیمور کے
لئے اتنا بہانہ کافی تھا۔ اُس نے اعلان کرادیا کہ شہر کے تمام
باشندے فتحمند سپاہ کے قیدی ہیں، جو گویا قتل عام اور لوٹنے
کی اجازت تھی۔[1]

واضح رہے کہ پایۂ تخت دہلی اس وقت کئی شہروں کا مجموعہ
تھا اور اس میں ایسی بے شمار سنگین عمارات موجود تھیں جن کی
پناہ میں مدافعانہ جنگ کرسکتے تھے۔ پھر بھی ہزارہا لوگ
ایسے تھے جنھیں مغلوں نے بلا دقت تاراج کردیا اور جب
لوٹتے لوٹتے دل بھر گیا تو جا بہ جا آگ لگا دی۔

اس جگہ یہ صراحت کردینی چاہئے کہ گو امیر تیمور چنگیز خان کی اولاد

---

[1] اس واقعے کی بعض اہم جزئیات میں راویوں کا اختلاف ہے۔ ظفرنامہ
کا مؤلف تیمور کی پاسداری کرتا ہے اور تاریخ مبارک شاہی میں اس واقعے
کو بہت اختصار سے لکھا ہے۔ (ترجمہ انگریزی، الیٹ جلد چہارم) محمد قاسم
فرشتہ کا دادا حملہ تیموری کے وقت لاہور میں موجود تھا لہٰذا فرشتہ نے
یہ حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں، بایں ہمہ غالباً سب سے محققانہ
بیان صاحب طبقاتِ اکبری کا ہے اور ہم نے اختلافی روایات میں اسی
کی پیروی کو ترجیح دی ہے۔

میں نہ تھا نہ وہ اور اس کے سپاہی چنگیزیوں کی مثل بُت پرست اور وحشی تھے۔ پھر بھی ان نومسلموں میں "مغول" کا نسلی اثر بالکل نہیں مٹ گیا تھا اور خود تیمور کو (جس کی، جوانی میں، دینداری اور نیکدلی کی شہرت تھی) ہوس کشور کشائی نے سخت بے رحم و بے اصول بنا دیا تھا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے، ہندوستان کی اسلامی سلطنت پر اس کا حملہ کرنا سراسر ناجائز تھا۔ اور سیاسی اعتبار سے بھی اس یورش سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بابر نے انہی "تیموری فتوحات" کی بنا پر پنجاب و دہلی کی وراثت کا جو دعویٰ کیا وہ بہت بعد کی بات ہے ورنہ وقت کے وقت ہندوستان کے مسلمان حکام اور ان کی ہندو رعایا کو تیموری حملے سے شدید مصائب و نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور گویا پائے تخت دہلی کی تباہی کے ساتھ، مُلک ہند کے رہے سہے سیاسی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔

صوبوں کی خود مختاری۔ دہلی کی تاراجی کے بعد امیر تیمور بہت جلد اپنے دارالسلطنت سمرقند کو واپس چلا گیا[1] اور پنجاب و ملتان کے صوبے دربار دہلی کے ایک امیر سید خضر خاں کے حوالے کر گیا جس نے کچھ عرصے بعد (۸۱۷ھ میں)، دہلی پر قبضہ کر کے خاندان سادات کی چند روزہ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔

[1] بے حساب مال غنیمت کے علاوہ، امیر تیمور دہلی کے سنگ تراشوں کو بھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ اپنے پائے تخت میں سلطان محمد تغلق کی جامع مسجد کے نمونہ پر ترشے ہوئے پتھروں کی مسجد بنوائے (فرشتہ صفحہ ۱۵۰)

لیکن ان کمزور بادشاہوں کے بعد بھی جب کہ بہلول لودھی نے جونپور کی ریاست کو دوبارہ فتح کرکے حکومت دہلی کا ماتحت بنایا (۱۴۷۹ء) یہ سلطنت حقیقت میں شمالی ہند کی صرف ایک بڑی ریاست رہ گئی تھی جسے بعض اوقات پنجاب و راجپوتانہ کی مقامی بغاوتیں فرو کرنی تک دشوار ہوجاتی تھیں اور دور کے تمام بڑے صوبے اُس کے تسلّط سے بالکل آزاد تھے۔

جونپور کی "سلطنت شرقی"

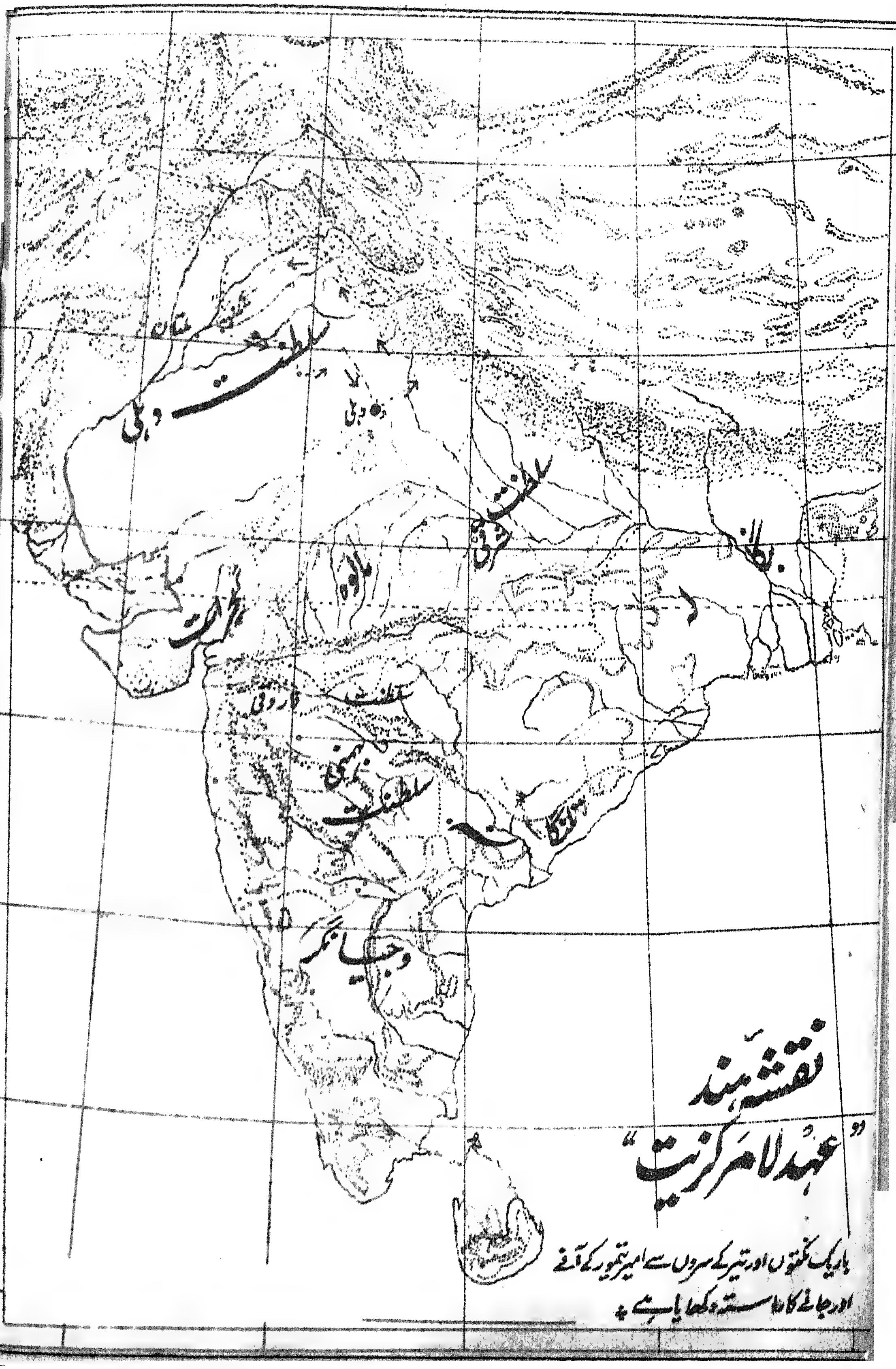
ان صوبوں میں بنگال اور دکن کی خود مختاری کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ رجب ۷۹۶ھ / ۱۳۹۴ء میں محمود شاہ تغلق کی تخت نشینی کے وقت ایک خواجہ سرا ملک سرور کو "ملک الشرق" کا لقب دیکر حکومت دہلی نے جونپور بھیجا تھا کہ دوآب کی شورشوں کا انسداد کرے۔ اس نے صدر حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر بتدریج، کڑہ، اودھ، اور بہرائچ کے اقطاع بھی اپنے قبضے میں لے لئے شمال میں ترہت اور مغرب میں بہار کے بعض اضلاع کا اپنی ریاست سے الحاق کیا اور تاریخ مبارک شاہی کا بیان ہے کہ جاج نگر کے راجہ اور لکھنوتی کے بادشاہ سے بھی اُس نے خراج وصول کیا[1] بہر حال اس کی خود مختاری میں اب کوئی کسر باقی نہیں تھی لیکن وہ باضابطہ اپنی بادشاہی کا اعلان

[1] ترجمہ انگریزی، الیٹ جلد چہارم صفحہ ۲۹ طبقات اکبری اور فرشتہ نے بھی اسی تاریخ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے۔

نہ کرنے پایا تھا کہ ۸۰۲ھ میں مرگیا اور یہ رسم اس کے پسر خواندہ کی جانشینی کے وقت پوری ہوئی جس نے "سلطان مبارک شاہ شرقی" کے لقب سے اپنا خطبہ اور سکہ جاری کیا (۸۰۳ھ) اور جیساکہ اوپر بیان ہوچکا ہے، اس سلطنت کا خاتمہ سلطان **بہلول لودھی** کے ہاتھ سے ہوا (۸۸۳ھ)

خاندیس کی سلطنت فاروقیہ

صوبۂ **خاندیس** جو پہلے سے بھی پہلے قریب قریب خود مختار ہوگیا تھا اور **ملک** راجہ فاروقی نے، جو دربار دہلی کے ایک قدیم خاندانِ اُمرا سے تھا، سلطان فیروز شاہ تغلق ہی کے اخیر زمانے میں یہاں موروثی حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی اور اسی سلطان کی وفات کے بعد سے "سلطنت فاروقیہ" کو آزاد سمجھنا چاہیئے (۸۰۱ھ، ۱۳۹۹ء) لیکن گو ملک راجہ کے جانشین سلطان **نصیر شاہ** فاروقی (۸۰۱ھ تا ۸۴۱ھ) اور پھر سلطان **عادل شاہ** فاروقی (۸۶۱ھ تا ۹۰۷ھ) کے عہد حکومت میں یہ ریاست نہایت دولتمند اور قوی ہوگئی تھی اور وسط ہند (گونڈوانہ) کے بڑے بڑے رئیس اُس کے خراج گزار تھے، بایں ہمہ مالوے اور گجرات کی خود مختار ریاستوں نے اور جنوب میں سلاطین دکن نے اُسے مستقل طور پر زیادہ وسیع نہ ہونے دیا اور ایسے طاقتور حریفوں کے مقابلہ میں یہاں کے بادشاہوں کی یہی کامیابی کچھ کم نہیں تھی کہ دوسو برس تک خاندیس خاص کے علاقے میں آزادانہ حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ فتوحات اکبری کا سیلاب جو مالوے اور گجرات کے



نقشہ ہند

"عہد لامرکزیت"

باریک نکتوں اور تیر کے سروں سے امیر تیمور کے آنے اور جانے کا راستہ دکھایا ہے۔

بادشاہوں سے نہ رُک سکا تھا، سلطنت فاروقیہ کو بھی بہالے گیا (۸۰۱ھ)

مالوہ اور گجرات — مالوہ اور گجرات رقبے میں خاندیس سے بڑے اور بہت زرخیز و آباد صوبے تھے۔ لیکن یہاں کے صوبہ دار **دلاور خان** اور **ظفر خان**، تیموری حملے کے بعد بھی کچھ عرصے تک **محمود شاہ تغلق** کی اطاعت کا دم بھرتے رہے۔ آخر ۸۱۰ھ میں **ظفر خان** نے **مظفر شاہ** کے لقب سے باضابطہ اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور اس کے دو سال بعد دلاور خان غوری کا بیٹا سلطان **ہوشنگ شاہ** کے لقب سے مالوے میں خود مختار ہوگیا (۸۱۲ھ)

اس دور کی خصوصیات — اِن آزاد ریاستوں کے تفصیلی حالات بیان کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے اور یہاں ہم ہندوستان کے اس "دورِ لامرکزیت" پر صرف ایک اجمالی نظر ڈال سکیں گے کہ کم سے کم ایک سرسری اندازہ کیا جاسکے کہ اس ڈیڑھ یا دو سو برس کے عرصے میں جبکہ مسلمانانِ ہند کا سیاسی شیرازہ بکھر گیا تھا، انھوں نے "ملوکِ طوائف" کی حیثیت سے اس ملک میں کیا کام کیا؟

(۱) لوازمِ بادشاہی — یہ ظاہر ہے کہ ہر صوبہ دار جو آزاد ہوا، اپنے اپنے مقام پر خود مختار بادشاہی کے وہ تمام لوازم جمع کرنا چاہتا تھا، جو پہلے صرف سلاطینِ دہلی کو مہیا کرنے پڑتے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر، عالی شان محلات، گراں بہا لباس و زیورات، بہتر سے بہتر سواریاں، درباری آرائش و تجمل کے بیش قیمت ساز و سامان، بادشاہی کارخانے، محکمے اور آئین، اور اسی طرح شاہانہ تزک و احتشام کے بے شمار اسباب جن کی بحیثیت صوبہ دار ضرورت نہ تھی، اب یہ "ملوکِ طوائف"

نہایت اہتمام کے ساتھ فراہم کرتے تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حصول حکومت و آزادی کی آرزو کو یہی جذبۂ شوکت نمائی تقویت پہنچاتا تھا اور خود مختاری کا اعلان کرنے سے پہلے ہی یہ نئے بادشاہ کوشش کرتے تھے کہ جاہ و جلال کے اعتبار سے ان کا دربار حتیٰ الامکان بلبن و علاء الدین کے دربار سے کمتر نہ رہے!

اِن لوازم بادشاہی میں، بڑی بڑی فوجیں اور جنگی سازوسامان کی بہم رسانی گویا سب سے ضروری تھی کہ ہمسایوں سے اپنی سلطنت کو بچایا جائے اور جب موقع ملے، نئے علاقے حاصل کئے جائیں چنانچہ اِس ہوسِ ملک گیری کی بدولت اُن ریاستوں میں جن کی سرحدیں متصل تھیں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ خانہ جنگی، اندرونی انقلابات اور سازشوں کے بھی بہت سے قصّے تاریخوں میں محفوظ ہیں کیونکہ دُنیا پرستی، خود غرضی اور ظلم وفریب سے کبھی زمانہ خالی نہیں رہتا مگر تاریخ ہند کے طالب علم کو خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا جنگی سازوسامان یا لوازم بادشاہی کے واسطے زرِ کثیر کی ضرورت پڑتی تھی (۲) مالی ترقی اور یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ گویا مجبور تھے کہ مُلکی دولت و ثروت کو ہر ممکن طریقے سے ترقی دیں تاکہ خود انہیں شاہانہ حوصلے نکالنے کا موقع ملے۔ اور گو فارسی تاریخوں میں اس موضوع پر کوئی توجّہ نہیں کی جاتی، بایں ہمہ نہ صرف خارجی واقعات و قرائن بلکہ بعض صریحی شہادتیں موجود ہیں کہ ان ملوکِ طوائف نے اکثر اپنے ملک میں زراعت و باغبانی، صنعت و

تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کی[1] اور مجموعی طور پر ہندوستان کی دولت پہلے کی نسبت بدرجہا بڑھ گئی جس کے بغیر بڑی بڑی فوجوں کا مہیا کرنا، شاہانہ عشرت و آرائش کے سامان کی فراہمی اور عالیشان عمارات اور شہروں کی تعمیر محال تھی۔

(۴۳) نئے شہر اور عمارات۔

دوسرے یہی زمانہ ہے جس میں اسلامی تمدن ہندوستان کے اکثر حصوں میں رائج ہوا اور ان ملوک طوائف کی بدولت جا بہ جا نئے شہر آباد ہوئے جو صنعت و تجارت اور اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے۔ واضح رہے کہ ان میں سے اکثر بستیاں پہلے سے موجود تھیں لیکن مسلمانوں نے وہاں وسیع شہر پناہیں، عالیشان قلعے، مساجد و مدارس اور بڑے بڑے بازار بناکر ان کی بالکل صورت بدل دی اور گمنام دیہات کی بجائے انہیں بارونق شہر بنا دیا۔ چنانچہ بنگالے میں لکھنوتی (یا گور)، اکدالہ، پنڈوہ، سنارگام اور سات گام اسی قسم کے شہر تھے جنہیں مسلمان بادشاہوں نے ازسرنو تعمیر کیا اور زیرِ نظر زمانے میں ان کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی[2]۔ دکن میں دولت آباد اور گلبرگہ اور بیدر کے عروج کا یہی

---

[1] دکن اور گجرات میں میوہ دار درختوں کے غیر ملکوں سے لانے اور غلہ و نیشکر کی کاشت بڑھانے کے واسطے جو اہتمام کیا جاتا تھا اس کی مثال کے واسطے دیکھو فرشتہ ۳۲۵۔ رسالہ یاد ایام (اردو) صفحہ ۲۳ و ۲۴ بحوالۂ مرآۃ سکندری وغیرہ۔

[2] اسی زمانے میں پرتگیز سیاحوں نے شہر لکھنوتی کی آبادی کا تخمینہ کیا تھا کہ اس میں کم و بیش دس لاکھ آدمی رہتے تھے! (دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۸۳)

زمانہ ہے جو پہلے محض جنگی قلعے تھے اور سلاطین بہمنی کے عہد میں نہایت آباد و بارونق شہر بن گئے۔ اِن بادشاہوں نے اوسہ اور پریندہ میں جو قلعے بنائے تھے وہ آج بھی فن حرب میں اُن کی مہارت کی لاجواب یادگار ہیں[1] اور گاول گڑھ اور نرنالہ (برار) کے قلعوں کو دیکھکر میڈوز ٹیلر کو بھی بے اختیار اقرار کرنا پڑا کہ تمام ممالک یورپ اُس زمانے میں ایسی پُرشکوہ اور خوش نما عمارات کا جواب پیش کرنے سے عاجز ہیں[2]!

اِن کے قریب ہی خاندیس میں نصیر خاں فاروقی نے شہر برہانپور کو نویں صدی ہجری کے آغاز میں آباد کیا اور وہ بہت جلد وسطِ ہند کی تجارت اور اسلامی تمدّن کا مشہور مرکز بن گیا تھا۔ زین آباد اور سلطان پور کے نئے اسلامی شہروں کا بھی بار بار ذکر آتا ہے مگر اب وہ کس مپرسی اور گمنامی کی حالت میں ہیں اور یہی حال مانڈو، سارنگ پور وغیرہ شہروں کا ہوا جو اس زمانے میں مالوے کے اسلامی سلاطین نے تعمیر کئے تھے۔ ان بادشاہوں کی بنائی ہوئی "سنگین اور مستحکم عمارات جو اب تک شناخت کی جاسکتی ہیں، بے شمار اور فنِ عمارت کی بہت سی خوبیاں رکھتی ہیں" اور حال میں ریاست دھار اور سرکار انگریزی کی توجہ ان میں سے اکثر عمارات کی مرمّت و نگہداشت کا انتظام

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۰۴

[2] " " "

کیا گیا ہے[۱] لیکن تمدّنی ترقی کی اس تگاپو میں غالباً گجرات سب سے آگے تھا جہاں مسلمان بادشاہوں کی سعی و سرپرستی سے زراعت و باغ بانی، صنعت و حرفت، برّی وبحری تجارت، علوم وفنون اور مدنیت و آبادی نے حیرت انگیز فروغ حاصل کیا۔ یہاں کے پرانے اور گمنام شہروں کو مسلمانوں نے ازسرنو آباد کیا اور جابجا نئے قصبات اور بندرگاہیں بنائیں جن کی تجارت اور مصنوعات دُور دُور کے ملکوں میں مشہور تھیں۔ نویں صدی ہجری کے اخیر میں یورپ کے سیّاح اور تاجر بھی روز افزوں تعداد میں ہندوستان آنے لگے تھے اور ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ گجرات کی کثرتِ آبادی، دولت مندی اور خوش حالی کی شہادتیں محفوظ ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں زیادہ تر ہندوستان کے مغربی سواحل اور سلطنت گجرات ہی کے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان تحریروں کے علاوہ گجرات کی قدیم عمارات گویا اُس عہد کی آسودگی، حسنِ ذوق اور ہنرمندی کی زندہ یادگاریں ہیں حتیٰ کہ ونسنٹ اسمتھ[۲] بھی جس نے مسلمان بادشاہوں کی ہرجگہ نہایت ناروا اور بازاری پادریوں کیطرح مذّمت کی ہے، یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ "شہر احمد آباد اپنے عروج کے زمانے میں، یعنی بننے کے بعد سے اٹھارویں صدی (عیسوی) تک (گویا تقریباً تین صدی تک)، بے شک وشبہ دنیا کے سب سے خوبصورت شہروں میں داخل تھا۔ اُس کی

---

[۱] اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۶۷۔

(اُن دِنوں) آبادی نولاکھ بیان کی جاتی ہے اور وہاں کے تاجروں میں کروڑپتی سوداگر بھی موجود تھے۔"[۱]

(۴) ترقّی علوم "سلطنتِ شرقی" اور سیاسی زوال اور تیموری تباہی کے باوجود) سلطنت دہلی بھی مجموعی طور پر، تمدّن میں اپنے معاصرین سے پیچھے نہ تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ جونپور کے قابلِ دید آثارِ قدیمہ سلاطینِ شرقی کی بہت ادنیٰ یادگار ہیں ورنہ اُنکا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اودھ سے جونپور تک سارے مُلک کو اربابِ علم و فضل سے معمور کردیا۔ تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تو خاص شہر جونپور تھا، لیکن صدہا علما اور مشائخ کو دیہات بطریق جاگیر دے دیئے گئے تھے کہ وہ اور اُن کے شاگرد اطمینان سے وہاں رہ کر علمی مشاغل میں اپنی زندگی بسر کریں۔ اہل علم کی یہی بستیاں اور نو آبادیاں تھیں جن کی وجہ سے شاہ جہاں جیسا عالی نظر بادشاہ، ان علاقوں پر فخر کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ "پورب شیرازِ ماست!" اور آج بھی جب کہ مشرقی علوم کی کساد بازاری انتہا کو پہنچ گئی ہے اور علما کے قدیم خاندان کس مپرسی کی بدولت تباہ و شکستہ حال ہیں، "پورب" یعنی قدیم "سلطنتِ شرقی" کے وہ اسلامی قصبات مردم خیزی میں ضرب المثل ہیں، جہاں اسی دورِ رفتہ میں اسلامی علما آکر آباد ہوئے تھے۔

اس کتاب میں زیرِ نظر عہد کے اسلامی مدارس، صوفیہ

---

[۱] اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۷۱

علماء شعراء اور اُن کی تصانیف کا احاطہ کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن سرسری طور پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ خواجہ نصیر الدین (چراغ دہلوی)، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، اور خواجہ سید محمد گیسو دراز جیسے صاحبِ ارشاد و تصانیف بزرگوں کا زمانہ یہی ہے۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین (جونپوری) شیخ علی بن شیخ احمد (مہائمی)، اور سب سے بڑھکر شیخ علی متقی (برہانپوری)[1] کی وہ فاضلانہ تصانیف جو آج بھی اسلامی دنیا میں مقبول و محترم ہیں، ہندوستان کے اسی "دورِ لامرکزیت" میں شائع ہوئیں۔ جو طالب علم ان علما اور اُن کے معاصرین کی علوِ مرتبت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں وہ اگر خود اُن کی تصانیف سے مستفید نہ ہوسکیں تو کم از کم اُن مستند تذکروں[2] کا مطالعہ کریں جو خاص اِن بزرگوں کے

---

[1] اِن کی کتاب کنز العمال، جس میں علامۂ سیوطی کی "جمع الجوامع" کو از سرِ نو ابوابِ فقہیہ پر ترتیب دیا ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد میں طبع کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف کی اسی علمی خدمت کی بناء پر یہ قول مشہور ہوا کہ للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ

[2] اخبار الاخیار اور علامہ غلام علی آزاد کی تصانیف کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں۔ علمائے جونپور و دہلی کے حالات میں بہت سے عمدہ عمدہ تذکرے فارسی میں موجود، اور اُن میں گنج رشیدی، فصول مسعودیہ وغیرہ مشہور ہیں۔ علمائے گجرات کے متعلق حال میں "ایجوکیشنل کانفرنس" علی گڑھ نے ایک اردو رسالہ یادِ ایام شائع کیا ہے اور اس کے لائق مؤلف بشارت دیتے ہیں کہ وہ علما اور مشاہیر ہند کے حالات میں ایک ضخیم کتاب تیار کرچکے ہیں جو بعض مجبوریوں کے دفع ہوتے ہی شائع کردی جائیگی۔

حالات میں لکھے گئے تھے اور بعض کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ طبع ہوگیا ہے۔[۱]

ہندوؤں سے علمی تعلقات

مگر علمی ترقی کے اس مختصر بیان کو ختم کرتے وقت یہ بتانا ضروری ہے کہ شمالی ہند کے ہندو مسلمانوں میں ہم وطنی کا عام احساس اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ امیر خسروؒ نے ہندی زبان اور علوم کی جانب توجہ دلانے کی جو کوشش کی تھی، وہ بیکار نہ گئی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے مسلمان طلبہ کی معقول جماعت کو سنسکرت اور ہندو علوم کے سیکھنے کا شوق ہوگیا۔ سلطان فیروز شاہ نے جس وقت قلعہ نگرکوٹ کو فتح کیا (۷۶۲ھ) اور معلوم ہوا کہ وہاں سنسکرت کتابوں کا بہت قدیم اور عمدہ ذخیرہ موجود ہے تو حکم دیا کہ ان میں سے بہترین کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ دربار کے مشہور منشی عزّالدّین نے ہندی فلسفہ ونجوم وغیرہ علوم کے جو ترجمے کئے ان کا مجموعہ "دلائلِ فیروزی" کے نام سے موسوم ہے اور ملّا عبدالقادرؒ نے اس کو نقّادانہ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔[۱] اسی عہد کی دو اور ضخیم علمی کتابوں کو سرہنری ایلیٹ نے لکھنؤ کے ایک کتب خانہ میں دیکھکر یہ رائے قائم کی تھی کہ "بے شبہ اس زمانے میں مسلمان علما، عام طور پر سنسکرت کا کافی علم رکھتے تھے"[۲]

[۱] منتخب التواریخ صفحہ ۲۴۹ اس واقعے کا ذکر طبقات اکبری، فرشتہ وغیرہ بعد کی تمام فارسی تاریخوں میں بھی موجود ہے۔

[۲] ایلیٹ، تاریخ ہند جلد پنجم صفحہ ۵۷۳۔

ہندوؤں کے طبّی علوم سے مسلمانوں نے جس قدر واقفیت بہم پہنچائی تھی اس کے ثبوت میں غالباً صرف ایک کتاب "معدن الشفا" کا حوالہ دینا کافی ہوگا جو چرک، جاتوکرن، بھوج، سارنگ وھر وغیرہ تیرہ نامور ہندو اطبّا کی مستند سنسکرت تصانیف کا خلاصہ ہے اور فاضل مؤلّف نے، تشریح اعضا، امراض، علاج اور خواص ادوّیہ کے متعلق گویا ہندو اساتذہ کی تمام قدیم تحقیقات کا فارسی میں عطر کھینچ لیا ہے![1]

اس عالمانہ کتاب کا مؤلف سلطان سکندر لودھی کے دربار کا امیر تھا اور اس عہد کی علمی سرگرمی[2] نیز ہندوؤں کا اسلامی علوم حاصل کرنا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے لیکن یہاں یہ دلچسپ نظیر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں

[1] یہ کتاب مطبع نولکشور سے ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے اگرچہ فہرست کتب میں غلطی سے اس کا نام "طب سکندری" لکھا ہے۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی عنایت سے اس کا ایک قدیم قلمی نسخہ بھی راقم الحروف کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مؤلف کا عُرف میاں بھووہ (بن خواص خاں) تھا جسے تاریخ فرشتہ میں غلطی سے بھورہ لکھدیا ہے۔ (صفحہ ۱۸۷) لیکن کتاب میں صاف صاف نام لکھے ہونے کے علاوہ مخزن افغانی (دیباچہ سوم فصل دوم وسوم) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ "میاں بھووہ" سلطان سکندر کے مصاحبِ خاص اور میرِ عدل کے معزّز عہدے پر ممتاز تھے! مطبوعہ کتاب کے سرورق پر مؤلف کا نام بہلول خاں تحریر ہے اور غالباً اصلی نام یہی ہوگا!

[2] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۷۰۔

ایک ہندو برہمن نے علوم اسلامی میں اتنی دستگاہ حاصل کرلی تھی کہ نہ صرف فارسی کا عمدہ شاعر تھا بلکہ (عربی) کتب علمی کا باقاعدہ درس دیا کرتا تھا[1]! دکن کی نوخیز ریاست میں برہمنوں کی جو قدر و منزلت ہوئی اُس کا اشارۃً اوپر ذکر آچکا ہے[2] اور بعض سلاطین بنگالہ نے خاص طور پر مقامی زبان اور تعلیم کو ترقی دینے کی جو سعی کی تھی، ہمارے زمانے کے بنگالی اور انگریز مصنّف بھی اُس کا اعتراف کرتے ہیں[3] لیکن ہندو مسلمانوں کے مبادلۂ خیالات اور باہمی میل جول بڑھنے کی شاید سب سے اچھی شہادت یہ ہوگی کہ رامانند کے شاگرد کبیر نے انہی لودھی سلاطینِ دہلی کے عہد میں اپنی صوفیانہ تعلیم دینی شروع کی اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات کو مٹاکر انھیں ایک کردیا جائے!

۱؎ اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۶۴۔

۲؎ دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۸۸ منتخب التواریخ ۳۲۴ وغیرہ وغیرہ۔

۳؎ منتخب صفحہ ۱۲۳۔

تتمہ باب ششم

۱۔ شاہانِ بہمنی کے نام اور سنینِ حکومت

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
۱	سلطان علاء الدّین حسن۔	سنہ ۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء	
۲	سلطان محمد شاہ بن علاء الدین۔	سنہ ۷۵۹ھ	
۳	سلطان مجاہد شاہ بن محمد شاہ۔	سنہ ۷۷۶ھ	
۴	سلطان داود شاہ بن علاء الدین	سنہ ۷۸۰ھ	اپنے بھتیجے کو فریب سے مار کر بادشاہ ہوا تھا مگر بہت جلد خود بھی مارا گیا۔
۵	سلطان محمود شاہ بن علاء الدّین[۱]	سنہ ۷۸۰ھ	
۶	سلطان غیاث الدّین بن محمود شاہ	سنہ ۷۹۹ھ	غیاث الدین کو اندھا کر کے ایک امیر تغلچین سلطنت پر حاوی ہو گیا تھا اور شمس الدّین بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔
۷	سلطان شمس الدّین بن محمود شاہ	سنہ ۷۹۹ھ	

۱ بعض فارسی تاریخوں میں اس کا نام "محمد شاہ" لکھا ہے اور اسی بنا پر اس زمانے کے بعض انگریز تاریخ نویسوں نے اپنے نزدیک فرشتہ کی یہ غلطی نکالی ہے (داکسفورڈ ہسٹری، ص ۲۸۰) مگر انہیں شاید یہ خبر نہیں کہ اُن کے ماخذ فرشتہ کے سامنے موجود تھے اور وہ اس اختلافِ روایت کی کافی تحقیقات کر چکا ہے دوسرے وہ اس بات کو بھی غالباً نہیں جانتے کہ مسلمانوں میں ایک باپ کے دو بیٹوں کا نام ایک نہیں ہوا کرتا۔ اور یہ سلطان "محمود" اپنے باپ کے پہلے جانشین "محمد شاہ" کا بھائی تھا۔

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
۸	سلطان فیروز "روز افزوں" شاہ بن داؤد (۴)	سنہ ۸۰۰ھ	
۹	سلطان احمد شاہ بن داؤد	سنہ ۸۲۵ھ	بانی احمد آباد (بیدر) جس کے عہد میں سلطنت بہمنی نے کمال رونق حاصل کی تھی
۱۰	سلطان علاء الدّین بن احمد شاہ	سنہ ۸۳۸ھ	
۱۱	سلطان ہمایوں شاہ "ظالم" بن علاء الدّین بن احمد	سنہ ۸۶۲ھ	
۱۲	سلطان نظام شاہ بن ہمایوں	سنہ ۸۶۵ھ	
۱۳	سلطان شمس الدین ابو المظفر محمد شاہ بن ہمایوں۔	سنہ ۸۶۷ھ	اس کے ابتدائی زمانے میں سلطنت بہمنی نے انتہائی وسعت پائی اور آخر میں جب اُس نے اپنے وزیر و مربّی خواجہ محمود گاواں کو شبہ پر قتل کرادیا، تو زوال کے آثار پیدا ہونے لگے۔
۱۴	سلطان محمود شاہ بن محمّد شاہ	سنہ ۸۸۷ھ تا سنہ ۹۲۴ھ	اس کے عہد میں برار، دولت آباد۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے صوبے آزاد و خود مختار ہوگئے اور امیر برید بن قاسم برید نے بادشاہ کو اس قدر بے حقیقت کردیا کہ شہر بیدر سے تھوڑی دور باہر بھی کوئی اس کا حکم نہ مانتا تھا۔ اور بعد کے چاروں بادشا

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
			محض برائے نام بادشاہ تھے اور اضلاع بیدر و گلبرگہ کی حکومت بھی علائیہ امیر برید کے ہاتھ میں آگئی تھی حتیٰ کہ آخری بادشاہ چھپ کر بیدر سے نکل گیا تھا اور ایک سال بعد احمد نگر میں وفات پائی۔
۱۵	احمد شاہ بن محمود شاہ	سنہ ۹۲۴ھ تا سنہ ۹۳۳ھ ۱۵۲۶ء	
۱۶	علاء الدین بن احمد شاہ		
۱۷	ولی اللہ بن سلطان محمود شاہ		
۱۸	کلیم اللہ بن محمود شاہ۔		

٢۔ وجیانگر کے راجہ

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
	پہلا خاندان		
١	راجہ ہری ہر بن بکا رائے۔	۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء	یہ اُس ہری ہر (اوّل) کا بھتیجا تھا جسکے زمانے میں شہر وجیانگر کی بنیاد پڑی (۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء) لیکن پہلا خود مختار راجہ اسی ہری ہر (ثانی) کو مانا جاتا ہے واضح رہے کہ اس خاندان کے اکثر سن قیاسی ہیں مگر ہم نے آکسفورڈ ہسٹری کی پیروی کی ہے (صفحہ ۳۰۴)
٢	راجہ بکا بن ہری ہر	۱۴۰۴ء (؟)	
٣	راجہ دیو رائے (اوّل)	۱۴۰۶ء	
٤	راجہ ویر وجے	۱۴۲۲ء (؟)	
٥	راجہ دیو رائے (ثانی)	۱۴۲۴ء	
٦	راجہ ملک راجن بن دیو رائے	۱۴۴۶ء	
٧	راجہ ویرو پاکش رائے	۱۴۶۵ء	
٨	راجہ پردھ دیو رائے (؟)		
	دوسرا خاندان		
٩	راجہ نرسنگ	۱۴۸۶ء	
١٠	راجہ نرسنگھ (تمّے) رائے	۱۴۹۲ء (؟)	
	تیسرا خاندان		
١١	راجہ نرس نائک	۱۵۰۵ء	عام بدامنی اور شورش
١٢	راجہ ویر نرسنگھ	۱۵۰۶ء (؟)	
١٣	راجہ کرشن دیو رائے	۱۵۰۹ء	سلطنت وجیانگر کی انتہائی عروج کا زمانہ۔
١٤	راجہ اَکیوٹ (؟)	۱۵۲۹ء	
١٥	راجہ سداسیو	۱۵۴۲ء	برائے نام راجہ تھا۔ حکومت رام راجہ کے ہاتھ میں آگئی تھی ؎
	جنگ تالی کوٹ ... جمادی الثانی	۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء	اس جنگ نے سلطنت وجیانگر کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اس کے نام لیوا ایک مدت تک بعد میں بھی جنوبی ہند کے بعض مقامات پر حکومت کرتے رہے ؎

غلط نامہ

کتاب دوم تاریخ ہند (برائے ایف اے)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۸	اِس کی	اُس کی	۱۹۱	۱۴	"سحائم لبسیار"	"غنائم لبسیار"
۱۵	حاشیہ	پون چکتی	پون چکی	۱۹۲	۱۳	چگیہ	چنگیز
۲۳	۸و۱۰	اِن	اُن	۲۰۴	۶	حملہ اورہ	حملہ آور
۵۳	۱	جس میں	جن میں سے	″	۹	ایشپا	ایشیا
″	حاشیہ	شہرتاریخ	شہر کی تاریخ	۲۰۸	۱۸	رنج میں	رنج سے
۶۷	۱۸	سشین	سنین	۲۱۷	۹	انہیں	انہی
۸۲	۱۷	دلابر	دربر	۲۲۱	۵	زیاد	زیادہ
۸۳	۸	گرو	گرِد	۲۲۲	حاشیہ	انتیاز	امتیاز
″	۱۹	انہیں	انہی	۲۲۴	۱۰	یروقت	بروقت
۸۵	۱۵	تاریخ بناگتی	تاریخ بنائے گیتی	″	۱۶	شاغل	مشاغل
۱۰۵	۶	مطابق ۱۸۶	مطابق ۱۸۶۱ء	۲۲۸	۳	اشار و نفسی	ایثار و نیک نفسی
۱۲۴	حاشیہ	سیالِ اس	سیالِ داس	″	۷	سنائی گئی	منائی گئی
۱۵۸	۸و۱۸	با	یا	۲۳۴	۱۵	رعب ازدل	رعبِ اور دل
۱۶۸	۸	پاسومیل	پانسومیل	۲۳۸	۱۹	خصار	حصار
۱۷۲	۲	کرسکتا	کرسکتا ہے۔	۲۴۱	۱	بے شسہ	بے شبہ
۱۸۱	۱۰	اور اہلِ ہندنے	مگر اس مرتبہ اہلِ ہندنے	۲۴۶	۲۰	پشئیں	پُشتیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵۵	۲۰	نفرت، یاہمی	نفرت، باہمی	۲۹۳	حاشیہ	میر	سیر
۲۵۸	حاشیہ	صوفیائے کرام	صوفیہ کرام	۳۰۵	حاشیہ	کھنولا	کنولا
۲۵۹	۵	گررے ہیں	گزرے ہیں	۳۰۸	؍؍	اشتقال	اشتغال
۲۶۸	۹	نہ ہوسکتا	نہ ہوسکتا	۳۱۱	۹	**یا**	یا
۲۷۸	حاشیہ	یہ آسانی	بآسانی	۳۲۸	حاشیہ	ظلہ برلی کی عبارتکا	ظلہ بسنی کی عبارت
۲۸۱	عنوان حاشیہ و سطر	قیمت خرید	قوتِ خرید	۳۴۱	۴	رعایا پرہ	رعایا پرور
۲۸۲	۱	؍؍	؍؍	؍؍	۱۴	نہ ان	کے ان
۲۸۲	۸	بڑھ جاییں	بڑھ جاتیں	۳۵۹	۲	اسمعیل فتح	اسمعیل مخ
۲۸۵	۱	محفلت	غفلت	۳۶۱	۲۰	صرتی	مُربی
۲۹۲	حاشیہ	پچپا	چچا	۳۶۲	۷	وین گنگا	بان گنگا

ف ۱ صفحہ ۶۵ کے حاشیہ ۱ کے آگے یہ عبارت بڑھا دی جائے کہ :- جدید تحقیقات کی رُو سے اس قدیم مقام کا نام مینیچ معلوم ہوا ہے اور وہ موجودہ جونپور کے قریب وہاں واقع تھا جہاں اب ظفرآباد ہے ۔

ف ۲ صفحہ ۹۶ کے فقرۂ اول کے متعلق یہ ذیلی حاشیہ بڑھا لیا جائے کہ رسالۂ اردو (بابت اکتوبر ۱۹۲۱ء) میں محمود شیرانی صاحب نے ایک عالمانہ مضمون لکھکر یہ ثابت کیا ہے کہ سلطان محمود کی وہ مشہور ہجو سرے سے فردوسی کی لکھی ہوئی ہی نہیں ہے ۔